چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

خاص 26 کہانیاں

قیمت -/90 روپے

سالگرہ نمبر

روحانی
شمع جنتری 2019

مؤلف۔ اقبال احمد مدنی

مسلسل کامیابیوں کا چوبیسواں سال

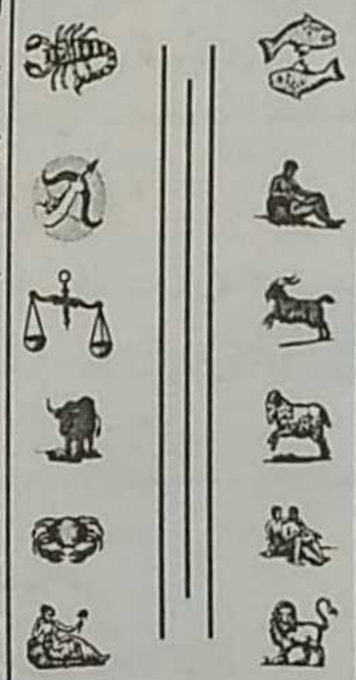

پاکستان کی واحد مستند اور منفرد جنتری جس میں دیئے گئے مستقل اور نئے عنوانات آپ کو ہر وقت چونکا دیتے ہیں اور جسے پڑھ کر آپ پر حیرت طاری ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں چھپنے والی جنتریوں اور تقاویم میں سارے مضامین یکجا نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو اس سے قارئین مکمل استفادہ حاصل نہیں کر سکتے، ان کے علم کی پیاس نہیں بجھتی، اس سال کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ اولیات، مذہبی تقریبات و تعطیلات 2019ء، ہر کام میں کامیابی یا ناکامی کیلئے سعد و نحس تاریخیں، آج کا دن کیسا گزرے گا، اثرات قمر، بارہ ماہ 2019ء، خواتین کے مزاج پر چاند کے اثرات نقشہ سحر و افطار رمضان المبارک برائے کراچی 2019ء، 2019 کا لکی نمبر (یہ کام کریں یا نہ کریں)، تاریخ عیسوی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، تاریخ ہجری سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، فہرست عرس ہائے بزرگان دین برصغیر 2019ء، استخراج طالع وقت 2019ء، تسویت البیوت مختصر، تسویت البیوت پاکستان، تعارف رفتار سیارگان 2019، رفتار سیارگان 2019ء، جدول نظرات سیارگان 2019ء، انعامی بانڈز سے لکھ پتی یا کروڑ پتی بنے گا کون؟، 2019ء علم الاعداد کی روشنی میں، نوروز عالم افروز (عالمی پیشن گوئیاں) 2019ء، نقشہ تحویلات کواکب 2019ء، آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، 2019ء میں آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، سورۂ رحمان اور ہیپا ٹائٹس، آپ کی دعا کب قبول ہو سکتی ہے، چوروں اور لٹیروں سے بچنے کا عمل، بچے اور ان کا مستقبل، کھیل اور کھلاڑی، درود شریف سے لا علاج مرض کا علاج، روز مرہ متناسبہ سلسلہ لوگارثم 2019، شرف و ہبوط و سیارگان 2019ء، سورۂ انعام سے مشکلات کا حل، شوگر اور جوڑوں کے درد کا علاج، سسرالی جھگڑوں کی مشکلات کا حل، سورۂ قدر سے مشکلات کا حل، ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل، جمیل پری کو قابو کرنے کا عمل، برج کی منسوبات، آخریات۔ مجھے امید ہے کہ اتنے سارے عنوانات سے آپ کے علم کی پیاس یقیناً بجھ جائے اور آپ مزید مفید مشوروں سے مجھے نوازیں گے۔ تاکہ جنتری کو بہتر سے بہتر خطوط پر استوار کیا جائے اور آپ کے استفادوں کا کارواں یونہی رواں دواں رہے۔

دعا گو

اقبال احمد مدنی

شائع ہو گئی ہے
قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

قیمت -/180 روپے

شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی
021:32773302

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 1 اکتوبر 2018ء

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی
چیف ایڈیٹر آصف حسن
ایڈیٹر شاہد علی
سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/90 روپے

سالانہ قیمت -/1500 روپے

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

بیسویں سالگرہ نمبر

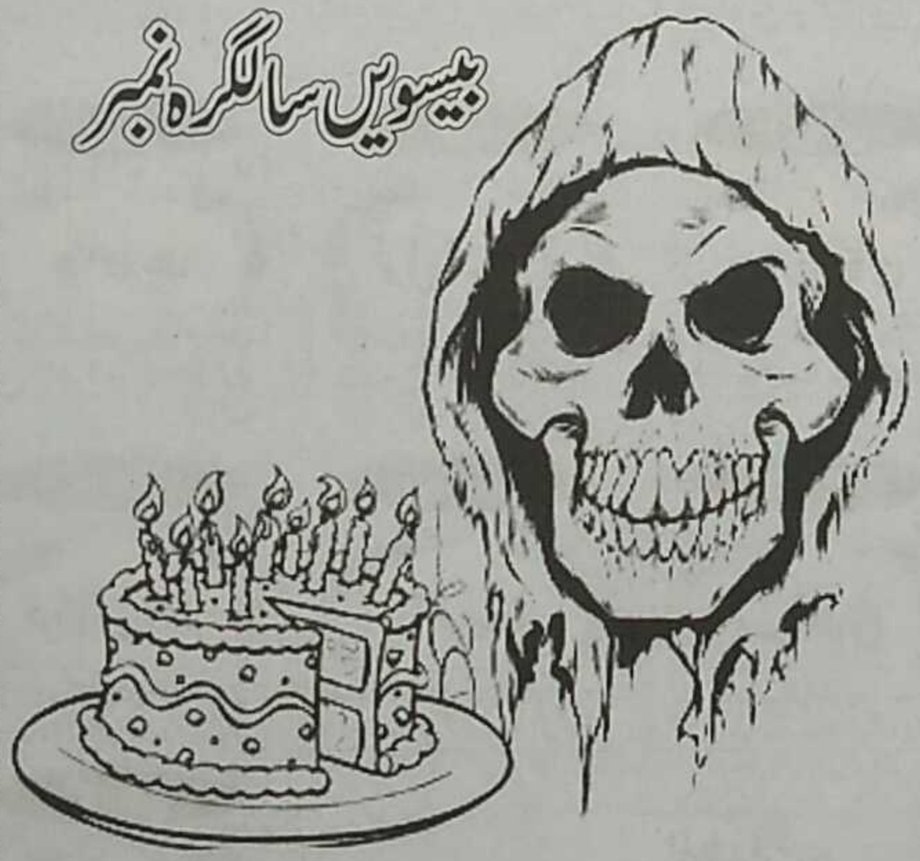

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

پراسرار لڑکی — عمران قریشی — 18
زور زبردستی دھونس اور طاقت کا مظاہرہ اکثر جان لیوا ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں ہے

انوکھی رات — صائمہ شاہد — 31
دل ودماغ کو دہلا دینے والا اندھیرا ہر سو مسلط تھا، اسی گھٹا ٹوپ اندھیرے کی خوفناک کہانی

پیاسی آتما — ملک نعیم ارشاد — 35
انتقام کی آگ میں ...... جلتی ہوئی ایک روح کی ...... عجیب وغریب خوفناک روداد

گمشدہ ممی — ناصر محمود فرہاد — 43
دل ودماغ پر کپکپی طاری کرتی ...... عجیب وغریب نوعیت کی ...... دل دہلاتی کہانی

جان لیوا — راشد نذیر طاہر — 50
ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

آخری نصیحت — عامر شہزاد — 75
دل ودماغ کو مبہوت کرتی ...... ناقابل یقین دل دہلاتی ...... سبق آموز حقیقی کہانی

بدصورت — عثمان غنی — 79
رات کے خوفناک اندھیرے میں جنم لینے والی دلوں پر دہشت طاری کرتی ڈراؤنی کہانی

خونی آپ بیتی — رشک نور — 91
سبق آموز کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل ودماغ کو مبہوت کرتی حقیقی کہانی

ویران مکان — فرح انیس — 96
خونچکاں بھونچکاں اور دل پر سکتہ طاری کرتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب خوفناک کہانی

خوفناک منظر — فیصل مشتاق — 103
دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین دہشت ناک کہانی

عفریت — این اے کاوش — 112
ایک خونی عفریت کی دل دہلاتی اور کرب واذیت سے دوچار کرتی ...... دلخراش کہانی

وعدہ خلافی — محمد رضوان قیوم — 135
خوف کے گرداب میں غوطہ زن ...... ماورائی مخلوق کی دل گرفتہ ...... اور دل شکستہ کہانی

خونی کتاب — شہزاد خان — 140
ڈر وخوف کی پگڈنڈی پر رواں دواں رگ وپے میں خوف کی لہر دوڑاتی ...... کہانی

ایڈیٹر وپبلشر۔
آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

عبرتناک انجام — نینا خان — 147
خوف کے افق پر جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی خوفناک دہشت ناک ...... لرزاتی کہانی

آدم خور — ایس امتیاز احمد — 157
ایک پروفیسر کی ہولناک سرگزشت جو کہ آدم خور بونوں ...... کے قبیلے میں پھنس گیا تھا

انجام — مہر پرویز احمد دولو — 162
اکثر خود غرضی اور مطلب پرستی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے ...... تحیر انگیز کہانی

اسرار — محمد خالد شاہان — 170
صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

موم کی گڑیا — مریم فاطمہ — 187
حسد اور جلن کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گی

خونی مینار — گلاب خان سولنگی — 191
خود غرضی اور مطلب پرستی کی حیرت ناک داستان ...... جس میں سبق ...... ہی سبق ہے

میلا — نثار فاطمہ — 194
خوف وہراس کی وادی میں بل کھاتی ہوئی اور دل کو دہلاتی ہوئی حیرت انگیز، تحیر انگیز کہانی

جنم دن — محمد شعیب — 201
خون کا بدلہ خون ...... حقیقت پر مبنی ...... جسم پر کپکپی طاری کرتی ...... دل فگار ...... کہانی

روحوں کا ملن — رابعہ عباس — 206
ایک ایسا انوکھا واقعہ جس کو کسی بھی صورت ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے

آسیبی کہانیاں — اقراء قریشی — 211
خوف وہراس کے گرداب میں بل کھاتی عجیب وغریب دل پر ہیبت طاری کرتی کہانی

ایک صدی بعد — فیصل ندیم ساحل — 222
رگوں میں لہو منجمد کرتی، ہر طرف خوف پھیلاتی ایک روح کی خوفناک دیدہ دلیری

موت کا انتظار — عمیر علی — 227
ایک بدروح کی دیدہ دلیری کہ ہاتھ دھو کر وہ نوجوان کے پیچھے پڑ گئی تھی، خوفناک کہانی

برفانی چڑیل — شہزادہ چاندزیب عباسی — 234
ایک چڑیل کی ...... خوفناک دیدہ دلیری جو پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کر دے گی

خط وکتابت کا پتہ:۔
ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ میزانائن فلور نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی
PH:021-32744391

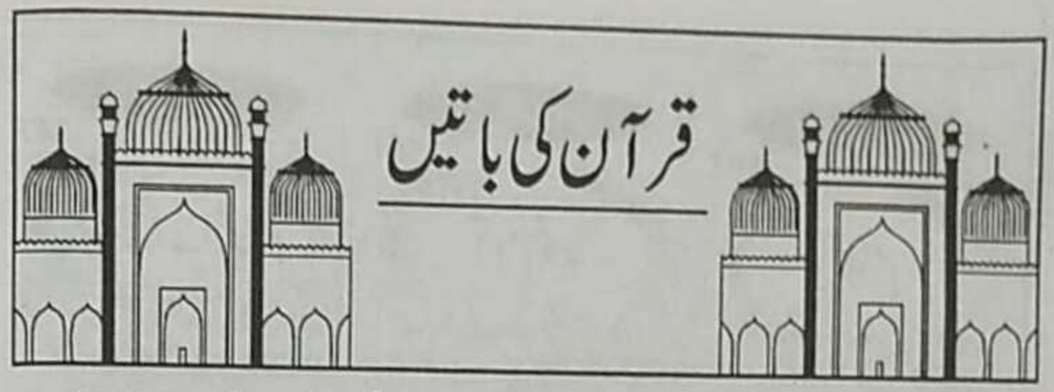

قرآن کی باتیں

☆ وہی تو ہے جس نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ بنا کر پھر لوتھڑا بنا کر پھر تم کو نکالتا ہے کہ تم کو بچے ہوتے ہو۔ پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو۔ پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔ اور کوئی تم میں سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور تم موت کے وقت مقرر تک پہنچ جاتے ہو۔ اور تا کہ تم سمجھو۔ (سورۃ مومن 40 آیت 67)

☆ تمہارا معبود تو اکیلا اللہ ہے۔ تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں۔ اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔ یہ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اللہ ضرور اس کو جانتا ہے۔ وہ متکبروں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ (سورۃ نحل 16 آیت 22 سے 23)

☆ ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے ہیں اور احکام الٰہی کو صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا اور رحم والا ہوں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 160)

☆ کہو کہ وہ ذات پاک جس کا نام اللہ ہے ایک ہے وہ معبود برحق بے نیاز ہے نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ (سورۃ اخلاص 112 آیت 1 سے 4)

☆ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تا کہ نجات پاؤ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہئے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 90 سے 91)

☆ اللہ نے فرمایا کہ نوحؑ وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ تو جس چیز کی تم کو حقیقت معلوم نہیں اس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو۔ اور میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ جاہل نہ بنو۔ (سورۃ ھود 11 آیت 46)

☆ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔ اور جو کوئی نیک کام کرے تو اللہ قدر شناس اور دانا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 158)

☆ قیامت کے دن نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد۔ اس روز وہی تم میں فیصلہ کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔ (سورۃ ممتحنہ 60 آیت 3)

(کتاب کا نام ''قرآن مجید کے روشن موتی''، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

اپنی بات

قارئین کرام

السلام علیکم

ڈرڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس میں 26 بہترین کہانیاں جلوہ گر ہیں اور تمام کی تمام کہانیاں کیسی ہیں اس کا فیصلہ تو آپ سب نے کرنا ہے ہمیشہ ہماری کوشش رہی ہے اور رہے گی کہ خوب سے خوب تر کہانیاں ہر ماہ آپ سب کو پڑھنے کو ملیں۔ قارئین کرام! اس وقت وطن عزیز میں جتنے بھی رسالے چھپ رہے ہیں وہ سب کے سب مہنگائی کے زیر اثر آ گئے ہیں، ہر چیز کی طرح کاغذ بھی بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور ہر کوئی متاثر ہو رہا ہے، اس مہنگائی کے پیش نظر، رسالوں کی قیمت -/100، -/110، -/120 اور -/130 روپے تک ہو گئی ہے اور ڈرڈائجسٹ کو مجبوری کے تحت قیمت -/90 روپے کرنی پڑ گئی، محترم قارئین! امید ہے کہ آپ لوگ ہماری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی قیمت سے ناراض نہیں ہوں گے۔ کچھ قارئین نے مشورہ دیا تھا کہ صفحات کم کر دیئے جائیں اور قیمت سابقہ رکھی جائے لیکن زیادہ تر قارئین نے مشورہ دیا کہ صفحات کم نہ کئے جائیں اور قیمت تھوڑی سی بڑھا دیں۔ لہٰذا ہم نے غور کیا کہ اگر صفحات کم کر دیتے ہیں تو کہانیاں متاثر ہوں گی یعنی کم کہانیاں شائع ہوں گی اور صفحات بڑھا دیتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ کہانیاں شائع ہوا کریں گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سالگرہ نمبر میں 26 کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ قارئین کرام ادارہ ڈرڈائجسٹ آپ سب کا شکر گزار ہے کہ آپ سب ڈرڈائجسٹ سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں اور رکھتے رہیں گے۔ قارئین کرام۔ تبدیلی آ گئی ہے اور اب ہم عوام تبدیلی کے انتظار میں ہیں کہ یہ تبدیلی ہماری ضروریات زندگی میں کیا تبدیلی لاتی ہے جس سے ہمیں سکون ملے گا۔ اور یہی غور طلب بات ہے۔

خالد علی

مینجنگ ایڈیٹر

ماہ روش واہ کینٹ سے، ہیلو السلام علیکم! یقیناً آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے، زندگی رواں دواں ہے، جیسے کل کی بات ہو، پچھلا سال ایسے تمام ہوا کہ پتہ ہی نہیں چلا، اور زندگی آنکھوں کے جھپکانے کی مانندیوں ہی گزر رہی ہے، جیسے ہماری نہ ہو، کسی اور کی مطلب ادھار کی جی رہے ہوں، میں نے تو کبھی کسی رسالے کو نہیں لکھا، مگر جب میری دوست نے لکھا اور اپنا خط دکھایا تو میرا بھی دل کیا، میں بھی کسی شمارے میں لکھوں، فی الحال پڑھ رہی ہوں اور زندگی سے لطف اندوز ہو رہی ہوں، مگر ڈر بھی اب زندگی کا اہم بن چکا ہے، پچھلے ماہ کا ڈر جتنا پیارا تھا، ماہ ستمبر کا اس سے بھی زیادہ اچھا پیارا اور خوب صورت تھا، مگر اس ماہ آپ کے ادارے والوں نے صفحات کی کمی کر دی تھی۔ اور مجھے یہ بات حیرت میں مبتلا کر رہی ہے کہ سالگرہ نمبر جب بھی ادارہ نکالتا ہے تو وہ صفحات کی تعداد کو بڑھا دیتے ہیں، کیا آپ برتھ ڈے نمبر میں بھی یہ کٹوتی کریں گے، سب کے تبصرے مجھے بے حد پسند آئے۔ کہانیوں میں مجھے اس ماہ جو کہانی سب سے زیادہ اچھی لگی وہ جرم محبت ہے، اور میں عثمان غنی کو اتنی عمدہ لکھائی پر مبارکباد پیش کروں گی۔ کہانی اس ماہ کی جان دار تحریر تھی۔ جو کہ سب کہانیوں پر بازی لے گئی۔ دوسری اچھی کہانی بلیک میجک رہی۔ یہ ایک بہتر کہانی تھی۔ اس کے علاوہ نینا خان اور مریم فاطمہ کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ عفریت کی تیسری قسط میں بہترین طریقے سے آگے کے واقعات بیان کئے اور جان لیوا ایک بہترین کہانی ہے۔

☆☆ماہ روش صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھا لگا اس کے لئے شکریہ، سالگرہ نمبر میں صفحات کم نہیں ہوئے بلکہ صفحات بڑھ گئے ہیں، کہانیاں کیسی ہیں تبصرہ آئندہ ماہ ضرور کیجئے گا۔Thanks۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کی ٹیم اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے۔ دل خوشی سے معمور ہے اور از حد مسرت کے ساتھ میں ڈر کو دلی مبارکباد پیش کر رہی ہوں کہ اس نے اپنی زندگی کے، اپنی ترقی کے اٹھارہ سال کامیابی سے مکمل کئے۔ گزرے تمام سالوں میں ہر طرح کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اپنے معیار کو خوب سے خوب تر کیا، اگست کے شمارے میں خالد علی صاحب کی باتوں سے دل بجھ گیا تھا، کیونکہ ڈر کا ساتھ میرے لئے کسی اپنے سے کم نہیں! میرے بچپن ہی کہوں کی جب میں ڈر پڑھنے کی اپنے پیرنٹس سے اجازت لیتی تھی۔ میرے ساتھ ہے۔ اگر ڈر بند ہو جاتا تو مجھ سمیت تمام قارئین ایک بہترین اور معیاری رسالے سے محروم ہو جاتے! میری مسرت کا احساس وقت دو چند ہو جاتا ہے کہ میری اور میرے فیورٹ ڈر کی سالگرہ ایک ساتھ آتی ہے۔ ''اکتوبر'' میں جب میں ڈر پڑھنے کی اجازت لیتی تھی تو مجھے کیا معلوم تھا کہ کچھ ہی عرصے میں میرا اور ڈر کا نہ ٹوٹنے والا ساتھ جڑ جائے گا اور مجھے اتنی تعداد میں چاہنے والے ہوں گے۔ اس میں سب سے زیادہ کریڈٹ جاتا ہے ڈر کے ایڈیٹر شاہد علی صاحب کو! جو نئے لکھنے والوں کی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میری دل سے دعا ہے کہ ڈر یونہی آسمان کی بلندیوں کو چھوتا رہے۔ (آمین) ستمبر کے شمارے میں خطوط کی بزم میں کرسی صدارت مسز زینت خان کو ملی جس کی وہ واقعی حقدار ہیں۔ بلاشبہ ان کے تبصرے جامع اور مفصل ہوتے ہیں اور ان کی پر اثر باتیں سب کی اصلاح کرتی ہیں۔ خدیجہ فاطمہ، آپکی راج ہیر والی بات نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ گڈ! ساتھ بلقیس خان، کائنات بلوچ، مہرینہ غلام علی، دل نور عمیر، مسز خائستہ رحمان، نینا خان، مہک فاطمہ، بسما خان، عثمان غنی، عامر شہزاد اور احسان الحق کی دل سے مشکور ہوں کہ آپ سب نے مجھے اپنے الفاظ میں یاد کیا۔ ''بلیک میجک'' سسپنس اور تھرل سے بھرپور، نہایت عمدہ تحریر تھی جس نے اپنے میجک سے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یوں ڈر کی ابتدا شاندار انداز میں ہوئی۔ اسی ٹاپک پر عامر شہزاد کی ''کالا جادو'' بہت پسند آئی۔ عبرتناک تحریر نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا واقعی جو دوسروں کا برا چاہے، وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا، رہی بات جادو کی تو کرنے والا نہ صرف ایمان سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ اپنی دنیا و آخرت برباد کر لیتا ہے۔ ''دہشت'' ایس امتیاز احمد صاحب کا دہشت کی ملکہ کے بارے میں مضمون بہت پسند آیا۔ "She Is One Of My Favourite" خوش کر دیا آپ نے ایس امتیاز صاحب! اگلی تحریر جو پڑھی وہ تھی ''خبیث'' مسلمان کا ایمان ہے کہ ہر چیز صرف و صرف اللہ کے حکم کی محتاج ہے۔ اگر ادا نہیں ہے تو یہ بھی انسان کے حق میں بہتر ہے کیونکہ وہ اللہ کی مرضی ہے۔ بہت اچھی تحریر تھی آپ کی ثنا فاطمہ Awesome ''شیطانی عمل'' جادو پر لکھی گئی مدثر بخاری کی تحریر حقیقت سے قریب محسوس ہوئی۔ بہت اچھی لکھی۔ Excellent! ''جرم محبت'' ابھی پڑھنا اسٹارٹ کی ہے امید ہے کہ اچھی ہوگی۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ایس حبیب صاحبہ: آپ کو بھی سالگرہ مبارک ہو، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ ''جگ جگ جیو ہزاروں سال'' آپ پر اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ اور ہاں کہانی ارسال کرنا بھولئے گا مت۔Thanks۔

عمرانہ سرور گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے چاہنے والے ٹھیک ہوں گے، آپ سب کو بہت بہت عیدالاضحی مبارک ہو۔ اور تمام پیارے سے اسٹاف کو سلام اور عید مبارک۔ میرے والد محترم سرور صاحب کا انتقال 2014ء کو ہو چکا ہے بس میرا ذہن بہت اپسٹ رہا مگر اب دوبارہ اپنے ساتھیوں اور ڈر ڈائجسٹ کی طرف متوجہ ہوں۔ ڈر ڈائجسٹ پڑھنا میرا پرانا مشغلہ ہے۔ میں اس ڈائجسٹ کی فین ہوں جو سب لکھاریوں کو ہر وقت موقع فراہم کرتا ہے۔ سو آج دوبارہ میں اپنا شوق برقرار رکھنے کو تیار ہوں۔ اگر شاہد صاحب کا بہت تعاون ملے اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے۔ بہت نرم دل کی شخصیت کے مالک ہیں۔ میں بے حد امید کے ساتھ اپنی کہانی اور خط ارسال کر رہی ہوں۔ پلیز۔ پلیز میری کہانی اس ماہ لازماً شائع کر دیں۔ بڑی امید اور پیار کے ساتھ دعاؤں سے رخصت ہوتی ہوں۔ دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ بہت ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆عمرانہ صاحبہ: ایک مرتبہ پھر ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، اور کہانی بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ، اور اب حسب وعدہ امید ہے کہ آئندہ ڈر کی محفل سے غیر حاضر نہیں رہیں گی۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ 17 اگست کو ہی مل گیا تھا۔ خالد صاحب کی بات پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ڈر بند نہیں ہوگا اور اس دفعہ اکتوبر میں بھی سالگرہ نمبر ہمیشہ کی طرح آئے گا۔ اپنی کہانی شمارے میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خطوط کی محفل میں جس کسی نے بھی میری تحریروں پر تبصرہ کیا ان سب کا بہت بہت شکریہ۔ ایڈیٹر صاحب آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ میری تحریروں کو ڈر میں جگہ دے رہے ہیں، کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ راشد نذیر صاحب کی ''جان لیوا'' نے واقعی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ بہت خوب جناب۔ این اے کاوش صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کی عفریت زبردست جا رہی ہے۔ نثار فاطمہ صاحبہ کی ''خبیث'' سبق آموز تھی۔ اچھی رہی۔ عامر شہزاد صاحب کی ''کالا جادو'' بہت اچھی لگی۔ آپ کی بات درست ہے۔ جادو کرنے والا جہنمی ہے۔ اسد اللہ بھٹی صاحب کی ''خونی بدروح'' نے تو دل کو چھو لیا۔ بے حد خوب صورت انداز بیان تھا۔ اپنی نئی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ ڈر کے لئے ایک خاص کہانی لکھنی شروع کی ہے۔ انشاء اللہ جلد بھیج دوں گی۔ آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ میرے لئے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا فضل و کرم کرے۔

☆☆مریم صاحبہ: کہانیوں کی تعریف، خط لکھنے اور نئی کہانی بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، آپ کے لئے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرے۔ (آمین)

نثار فاطمہ بہلول پور سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹر صاحبان امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اس دفعہ ڈر کا شمارہ نہیں ملا۔ میں نے بہت انتظار کیا اور اپنے گھر کے قریب بک اسٹال سے بھی پتہ کیا۔ لیکن ادھر بھی اس ماہ کا ڈائجسٹ نہیں آیا تھا اور مجھے اپنی کہانیاں دیئے ہوئے 3 ماہ ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ نے ایک بھی شائع نہیں کی، اس سے پچھلے ماہ مجھے ڈائجسٹ ملا تھا لیکن اس میں میری کہانی نہیں تھی جبکہ میں ہر ماہ آپ کو کہانی بھیجتی ہوں اور آپ نے شائع نہیں کی۔ اپنی کہانیوں کا میں بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں، لیکن ہر ماہ کوئی بھی کہانی شائع نہیں ہوئی ہوتی، امید کرتی ہوں کہ آپ میری شکایت دور کریں گے اور میری کہانی شائع کر کے مجھے شکریہ کا موقع دیں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ آخر میں ڈر کے لئے اور اس میں تمام لکھنے والوں کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆نثار فاطمہ صاحبہ: آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی اور کہانیاں شائع ہوتی رہیں گی۔ پلیز! آپ اپنی کہانیوں کے مزید کچھ صفحات بڑھا دیں۔ آپ جتنے صفحات کی کہانی بھیجتی ہیں تو ڈر کے دو ڈھائی یا تین صفحات بنتے ہیں۔ خیر کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہو جائیں۔ شکریہ۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم! تمام اہل ڈر کو سلام امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، افسوس ماہ اگست کا شمارہ مجھے نہ مل سکا اوپر سے ڈر بند ہو جانے کی خبریں بھی سننے کو ملتی رہیں، مجھے ایسا لگا گویا میرا کوئی اپنا مجھ سے بچھڑ گیا ہے، مگر پھر ستمبر کا ڈر موصول ہوا اور میری جان میں جان آئی، پلیز ایک عاجزانہ سی ریکویسٹ ہے کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مگر بیس سال پرانے رسالے کو یوں بند نہیں کرنا جو کہ پاکستان کا واحد ہارر ڈائجسٹ ہے اسی نے تو پاکستان کے ہارر رائٹرز کو جنم دیا ہے..... بات ہو جائے اس ماہ کے شمارے کی تو اس بار سرورق بہت پیارا تھا خطوط کی محفل میں جن بھائیوں نے مجھے یاد رکھا اس کے لئے ان سب کا بہت بہت شکریہ، دراصل میں آج کل بہت مصروف ہوں، اپنی دوسری کتاب پر کام کر رہی ہوں، میں نے ڈر کے لئے کہانی کب سے مکمل کر لی ہے بس بھیج نہ سکی اب انشاء اللہ آپ سب کی محبتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جلد بھیج رہی ہوں، انکل ضرغام کافی دنوں سے ڈر کے خطوط میں نظر نہیں آ رہے، آپ کے بنا محفل ویران ہے لیکن بلقیس خان کو ایک عرصے بعد ڈر میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، پلیز اب ساتھ ہی رہیے گا، اس ماہ کی کہانیوں پر بات ہو جائے تو ڈر کی روایت کے مطابق اس بار بھی ڈر کی پہلی کہانی ''بلیک میجک'' انکل شکیل نیازی کی حسب معمول بہت ہی منفرد اور جاندار کہانی تھی کہ دل داد دیئے بنا نہ رہ سکا بہت ہی خوب آپ ڈر کے بہترین لکھاریوں میں سے ایک ہیں..... آخری کہانی بھائی عثمان غنی کی ''جرم محبت'' نے بھی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بہت ہی کمال کی کہانی پیش کی جسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، قلم میں روانی اور تسلسل نے کہیں بور نہیں ہونے دیا اور آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا بہت زبردست تھی جناب..... اس کے علاوہ ساری کہانیاں تقریباً ٹھیک تھیں۔ مریم فاطمہ انگریزی کہانیاں لکھنا آپ کے بس کی بات نہیں ایس امتیاز سے کچھ سیکھیں، مریم فاطمہ انگریزی، اردو کہانیوں کی جانب توجہ دیں..... ''خبیث'' نثار فاطمہ لکھتے لکھتے ہی آدمی لکھاری بنتا ہے کوشش جاری رکھیں..... ''کہانی لکھنا ایک فن ہے جسے لکھنے کے لئے صبر و تحمل کا ہونا بے حد ضروری ہے ورنہ یہ ایک گپ کے سوا کچھ نہیں رہتی..... اگر میری باتیں کسی کو

بری لگی ہوں تو دل سے معذرت...... ایس حبیب خان اور بھائی احسان الحق کو سلام اب اجازت اللہ حافظ......!!!

☆☆ فلک صاحبہ: آپ کی کتاب "15 پراسرار کہانیاں" مارکیٹ میں آچکی ہے اور اب دوسری پر کام جاری ہے، بہت اچھی بات ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے چاہنے والوں کا بھی خیال رکھیں، آپ کی کہانی اب تین سے چار ماہ لیٹ ہورہی ہے۔ آپ کی ترقی میں ڈر ڈائجسٹ کا بہت بڑا ہاتھ ہے، امید ہے غور کریں گی۔

نینا خان کراچی سے، السلام علیکم! جناب ایڈیٹر صاحب خداوند تعالیٰ سے صدق دل سے میری دعا ہے کہ ڈر ادارے کے تمام کام کرنے والے اور تمام رائٹرز ہمیشہ بخیریت رہیں۔ سب سے پہلے بہت بہت مبارکباد وصول کیجئے۔ ڈر کی سالگرہ کی، مجھے بھی ڈر سے منسلک ہوئے پورا سال گزر گیا۔ میری فرسٹ اسٹوری ماہ اکتوبر میں ہی شائع کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ڈر کو اسی کامیابی کے ساتھ رواں دواں رکھے۔ آمین۔ اور ہم ڈر ڈائجسٹ کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ماہ ستمبر کے تبصرے میں مسز زینت خان کا تبصرہ بہت اچھا اور صاف گوئی پر مشتمل تھا۔ انٹرنیٹ کے حوالے سے بہت خوب باتیں کہیں، میں تو ان کی سوچ کی قائل ہوں اور ساتھ ان کی شکرگزار بھی ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور تعریف کا بے حد شکریہ مسز زینت خان صاحبہ۔ بلقیس خان کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں انہوں نے مجھے تیسرے نمبر پر رکھا، میں محنت کررہی ہوں بلقیس خان صاحبہ انشاء اللہ بہت جلد آپ کے حساب سے نمبرون آنے کی کوشش کروں گی۔ کائنات بلوچ کی بھی شکرگزار ہوں۔ انہوں نے میری کہانی انوکھا رشتہ کو مکمل طور پر پسند کیا۔ بہت شکریہ جناب مہرینہ غلام علی جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا آپ کا بے حد شکریہ۔ دل نور عمیر آپ نے اپنے قیمتی لفظوں میں میری تحریر کی تعریف کی بہت شکریہ۔ مسز خائستہ رحمان آپ کی اصلاح کی وجہ سے مزید کوشش کروں گی کہ اپنی تحریر میں نکھار پیدا کرسکوں۔ آپ نے ہر کہانی کی تعریف وتنقید کھلے دل سے کی میں ضرور عمل کروں گی۔ تمام قارئین کی قیمتی آراء میرے لئے باعث اصلاح باعث مسرت اور باعث فخر ہیں۔ پلیز اسی طرح میری حوصلہ افزائی فرماتے رہیں، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین) چلئے جناب اب شکریہ کے بعد تھوڑا تبصرہ کہانیوں پر بھی کرلیا جائے۔ شکیل نیازی صاحب جب کوئی کہانی لاتے ہیں بہت خوب لاتے ہیں۔ فلک زاہد کی اور ایس حبیب خان صاحبہ کی طرح۔ بلیک میجک اچھی کہانی ثابت ہوئی ہر بار کی طرح۔ شہزاد خان کی شیطانی کھنڈر اسد کی دیدہ دلیری اور جان کا بچ جانا بھی بہت خوب بتایا گیا۔ کہانی میں گڈ، ڈاکٹر صاحب کی کالا جادو نصیحت پر مبنی بہت اچھی تحریر تھی۔ درد دل کہانی بہتر تھی۔ مریم فاطمہ کی کہانی بھی اچھی رہی۔ دہشت میں ایس امتیاز احمد صاحب نے اگاتھا کرسٹی کی لائف کی معلومات فراہم کیں، ویری گڈ قوس قزح میں اپنی لکھی غزل پڑھی اچھا لگا۔ باقی تمام غزلیں اور اشعار بھی قابل تعریف ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے قابل اشاعت رکھا ہوا ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ڈر کی سالگرہ ہر سال قائم و دوائم رکھے۔

☆☆ نینا صاحبہ: خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، کہانی شامل اشاعت ہے۔ اور ہاں امید ہے اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنا بھولیں گی نہیں۔

مسز خائستہ رحمان مدین بحرین سے، ڈر ڈائجسٹ بہت جلد ملا، ماہ ستمبر کا ڈر جلد ملنے کی خوشی میں عید کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں، اور اب مجھے بہت اچھا بھی لگ رہا ہے۔ پھر خطوط کی محفل میں آئے، ارے واہ کافی نئے نام نظر آئے، سب کو خوش آمدید! اور سب کو سلام، دل کرتا ہے کہ تبصرہ نہ ہی کروں تو بہتر ہے، کیونکہ ڈر کی صفحات کی کمی ہمیں بالکل بھی نامنظور ہے۔ خط میں عثمان غنی، اور دل نور کا تبصرہ بہتر تھا۔ اس بار خطوط میں کافی گرما گرمی دیکھنے کو ملی۔ نینا خان بھی مثبت لکھ رہی ہیں، اور جہاں ہمارے حکمران یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ تبدیلی آگئی ہے، امید ہے ڈر میں بھی تبدیلی آجائے۔ اس بار ڈر میں جن تین کہانیوں نے دل جیت لیا۔ اس میں سر فہرست عثمان غنی کی بہترین کہانی جرم محبت نے تمام کہانیوں پر سبقت لے لی۔ واؤ، عثمان غنی اللہ نے آپ کو کیا خوب دماغ دیا ہے۔ آپ نے تو جی دار کہانی لکھ کر گویاں ہیڈ ٹرک مار لیا۔ وہ کون تھی؟ حیثیت، اور اب ایک اور بہترین کہانی جرم محبت، واہ واہ، بہت خوب، آپ کا تبصرہ بھی مثبت ہوتا ہے، یعنی آپ کو لکھنے کا فن آتا ہے۔ دوسری بہترین کہانی جو ڈر کے صفحات پر جگمگ کررہی تھی، وہ بلیک میجک تھی۔ مگر یہ انگلش کہانی تھی۔ پھر بھی بہترین کہانیوں میں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب رہی۔ تیسری کہانی معلومات سے بھرپور دہشت نے ایس امتیاز احمد کو یہ اعزاز دلایا۔ باقی کہانیوں میں نینا خان کی روح کی واپسی قابل ذکر ہے، باقی کہانیاں بھی ٹھیک

ٹھاک تھیں۔

☆☆ خائستہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، ہر رسالے میں ایسا ہوتا ہے کہ ساری کی ساری کہانیاں سب کو پسند آئیں، خیر پسند اپنی اپنی، کیوں ٹھیک ہے ناں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

کائنات بلوچ بلوچستان سے، السلام علیکم، میں نے جو پہلا خط بھیجا تھا وہ آپ نے شائع کرکے خوش کردیا، ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ بہت جلدی ملا، اور اس بات کے لیے میں آپ سب کی شکرگزار ہوں۔ قرآن کی باتیں ایک بہترین سلسلہ ہے، خطوط میں سب دوستوں کے خط پسند آئے۔ خاص کر پہلا خط بہت پیارا تھا۔ اس بار واقعی مسز زینت خان نے دل سے خط لکھا تھا۔ بلقیس خان ویلکم بیک ٹو ڈر ڈائجسٹ، اب وعدے کے مطابق سالگرہ نمبر میں کہانی لکھ ڈالیے گا۔ دل نور عمیر نے بھی دل کی باتیں لکھی تھیں۔ بینا خان اور نینا خان کیا آپ کے نام ملتے ہیں۔ عثمان غنی کا خط بہت بہترین تھا، اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین، اس ماہ شکیل نیازی کی کہانی بلیک میجک نے اچھوتی اور نئی کہانی کا بہترین ثبوت دیا۔ ویلڈن شکیل نیازی، مگر آئی تھینک یہ ایک ترجمہ کہانی تھی۔ اور اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی آخری صفحات پر عثمان غنی کی جرم محبت رہی، اس کہانی میں بہت روانی تھی۔ اس کے سین اور ڈائیلاگ زبردست تھے۔ میں نے تو یہ کہانی کئی بار پڑھی۔ اور مجھے ایسی ٹرائنگل لو سٹوریز بہت پسند ہوتی ہیں۔ کمال کی کہانی تھی۔ میں نے تو اپنی امی کو بھی پڑھائی، میری امی نے بھی بہت پسند کی۔ نینا خان کی روح کی واپسی نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ نینا خان آپ تیزی سے میری من پسند لکھاری بن رہی ہیں۔ واؤ، آپ عام سی کہانی کو خاص بناتی ہیں۔ باقی کہانیوں میں ایس امتیاز کی دہشت ایک معلوماتی تحریر رہی۔ سالگرہ نمبر میں میرے فیوریٹ لکھاری عثمان غنی کی کہانی ضرور ہونی چاہیے، ورنہ میں نے ناراض ہوجانا ہے۔ مکافات عمل پسند نہیں آسکی۔ جبکہ جان لیوا اچھی جارہی ہے۔ مجھے جان لیوا بہت پسند ہے۔ سب دوستوں کو سلام۔ آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اب اجازت چاہوں گی۔

☆☆ کائنات صاحبہ: دل کی گہرائی سے نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، چلئے خوش ہوجائیں آپ کے فیورٹ رائٹر عثمان غنی کی کہانی شامل اشاعت ہے۔

امرحہ خان ملتان سے، ماہ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ بہت جلدی مل گیا۔ ٹائیٹل بہت پیارا تھا۔ مجھے اچھا لگا، ڈر ہمارا محبوب رسالا ہے۔ اور مجھے بے حد پسند ہے، اس بار زیادہ نئے لوگ ڈر میں نظر آئے، لگتا ہے، واقعی تبدیلی آگئی ہے۔ مسز زینت خان نے جو بھی لکھا، بہت خوب لکھا، اس بار زیادہ لوگوں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔ واقعی مجھے بھی یہ بات بے حد پسند آئی، کہ کہانیوں کی تعریف اور تنقید قاری کو کہانی مدنظر رکھ کر کرنی چاہیے، خطوط میں ایس حبیب کی کمی محسوس ہوئی، نینا کا خط بہت اچھا لگا، اس کے علاوہ، دل نور عمیر کا نام بہت پیارا لگا، اور مجھے عثمان غنی کا خط بھی اچھا لگا اور پسند آیا۔ عثمان غنی، آج کل چھا رہے ہیں۔ مریم فاطمہ کا لکھنے کا انداز ٹھیک ٹھاک ہے، اس ماہ ڈر کی بہترین تحریر عثمان غنی کی کہانی جرم محبت نے سارے شکوے گلے دور کردیے، کیونکہ میں ڈر کے صفحات کی کمی کی وجہ سے بہت دکھی تھی، دوسری اچھی اور پیاری کہانی بلیک میجک رہی، تیسری کہانی، جس نے چونکا دیا، وہ دہشت ایس امتیاز کی تھی، اور اس کے علاوہ نینا خان بہت اچھا لکھ رہی ہیں، نینا صاحبہ آپ نے اپنی جگہ ڈر میں بنالی ہے۔

☆☆ امرحہ صاحبہ: بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ گھر میں کہانی لاکر خود ہی وش کریں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل وکرم رکھے، خوش رکھے صحت دے، تندرستی دے تاکہ ڈر کے لئے خط لکھتی رہیں۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! ماہ ستمبر کا ڈر بہت جلد مل گیا، ٹائیٹل بہت جاندار اور شاندار تھا۔ پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ خوشی ملی۔ اپنی بات میں خالد صاحب سے ملاقات ہوگئی، بہت اچھا لگا۔ اللہ ڈر کو کبھی بند نہ کرے، اور آپ کے ادارے کو ہمت اور طاقت دے، تاکہ ڈر بروقت ہمیں ملتا رہے۔ خطوط سب کے اچھے تھے۔ فلک زاہد کو سلام، عثمان غنی کا خط بہت شاندار تھا۔ آپ کو حیثیت کی کامیابی پر بہت بہت مبارک ہو، جبکہ اس ماہ فلک زاہد کی کمی محسوس کی۔ اس کے علاوہ بہت سے نئے نام نظر آئے۔ جو کہ ایک اچھا چینج لگا۔ کہانیوں میں پہلی کہانی، بلیک میجک نے، شکیل نیازی، کو بہترین رائیٹر ثابت کیا۔ مگر مجھے یہ شکوہ ہے کہ بلیک میجک اگر کسی فلم کی کہانی ہے، تو مہربانی فرما کر اس فلم کا نام آخر میں ضرور مینشن کیا کریں۔ تاکہ ہمیں کوئی شکوہ نہ ہو، اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی عثمان غنی کی جرم محبت رہی۔ اس کہانی میں تسلسل تھا۔ کوئی بھی بور سین نہیں تھا۔ یہ ڈر ڈائجسٹ کی ایک بہترین تحریر تھی۔ جس نے عثمان غنی کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہی کیا۔ نینا خان کی روح کی واپسی نے بھی بے حد متاثر کیا۔ نینا خان ماشاء اللہ بہت

تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ کیمیکل زیرو فور ایک کمزور پلاٹ کی وجہ سے ایک فضول کہانی رہی، دہشت ایک بہترین کہانی رہی۔ اس کے علاوہ قسط وار تحریروں میں صرف اور صرف جان لیوا اپنی نام کی طرح بہترین ہے، ڈر کا سالگرہ سب رائیٹرز کو میری طرف سے دل کی گہرائیوں سے مبارک ہو۔ سوری وقت نہ مل سکا، ورنہ کہانی ضرور لکھتی۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، بلقیس صاحبہ ذرا غور کیجئے گا کیونکہ وقت ملتا نہیں بلکہ وقت نکالا جاتا ہے، امید ہے بہت جلد کہانی ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں گی۔

بینا خان اسلام آباد سے، ستمبر کا ڈر بہت جلدی مل گیا، ایک تو جشن آزادی کی خوشیاں اور دوسری عید کی خوشیوں نے مزہ دوبالا کر دیا۔ اوپر سے اس حسین موقع پر ڈر کا ساتھ بہت خوب صورت دن تھے، اس بار، اپنی بات میں آخر میں لکھا تھا کہ اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں۔ یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی، خطوط میں اس بار سب خطوط بہت اچھے تھے۔ عثمان غنی جامع خط لکھتے ہیں، بہت اچھا لگا آپ کا خط، مسز زینت اور نینا خان کے خط نے ایمپریس کیا۔ اس ماہ کچھ زیادہ ڈر نہیں پڑھا، مگر جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دوں، جرم محبت مجھے اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی لگی، کہانی کی تعریف نہ کرنا اس کے لکھنے والے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کیونکہ اس کہانی میں روانی اور تسلسل آخر تک جکڑے رکھا۔ جیسے چین کی کڑیاں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری ہوتی ہیں۔ بہت اعلیٰ کہانی تھی۔ اتنی اچھی کہانی پر مبارکباد قبول کریں۔ دہشت بھی معلوماتی تحریر تھی، روح کی واپسی عام سی کہانی کو نینا خان نے بہت خاص بنایا۔ باقی کہانیوں میں جان لیوا بس ڈر کے عین مطابق ہے۔

☆☆ بینا صاحبہ: خلوص دل سے لکھا ہوا خلوص نامہ پڑھ کر اچھا لگا۔ اور اب قوی امید ہے کہ آئندہ بھی نوازش نامہ ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ Thanks۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام ترسلسلے خوب رہے۔ آرٹیکل لگانے کا تھینکس۔ میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا۔ مزید میٹرز ارسال خدمت ہیں پلیز قرعہ اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ڈویورز کو دعا سلام..... اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: پلیز! اپنا بھی خیال رکھئے گا، میٹرز بھیجنے کے لئے شکریہ۔

محمد اسحاق انجم کنگن پور سے، بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت ہوں گے۔ شمارہ اگست 2018ء ملا اور وہ بھی بڑی مشکل سے اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ سارے ادارے کن مشکلات سے گزر رہے ہیں، اب اگر کام کرنا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ برائے مہربانی ڈر کی قیمت بڑھا کر پرچے کو بروقت ترسیل اور اشاعت بروقت رکھیں۔ سرورق اس بار بھی عظیم صاحب حسینہ کے ہاتھ میں جام پکڑا کر لے آئے۔ ڈائجسٹ، آپ سب کی محنت اور لگن سے ٹھیک جا رہا ہے۔ کہانیاں بھی چونکا دینے والی ہیں ہر کہانی میں نیا خیال، نیا رنگ ہر ایک رائٹر کی محنت شامل اشاعت ہے۔ سب ٹھیک لگ رہے ہیں ایک ہمارے سوا، اس بار خالد علی صاحب ڈر میں کافی عرصہ بعد اپنی بات کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تمام دوستوں کو خلوص دل سے آداب وسلام! میری حاضری کبھی کبھی قبول کر لیا کریں۔

☆☆ اسحاق صاحب: وطن عزیز میں بڑھی ہوئی تمام چیزوں کی مہنگائی اور خاص طور سے کاغذ کی بحرانی کیفیت نے پبلشروں کو ہلکان کر کے رکھ دیا ہے، اور اس بنا پر سب کے سب قیمت بڑھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں، خیر آپ کے نوازش نامہ کا آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹرز، اسٹاف، شعرا، رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! ستمبر کا شمارہ مطالعہ کے بعد زیر تبصرہ ہے۔ عظیم صاحب سرورق پر واقعی آپ بہت محنت کر رہے ہیں اسے مزید خوفناک بنائیں۔ ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پڑھ کر ایمان اور روح تازہ ہو گئے۔ خالد صاحب آپ نے ڈر بند نہ کرنے کا فیصلہ کر کے قارئین کے دل جیت لئے۔ محترم قارئین اگست کے شمارے میں شائع ہونے والی کہانی ''چھٹکارا'' سے میرا کوئی تعلق نہیں میرا نام غلطی سے شائع ہو گیا تھا۔ دراصل چھٹکارا کہانی عمران قریشی کوئٹہ کی تھی۔ اس بار تبصرہ نگاروں نے لگن اور محنت سے خوب لکھا۔ بلقیس خان، کائنات بلوچ، مہرینہ غلام علی، سیدہ عروج فاطمہ،

دل نور عبیر، مسز خائستہ رحمان، خدیجہ فاطمہ، نینا خان صاحبہ، بسما خان، محترم احسان الحق، ایس امتیاز احمد، عثمان غنی، ہر دلعزیز پرویز احمد دولو نے لکھنے کا حق ادا کر دیا، محمد حنیف شاکر، ایس حبیب خان، رشک نور، ساحل دعا بخاری، خالد عباس، فلک زاہد، فرح انیس اور محسن عزیز کے خطوط کو Miss کیا۔ نینا خان، بسما خان اور حامد شکور کو ڈر میں موسٹ ویلکم، نینا خان ہمیشہ کی طرح منفرد، اچھی اور خوب صورت ڈراؤنی کہانی لانے میں کامیاب رہیں۔ نثار فاطمہ نے بھی خوفناک اور عبرتناک کہانی لکھی۔ عثمان غنی آپ بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ نورین اکبر حسین کی کہانی بھی لرزا کر رکھ دیا۔ مریم فاطمہ تسیں وی گریٹ او، گلاب خان بھی منجھے ہوئے رائٹرز میں شمار ہونے لگے ہیں۔ شکیل نیازی کی ''بلیک میجک'' اسد اللہ بھٹی کی ''خونی بدروح'' شہزاد خان کی ''شیطانی کھنڈر'' محمد قاسم رحمان کی ''درد دل'' ایس امتیاز احمد کی ''دہشت'' مدثر بخاری کی ''شیطانی عمل'' بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب آپ کے پاس میری کہانی ''شیطانی ہوس'' کافی عرصہ سے پڑی ہوئی ہے۔ جو میں نے کسی خاص اپنے کی فرمائش پر لکھی تھی۔ براہ مہربانی اسے سالگرہ نمبر میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ دعائے خیر ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ (آمین)

☆☆ عامر صاحبہ: خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار رہتا ہے، شیطانی ہوس کے لئے فکر نہ کریں ضرور چھپے گی، ویسے بھی ہر ماہ آپ کی کہانی ضرور چھپ رہی ہے۔ پلیز کوشش جاری رکھیں، Thanks۔

حنیف شاکر ننکانہ صاحب سے، محترم و مکرم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! سلام خلوص کے بعد خیریت کا طالب اللہ کے فضل و کرم سے بالکل خیریت سے ہے اور آپ سب کی خیریت کے لئے پانچ وقت نماز پڑھنے کے بعد دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ آپ سب کو بمعہ اہل وعیال خوش وخرم رکھے آمین۔ ثم آمین۔ ستمبر کے شمارہ میں قرآن مجید فرقان حمید کتاب مبین کی تحریر نے نہ صرف ایمان کو تازہ کیا بلکہ دل میں سے گزرتی ہوئی روح کی گہرائی تک پہنچ گئیں۔ اس پر میں آپ کا اور شمع بک ایجنسی والوں کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہم جیسے گنہگاروں کو قرآن پاک کے مفہوم سے ڈر کے واسطے سے روشناس کرا رہے ہیں۔ خطوط کی دنیا میں قدم رکھا تو ڈر کے قارئین کی تشویش ہی تشویش نظر آئی جس پر میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ مہک فاطمہ اور ردا فاطمہ نے دوسرے کئی رائٹروں کے ساتھ اچھی کہانیاں لکھنے پر میری بھی حوصلہ افزائی کی جس پر میں اپنی پیاری پیاری سی ننھی منی بیٹیوں کا بہت بہت دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب نے ڈر میں میری عدم موجودگی کی شکایت کی تو جناب بندہ تو ہر ماہ باقاعدگی سے خط بھی لکھ رہا ہے اور غزل بھی دو عدد کہانیاں بھی بھیج رکھی ہیں، آگے پھر ادارہ والوں کی مرضی، جناب میں نہ تو ناراض ہوں اور نہ ہی غصہ کرنے والا ہوں، اگر مجھے نظر انداز کیا جا رہا ہے تو بھی کوئی بات نہیں اللہ انہیں خوش رکھے۔ تمام خواتین وحضرات کو عمدہ کہانیاں تحریر کرنے پر بہت بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشیوں سے مالا مال کرے۔ آمین پچھلے ہفتے عید کے روز میری بھابھی ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیاری ہو گئی تو آج دو ستمبر کو میرے ماموں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس لئے دل کچھ اداس اداس سا ہے۔ اگر اللہ نے زندگی بخشی تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ آخر میں سب کو بہت بہت سلام، ڈر کے لئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نظر بد سے بچائے اور یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ حنیف شاکر صاحب: اوروں کی طرح آپ بھی ہمارے لئے معزز ومحترم ہیں آپ بھی دل میں رہتے ہیں، آپ کی ایک کہانی پڑی ہے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہے، دوسری اب آئی ہے لیٹ اور خط یا غزل اگر لیٹ موصول ہوں تو اس کا حل بتائیں، دراصل آپ مصروف ترین ہیں وقت کی کمی کی وجہ سے، اکثر لیٹ ہو جاتے ہیں۔ امید ہے غور فرمائیں گے اور ہاں خط میں کتنے اشعار لکھ دیئے ہیں اس پر بھی غور کیجئے گا۔ خط میں پوری غزل لکھ دی۔ غزل قوس قزح میں ارسال کیا کریں۔

محمد طاہر اشتیاق ڈی جی خان سے، السلام علیکم! ڈر ستمبر کا شمارہ 25 اگست کو ملا۔ آغاز قرآن کی باتوں سے کیا۔ پھر سب سے پہلے آسیبی کوٹھی پڑھی، بہت اچھی تھی۔ ڈر کا یہ شمارہ ایک شاہکار ثابت ہوا۔ تمام ہی کہانیاں زبردست تھیں۔ لیکن دو کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ کالا جادو اور روح کی دوستی۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ ڈر کے تمام رائٹرز اپنے قلم سے ایسے ہی شاہکار کہانیاں لکھتے رہیں۔ میری ایڈیٹر صاحب سے ایک گزارش ہے کہ وہ میری کہانی جو میں ارسال کر رہا ہوں اس کو ضرور شائع کریں۔ پچھلے مہینے بھی ایک کہانی بھیجی تھی۔ جس کا نام ''بیٹی'' تھا۔ لیکن وہ شائع نہ ہو سکی۔

☆☆ طاہر صاحب: دل برداشتہ نہ ہوں، آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی، خط لکھنے اور مزید نئی کہانی بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے، السلام علیکم! میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ناواقفیت بھی نعمت ہے، عملی زندگی میں آئے، جوں جوں آگہی ہوتی گئی، دکھوں کی دلدل میں دھنستے گئے، تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھا تو پھر زندگی عذاب بن گئی، حیوان کا دکھ برداشت نہیں ہوتا اور یہاں تو مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، پوری قوم بے حسی سے خون میں نہائے انسانوں کو دیکھ کر ہنستی مسکراتی گزر جاتی ہے۔ لکھاری تو ہر وقت دکھوں کی وادی میں گھرا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل نواحی گاؤں کے لوگ لین دین کے معاملے میں آئے۔ بات ہاتھ پائی تک پہنچی تو بھاگ نکلے، راستوں سے انجان، پیچھے پورا گاؤں تعاقب میں، کچھ لوگ ہتھیاروں سے لیس، ان کو بھگا بھگا کر گولیاں ماریں، ایک جاں بحق دیگر زخمی ہوئے۔ پھر گاؤں والوں کی غیرت جاگی، مرحوم اور زخمیوں کو لاتوں، مکوں، گھونسوں سے مارنا شروع کردیا۔ پولیس آئی۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لاش رکھ کر پولیس وین میں رکھنے لگے، تو آگے پیچھے سے چارپائی اٹھانے والے مرنے والے کو اشارے کر کے ہنسی مذاق اور طعنے دینے لگے، دور کھڑے لوگوں کو بے بسی پر قہقہے مارنے کے لئے بلانے لگے۔ اسکول میں تفریح کا وقت تھا کہ ساتھی سر انور شہزاد کو فون آیا۔ فوراً قبرستان پہنچو ایمرجنسی ہے۔ وہاں پہنچے تو ایک ننھا فرشتہ تقریباً ایک ماہ عمر کھیت میں شدید گرمی کے موسم میں تڑپ رہا تھا۔ وہاں سے اٹھا کر سائے میں لائے، معصوم گول مٹول، خوب صورت جب آنکھ کھول کر جھپکتا تو دل کو چیر کر رکھ دیتا، آخر کسی ماں کا تو لال تھا، تخیل میں پیدائش، پھر کھیت تک سفر اور اب آئندہ زندگی کے بارے میں سوچا تو آنسوؤں کی جھیل میں ڈوب گیا۔ میاں چنوں کے تھانے پہنچے، ملتان چلڈرن پروٹیکشن بیورو سے عملہ آیا، بچہ ان کے حوالے کیا، جب واپس گھر کو لوٹے تو لگ یوں رہا تھا کہ اپنے لخت جگر کو کسی ظالم کے حوالے کر کے کتنے مجبور ہو کر خالی ہاتھ واپس لوٹ رہے ہیں۔ دکھ ہے کہ تھم ہی نہیں رہا۔ بچے کے بارے میں جس کو بھی بتایا پہلے آنسوؤں کی پھوار آنکھوں سے شروع ہوگئی۔ محترم ایڈیٹر صاحب! تبدیلی آگئی ہے پوری قوم کی طرح آپ بھی تھوڑا سا صبر کریں۔ انشاء اللہ بہتر ہوگا۔ محترمی نینا خان، عامر شہزاد اور عثمان غنی کی یادآوری پر ممنون ہوں۔ شکیل نیازی کی بلیک میجک لازوال سبق آموز تحریر تھی۔ دیگر تمام کہانیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ویسے قوم ملک کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ مہر پرویز صاحب: تحریر کردہ حقیقت پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا، ہر غریب اور کمزور آدمی ناقابل برداشت حالات سے دوچار ہے اور ارباب اختیار جو ہیں..... مست رہو مستی میں اور آگ لگے بستی میں..... عیش و عشرت میں پڑے ہیں..... ہم سب مل کر دعا کریں..... ایک نا ایک دن اللہ تعالیٰ ضرور کمزوروں کی سنے گا۔

عثمان غنی پشاور سے، سب سے پہلے پورے ادارے کو دل کی گہرائیوں سے عید قرباں کی خوشیاں مبارک ہوں، قرآن کی باتوں نے دل میں سکون کی ٹھنڈک کردی۔ اللہ ڈر کو یوں ہی ترقی سے ہمکنار کرتا رہے۔ سب سے پہلے تو مسز زینت خان کی ساری باتیں تحمل سے سنیں۔ اس کے بعد ایڈیٹر نے بہترین جواب دیا، بلقیس خان کو ویلکم بیک، باقی جتنے بھی لوگوں نے میری کہانی حیثیت کو پسند کیا، ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، آپ سب دوستوں کا یوں ہی محبتوں بھرا ساتھ رہا تو میں آپ سب کو کبھی نہیں بھول سکوں گا، خاص کر مہر پرویز احمد دولو صاحب کا، نینا خان، دل نور عمیر، ایس حبیب خان، مہرینہ غلام علی، کائنات بلوچ، بسما خان، بینا خان، خدیجہ فاطمہ، سیدہ عروج فاطمہ اور مریم فاطمہ، فلک زاہد، ناصر محمود فرہاد، ایس امتیاز احمد آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ کہ میری تحریریں بھی آپ سب کے باعث، ڈر کے صفحات پر جگمگا رہی ہیں، حیثیت پر میں نے بہت محنت کی تھی، اور اللہ محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ جرم محبت، شائع کرنے کا تہہ دل سے شکریہ قبول کریں، کہانیوں میں اس ماہ شکیل نیازی کی کہانی بلیک میجک نے ایک بہترین کہانی کا اعزاز حاصل کرلیا۔ خونی بدروح بس ٹھیک تھی، روح کی واپسی بہن نینا خان کی بہترین کہانی ہے، مجھے اس کہانی نے بہت متاثر کیا۔ کالا جادو بھی ٹھیک تھی، درد دل بس سہی تھی۔ خبیث بہتر کہانی تھی، شیطانی عمل بھی بہترین تھی۔ جرم محبت پر بے حد محنت کی تھی، ڈر ڈائجسٹ کو دل کی گہرائیوں سے وش کرنا چاہوں گا۔

☆☆ عثمان صاحب: ارسال کردہ نوازش نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ یاد رکھیں محنت ہمیشہ رنگ لاتی ہے، جس کا ثبوت آپ کی کہانیاں ہیں جو کہ خوب سے خوب تر ہو رہی ہیں، امید ہے آئندہ بھی بہترین کہانیاں لکھتے رہیں گے۔ Thanks۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم تمام ڈراسٹاف، ریڈرز اینڈ رائٹرز کو ہماری طرف سے محبت بھرا اسلام، بات ہو جائے ستمبر کے شمارے کی..... تو وہ ہمیں کہیں نہیں ملا، کنگن پور، ٹھینگ موڑ عثمان والا، کہیں سے بھی نہیں ملا، اگست کا شمارہ بھی مجھے 12 اگست کو ملا اور وہ بھی بڑی منت سماجت کے بعد ملا، آپ تو کنگن پور میں ڈر ڈائجسٹ بھیجتے ہیں تو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ مجھے کہتے ہیں

اب ایسے ہی آیا کرے گا۔ آپ وقت پر کنگن پور ڈر ڈائجسٹ بھیج دیا کریں،

☆☆ محسن صاحب: پچھلے شماروں کو بھول جائیں اب ہر ماہ ڈر ملتا رہے گا، اور اگر پھر بھی نہ ملے تو -/1500 روپے ارسال کر کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ ہر ماہ کی جھنجھٹ سے جان چھوٹ جائے گی۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، پچھلی بار ڈر ڈائجسٹ کے انتظار میں کافی چکر شہر کے لگانے پڑے مگر پھر بھی ملاقات نہ ہوسکی، آخر کار 8 اگست کے بعد ہم نے خط لکھنے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ شاید کہ پرچہ بند ہو گیا ہو۔ دل بے تاب تھا کہ ڈر ڈائجسٹ کا دیدار ہو جائے گا مگر ناکامی ہوئی۔ میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں، آپ جس خلوص اور محبت سے ہم کو یاد کرتے ہیں بہت بہت شکریہ عید کے بعد کسی اور بک اسٹال پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ماہ ستمبر 2018ء کے پرچے سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ دل کو بہت خوشی ہوئی، سرورق بڑے کمال کا تھا۔ غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ پرچے کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر اچھے مثلاً اداریہ، قرآن کی باتیں، قوس قزح اور غزلیات وغیرہ ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی۔ خطوط قارئین کا مطالعہ کرنے پر ڈر ڈائجسٹ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کافی عرصے کے بعد یہ تحریر حاضر خدمت ہے۔ موسم آہستہ آہستہ تبدیل ہونے کے قریب ہے۔ اس بار تمام پرچے کے گلے شکوے دیدار کے بعد دور ہو گئے۔

☆☆ جاوید صاحب: پچھلے ماہ ڈر نہ ملنے کی وجہ سے جو تکلیف آپ کو ہوئی اس کے لئے معذرت، دراصل پرچہ شارٹ ہونے کی صورت میں ایسا ہو گیا تھا، خیر آپ کا نوازش نامہ پڑھ کر مجھے بھی بہت دلی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے تاکہ ہر ماہ ہماری ملاقات ہوتی رہے۔

بلال تابش واہ کینٹ سے، السلام علیکم ڈر کا شمارہ میری زندگی میں کچھ ہی ماہ پہلے شامل ہوا ہے، مگر اب جب میں اسے نہ پڑھوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی میں کچھ کمی سی ہے، اس لیے میں اس بات سے بہت پریشان ہوا تھا، جب مجھے ماہ اگست کا ڈر نہ مل سکا تھا، مگر شکر ہے کہ ماہ ستمبر کا بروقت اور عید سے پہلے مل گیا، قرآن کی باتیں ایمان کو تازہ کردیتی ہیں، اپنی بات میں خالد صاحب نے، بہت اچھی باتیں کی، جبکہ خطوط میں شاہد صاحب نے سب کو دل سے جو جوابات دیے تھے، وہ سارے خطوط میں نے کئی بار پڑھ لیے، خطوط میں سب کے خط بہت اچھے تھے، عثمان غنی، نے جرم محبت سے پردہ اٹھایا، یہ کہانی پورے ڈر ڈائجسٹ کی جان تھی۔ سب سے بہترین کہانی، جس میں آخری سین میں ایک بہت گہرا پیغام بھی موجود تھا۔ بلیک میجک نے پوری طرح سے جادو جگایا، شکیل نیازی نے بلاشبہ ہمیشہ کی طرح منفرد موضوع کا انتخاب کیا اور وہ اس میں پوری طرح سے کامیاب ہو گئے۔ باقی تحریروں میں کالا جادو، شیطانی عمل، اچھی لگی، اور روح کی واپسی نے بھی متاثر کیا۔ ڈر کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔

☆☆ بلال صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

سردار اعظم خان چترال سے، السلام علیکم ڈر سے بس اتنا سا ہی رشتہ ہے کہ اپنی بہن شہلا کو اسے پڑھتے ہوئے دیکھا تو خود بھی خریدنے لگا۔ حالانکہ پھر اس کی ایسی لت لگی کہ چھوٹی ہی نہیں، میرا تعلق چترال سے ہے، اور میں پورے ملک میں اپنی نوکری کی بدولت گھومتا پھرتا رہتا ہوں، مگر ڈر سے اس کے باوجود میرا تعلق نہیں ٹوٹا۔ ماہ ستمبر کا ڈر جلد مل گیا، قرآن کی باتیں، ہمیشہ کی طرح سب سے بہترین ہیں، کہانیوں میں اس بار میں صرف اس لیے خط تحریر کر رہا ہوں کیونکہ ڈر ڈائجسٹ میں مجھے اس ماہ جس کہانی نے سوچنے پر مجبور کردیا، وہ عثمان غنی کی جرم محبت ہے، کیا اتنی زبردست، فنتاسٹک کہانی جس میں مسلسل روانی تھی، کسی بھی جگہ ایک لفظ بھی کہانی میں کوئی بھی بور کرنے والا نہیں تھا۔ میں تو بھائی آپ کا پکا فین ہو گیا ہوں، میری عمر کوئی چالیس سال کے قریب ہے، مگر یا تو آپ نے کہانی بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی، یا آپ کوئی بہت میچور قسم کے بندے ہیں، شکیل نیازی کی کہانی، بلیک میجک، شاید ترجمہ تھی۔ یا اگر نہیں تھی، تو بہت خوبصورت بہترین اور منجھی ہوئی کہانی تھی۔ دہشت، ایس امتیاز کی کہانی نے واقعی بہت زبردست معلومات سے آگاہی فراہم کر دی۔ نینا خان کی روح کی واپسی بس اچھی رہی، باقی کہانیاں گزارے لائق تھیں۔ میں چترال کا نام ور لکھاری ہوں، اور میں نے اپنی زبان میں کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ فقط دعا گو۔

☆☆ سردار صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، اور امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خوشی کا موقع ضرور دیں گے۔

☆☆

پراسرار لڑکی

عمران قریشی-کوئٹہ

نوجوان نے خوبرو حسینہ سے پوچھا، جاگیردار کی حویلی میں تیری ہم شکل لڑکی کون تھی جسے جاگیردار اپنی بیوی سمجھ رہا تھا، لڑکی ہنسی اور بولی، وہ میری ہمزاد ہے میری غیر موجودگی میں.....

زور زبردستی دھونس اور طاقت کا مظاہرہ اکثر جان لیوا ہوتا ہے، ثبوت کہانی میں ہے

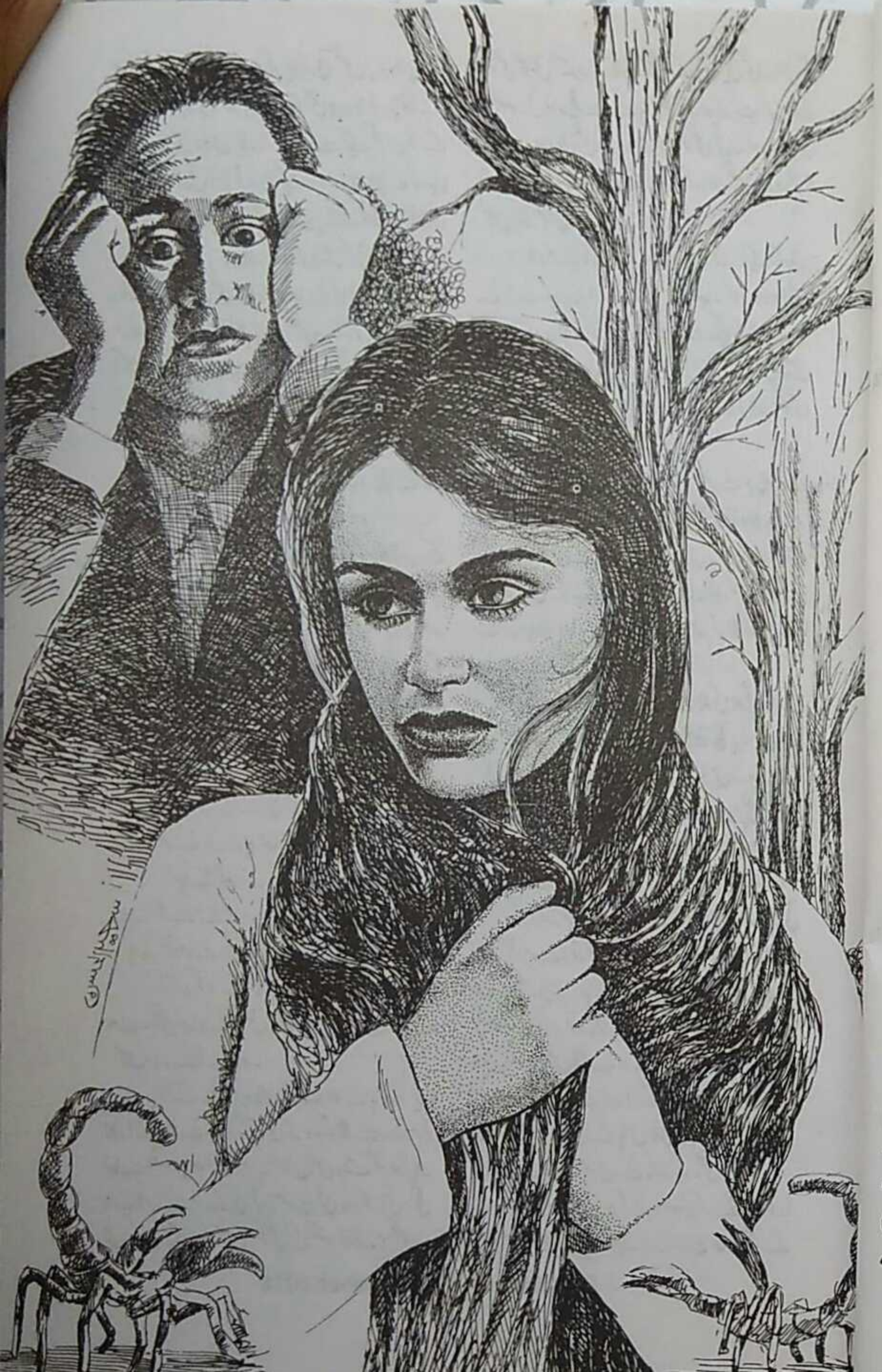

جھلم سے تین گھنٹے کی مسافت پر ایک چھوٹا سا گاؤں ٹیلہ جوگیاں واقع ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس ٹیلے پر گورو ناتھ کے جوگیوں کی اکثریت آباد تھی۔ اس لئے ٹیلے کا نام ٹیلہ جوگیاں پڑ گیا۔ رانجھے نے ہیر کے فراق میں یہاں کافی عرصہ گزارا۔ ٹیلہ جوگیاں سے پندرہ منٹ کی دوری پر چک پینتیس واقع ہے۔ آبادی بمشکل پندرہ گھروں پر مشتمل ہے۔ اور ان پندرہ گھروں کی توجہ کا مرکز قیوم جوگی کا ہوٹل تھا۔ سرشام ہوٹل کے سامنے کھلی زمین پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد بنچوں کو ترتیب دیا جاتا تھا۔ ان بنچوں کے سامنے لکڑی کی میز پر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی رکھ دیا جاتا تھا۔ آٹھ بجے ٹی وی پر ڈرامہ لگتا تھا۔ جسے دیکھنے کے لئے دور دراز کے گاؤں سے لوگ جوگی ہوٹل کا رخ کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ٹی وی کی نشریات شاذ و نادر دیکھنے کو ملتی تھیں۔

قیوم کا قریبی رشتے دار شہر میں ملازمت کرتا تھا۔ اسے جب بیرون ملک جانے کا موقع ملا۔ تو اس نے ٹی وی قیوم کو دے دیا۔ ٹی وی خراب تھا۔ اور اس کا اینٹینا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ تاہم قیوم نے معمولی خرچ کے بعد اسے ٹھیک کروالیا۔ یوں چند دنوں کی مشقت اور مختصر رقم خرچ کرنے کے بعد اس کے منی سینما گھر نے اردگرد کے علاقوں میں دھوم مچا کر رکھ دی۔

گاؤں والے سرشام اپنے کاموں سے فراغت کے بعد جوگی ہوٹل کا رخ کرتے۔ اور رات گئے تک ٹی وی کی ہوش ربا نشریات سے محظوظ ہوتے تھے۔ نشریات کے دوران چائے کا بے دریغ استعمال ہوتا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کی یہ چائے جوگی ہوٹل سے انہیں دستیاب ہوتی تھی۔ تاہم گاؤں والوں کی اکثریت معمولی کسانوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے معمولی مزدوروں پر مشتمل تھی۔ اس لئے ادھار کا کھاتا بھی کم و بیش چلتا رہتا تھا۔ لیکن گاؤں والے دیر سویر رقم کی ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔

ٹی وی کی نشریات چونکہ پانچ بجے کے بعد شروع ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے گاؤں کے کسان بھی پانچ بجے کے بعد ہوٹل کا رخ کرتے تھے۔ دن کے وقت کام عموماً کم ہوتا تھا۔ اسے دن کے وقت کام بڑھانے کے لئے چھوٹے پروجیکٹر کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کی خریداری کے لئے تگڑی رقم کی ضرورت تھی۔ وہ رقم پس انداز کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں مناسب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے

ہوٹل کی طرف آنے سے گریز کرتی تھیں۔ وہ ان کے لئے علیحدہ جگہ کی تکمیل کے لئے بھی پیسہ جوڑ رہا تھا۔

انہی دنوں ٹیلہ جوگیاں سے ایک کم سن لڑکے نے جوگی ہوٹل آنا شروع کیا۔ وہ اپنے چہرے کو سیاہ کپڑے میں چھپائے پچھلے بنچوں پر الگ تھلگ بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر چند کے اس میں کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تاہم نہ جانے کیوں قیوم کو اس کی حرکات مشکوک معلوم پڑتی تھیں۔ گاؤں والوں میں اکثریت کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اگلی نشست پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن لڑکا پچھلے بنچوں کو انتخاب کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اگست کے حبس آلود دن ہونے کے باوجود بھی وہ چہرے کو سیاہ کپڑے میں پوشیدہ رکھتا تھا۔

قیوم چک پینتیس کے علاوہ اردگرد گاؤں کے تمام رہائشیوں سے واقفیت رکھتا تھا لیکن لڑکے کی شخصیت سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ ٹی وی ڈرامہ شروع ہونے کے بعد وہ لڑکا نہایت انہماک کے ساتھ ماحول سے لاتعلق ہوکر بیٹھ جاتا تھا۔ قیوم چائے بناتے ہوئے اس کے سراپے کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ ایک دن ڈرامہ شروع ہونے کے بعد اس نے تجسس سے مجبور ہوکر لڑکے کے بنچ کا رخ کیا۔ اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''چائے بھجواؤں۔ میں نے ابھی ابھی تیار کی ہے۔'' لڑکے نے جواب دینے کے بجائے انکار میں سر ہلایا۔ قیوم نے دوبارہ پوچھا۔

''اردگرد کے تمام گاؤں والوں کو میں جانتا ہوں۔ لیکن تمہارے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لگتا ہے کہیں دور سے آتے ہو۔''

لڑکے نے غوں غاں کرتے ہوئے ہاتھ کو نچایا اور اسے بتانے کی کوشش کی کہ وہ گونگا ہے۔ قیوم کو نہایت افسوس ہوا۔ تاہم یہ افسوس اس وقت ختم ہوگیا۔ جب اس نے لڑکے کی غیر معمولی لمبی اور مخروطی انگلی میں سرخ رنگ کی نفیس انگوٹھی کی مختصر جھلک دیکھی۔ انگوٹھی قابل حسین اور کافی مہنگی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور قیمت سے بالانظر اسے حیرت اس بات پر محسوس ہورہی تھی کہ وہ زنانہ انگوٹھی تھی۔ اور اس کی مخروطی انگلیاں اس بات کا اظہار کررہی تھیں کہ وہ لڑکا نہیں بلکہ کم سن لڑکی تھی۔

ڈرامے کا وقفہ ختم ہونے والا تھا۔ ایک کسان نے اسے چائے لانے کے لئے کہا۔ اور وہ واپس لکڑیوں پر دہکتے ہوئے چائے کے دیگچے کی طرف چلا آیا۔ تاہم اس کا دماغ اب بھی مخروطی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی میں الجھا ہوا تھا۔ کوئی بھی لڑکا زنانہ انگوٹھی پہننے کی کوشش نہیں کرسکتا تھا۔

وہ یقیناً لڑکی تھی۔ اور اپنی شخصیت کو چھپانے کے لئے گونگا بننے کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔ آواز بدلنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ تدبیر قابل تعریف تھی۔ نو بجے ڈرامہ ختم ہوگیا۔ اور متعدد لوگوں کے درمیان وہ پراسرار لڑکی بھی اٹھ کر نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوگئی۔

دوسری رات بھی لڑکی نے جوگی ہوٹل کا رخ کیا۔ حسب معمول وہ سب سے پچھلے بنچ پر اکیلی بیٹھ گئی۔ اور نگاہیں ٹی وی پر مرکوز کردیں۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ گاؤں کے تھکے ہوئے کسان اپنی تھکن کو دور کرنے کے لئے چائے کا بے دریغ استعمال کررہے تھے۔

ڈرامہ شروع ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ قیوم نے اٹھ کر بھاڑا وصول کرنا شروع کیا۔ فی بندہ پانچ روپیہ۔ چائے کے پیسے الگ۔ کچھ نے رقم کی ادائیگی کی۔ اور کچھ نے ادھار کیا۔ قیوم ادھار والی کاپی ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ وہ ادھار والے کا نام بمعہ رقم لکھنے کے بعد آگے بڑھ جاتا۔ آخری رو تک پہنچتے پہنچتے اس کے پاس کافی رقم جمع ہوگئی۔ آج کسانوں کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ تھی۔

پراسرار لڑکی سے کرایہ وصول کرنے کے فوراً بعد ڈرامے کا آغاز ہوگیا۔ اور کسان خاموشی کے

ساتھ ڈرامہ دیکھنے لگے۔ قیوم کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ وہ کالی چادر کے نیچے شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرنے لگا۔ جوگی ہوٹل کے سامنے سے ٹرین کی ڈبل پٹری گزرتی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب سپر ایکسپریس کراس کی نیت سے جوگی ہوٹل کے بالکل سامنے رک گئی۔ مسافروں کا ہجوم ہوٹل پر ٹوٹ پڑا۔

قیوم سے کام سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں چائے اور بسکٹ ختم ہوگئے۔ وہ حفظ ماتقدم کے طور پر پتی۔ چینی اور دودھ کا ذخیرہ ہوٹل میں رکھتا تھا۔ لیکن اس رات خلاف معمول نہیں تھا۔ مجبوراً اسے گاہکوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ سپر ایکسپریس کا گارڈ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قیوم سے پوچھا۔

''کیا تمہارے پاس ٹی وی کا لائسنس ہے؟''

قیوم نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

''جناب میرا ٹی وی سالخوردہ ہے۔ مہینے میں دو دفعہ تو مجھے اس کی مرمت پر خرچہ کرنا پڑتا ہے۔ آمدن اتنی نہیں ہوتی کہ میں لائسنس بنا سکوں۔''

گارڈ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تو تمہارے خیال میں سالخوردہ ٹی وی پر لائسنس لاگو نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے۔ تمہارا ہوٹل ریلوے کی زمین پر واقع ہے۔ اس کا اجازت نامہ دکھاؤ۔''

قیوم بغلیں جھانکنے لگا۔ گارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یعنی سب کچھ غیر قانونی ہے۔ تمہیں معلوم ہے منی سینما گھر میں نابالغ بچوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ مجھے یہاں کافی تعداد بچوں کی بھی دکھائی دے رہی ہے۔ میں حکام بالا کو رپورٹ کئے دیتا ہوں۔ تمہیں جیل تو ہوجائے گی۔ جرمانہ الگ بھرنا پڑے گا۔''

قیوم نے رو دینے والے لہجے میں التجا کی۔

''جناب مجھ پر رحم کیجئے۔ میں کل ہی ٹی وی کو شہر لے جا کر بیچ دوں گا۔ رہی ہوٹل کی بات تو اس کے لئے میں نے ریلوے حکام کو درخواست دی ہوئی ہے۔ جلد ہی منظور ہوجائے گی۔''

گارڈ نے پوچھا۔ ''ٹی وی سے کتنا کما لیتے ہو؟ جھوٹ نہیں بولنا۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت گرفتار کرکے ریلوے تھانے میں بند کرادوں گا۔''

قیوم نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ ''ہزار روپیہ مہینہ۔ اس سے زیادہ منافع نہیں ہوتا۔'' گارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اگر مہینے کے آٹھ سو روپے میرے پتے پر ارسال کردو۔ تو تمہاری تمام جھنجھٹ سے جان چھٹ سکتی ہے۔ تمہارے لئے دو سو روپیہ مہینہ اور ہوٹل کا منافع کافی ہے۔ بصورت دیگر جیل اور جرمانہ تو ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں ریلوے کی زمین کو خالی کرتے ہوئے ہوٹل کو بند کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ میں جلد تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ اور ہاں شناختی کارڈ کے بغیر کسی گاہک کو ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہ دینا۔ ورنہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔'' گارڈ اسے ہکا بکا چھوڑ کر ٹرین کی طرف چلا گیا۔

اور قیوم سوچنے لگا۔ آٹھ سو روپے مہینہ دینے کے بعد اس کے پاس نہایت مختصر رقم بچ جائے گی۔ پروجیکٹر کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔ اور عورتوں کے لئے جگہ کے انتظام کو بھی پس پردہ رکھنا ہوگا۔ لیکن مجبوری تھی۔ اسے یہ سب کچھ کرنا ہی تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ گارڈ کی نیت صرف ڈرانے دھمکانے کی حد تک محدود ہو۔ اور وہ شہر جانے کے بعد واقع کو بھلا دے۔ تاہم شناختی کارڈ والی بات پر عمل درآمد ہونا ضروری تھا۔

رات کو بارہ بجے کے قریب اس نے ہوٹل کو بند کیا۔ اور گھر آگیا۔ گزشتہ سال اس کی بیوی بیمار ہونے کے بعد مرگئی تھی۔ اس لئے گھر کا تمام کام کاج اسے خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس نے دوپہر کی بنی ہوئی دال گرم کی۔ اور روٹی کھانے کے بعد سونے کے لئے

لیٹ گیا۔

دوسری رات سے اس نے گارڈ کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کردیا۔ وہ بنچوں کی طرف جانے والے ہر کسان سے شناختی کارڈ طلب کرتا۔ کسان پہلے تو حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے پھر تلخ لہجے میں وجہ دریافت کرتے۔

قیوم انہیں گارڈ کی ہدایت سے مطلع کرتا۔ گاؤں والوں کے پاس شناختی کارڈ شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ جس کے پاس ہوتا وہ دکھا دیتا۔ اور جس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ برا بھلا کہنے کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ پونے آٹھ بجے کے قریب بنچ پر صرف دس ایسے افراد بیٹھے تھے۔ جن میں سے دو صرف چائے پینے والے اور ٹائم پاس کے لئے آئے تھے۔

آٹھ بجنے میں پانچ منٹ قبل پراسرار لڑکی نے جوگی ہوٹل کا رخ کیا۔ قیوم کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے شناختی کارڈ طلب کیا۔ لڑکی نے نہ سمجھنے والے انداز میں ہونقوں کی مانند اس کی طرف دیکھا۔ قیوم نے اسے بتایا۔

''گورنمنٹ نے شناختی کارڈ کے بغیر ٹی وی دیکھنے پر پابندی عائد کردی ہے۔ اگر تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے تب تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ بصورت دیگر میں معافی چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر ٹی وی دیکھنا اب ممکن نہیں ہے۔''

لڑکی نے غوں غاں کرتے ہوئے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے اشارے قیوم کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ اس لئے اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے خاموش ہونے کے لئے کہا۔ پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''گارڈ کی ہدایات پر عمل کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہ زمین ریلوے کی ملکیت ہے اور میرے پاس ہوٹل چلانے کا اجازت نامہ نہیں ہے۔ اس لئے میں مجبور ہوں۔ شناختی کارڈ کے بغیر تمہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

لڑکی نے اپنی مخروطی انگلیوں سے انگوٹھی نکالی۔ اور اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ پھر ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ غوں غاں شروع کردی۔ قیوم نے انگوٹھی کا معائنہ کیا۔ وہ خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اور بھاری مالیت کی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے بیچ کر ہوٹل کے لئے زمین خرید سکتا تھا۔ اگر زمین اپنی ہو تو ریلوے کا کوئی افسر اس پر زور زبردستی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ لڑکی نے انگوٹھی اسے گروی رکھنے کی نیت سے دی ہو۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا یہ سونے کی ہے؟''

لڑکی نے اقرار میں سر ہلایا۔

''اس کی قیمت ہزاروں میں ہے۔ اگر تم یہ مجھے دے رہی ہو تب میں تمہیں بہ خوشی ٹی وی دیکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ لیکن اسے واپس مانگنے کی بھول نہیں کرنا۔''

لڑکی نے اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے نرم و گداز ہاتھوں کے لمس کو محسوس کرکے قیوم کو اپنے جسم میں کرنٹ دوڑنے کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آئیں اور سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ اس کیفیت کو لڑکی کی کرخت اور مردانہ آواز نے سبوتاژ کرکے رکھ دیا۔ وہ حیرت انگیز طور پر یک لخت بولنے لگی۔

''تم انگوٹھی کو بیچ کر جو بھی کرتے ہو۔ مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں صرف ٹی وی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

قیوم کی زبان گنگ ہوکر رہ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی حس بھی مفقود ہوگئی۔

لڑکی دوبارہ بولی۔ ''میں بولنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مجھے بحالت مجبوری بولنا پڑا۔ میں تمہارے متعلق

اپنے شوہر سے بات کروں گی۔

اس نے مذکر سے یک لخت مونث کا سہارا لیا۔ پھر چہرے سے نقاب کو الٹ دیا۔

قیوم تقریباً بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ حسن و خوب صورتی کا لاجواب مجموعہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آنکھیں غلافی۔ چہرہ نورانی، ہونٹ یاقوتی اور سرو قد..... لیکن اس سب صفات پر پانی پھیرتی اس کی مردانہ آواز..... قیوم مبہوت ہوکر رہ گیا۔

لڑکی چادر دوبارہ لپیٹتے ہوئے بولی۔

''میرے شوہر کی ریلوے حکام میں کافی جان پہچان ہے۔ وہ تمہیں ہوٹل کے لئے با آسانی زمین الاٹ کروادے گا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ٹی وی دیکھنے کے لئے یہاں آتی ہوں۔''

قیوم نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے اسے بنچ پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن رات کو ہوٹل پر ریلوے پولیس کا چھاپہ پڑا۔ انہوں نے نہ صرف قیوم کو گرفتار کیا۔ بلکہ شناختی کارڈ کی مختصر چیکنگ کے دوران لڑکی کو بھی دھرلیا۔ قیوم نے پہلے پہل پولیس والوں کی منت سماجت کی۔ جب بات بنتی دکھائی نہیں دی۔ تو پھر جیب میں سے سونے کی انگوٹھی نکال کر ان کے ہاتھوں میں رکھ دی۔ پولیس والوں کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹنے لگیں۔ ان میں سے ایک بولا۔

''اوئے تیرے پاس اتنی قیمتی انگوٹھی کہاں سے آئی۔ یہ تو ہزاروں کی مالیت کی دکھائی دیتی ہے۔''

قیوم فخریہ لہجے میں بولا۔ ''یہ میرے دادا کی انگوٹھی ہے۔ وہ بہت بڑا جاگیردار تھا۔ آپ اسے رکھ لیجیے اور ہم دونوں کو چھوڑ دیجئے۔'' پولیس والے نے اسے گردن کے پاس سے تھاما اور پولیس وین کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔

''تیرے دادے کی جاگیر کے متعلق میں بہ خوبی جانتا ہوں۔ ان کے ہونے کے باوجود بھی تیرے ہوٹل کی کمائی میرے خیال میں جاگیر کے منافع سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے تو جاگیر کے معاملات سنبھالنے کے بجائے ہوٹل میں خجل خوار ہوتا پھر رہا ہے۔'' پھر ان دونوں کو وین میں بیٹھایا گیا۔ اور وین شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔

گاڑی کے اندر قیوم اور پراسرار لڑکی کے علاوہ دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں رائفل تھامے بیٹھے تھے۔ قیوم کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ معاملہ اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔ وہ گارڈ سے معاہدہ کرنے کے باوجود بھی اپنی گرفتاری کی وجہ کو سمجھنے نہیں پارہا تھا۔

پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وین سڑک کے کنارے رک گئی اور اگلی سیٹ سے دونوں پولیس اہلکار اتر کر پیچھے چلے آئے۔ انہوں نے پچھلا دروازہ کھولا۔ اور قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاموشی کے ساتھ شہر سے مخالف طرف بھاگ جاؤ۔ سونے کی انگوٹھی ہمارے پاس رہے گی۔ اس انگوٹھی کے عوض ہم تھانے دار کو بیان دیں گے کہ تم دونوں گرفتاری سے قبل فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔'' دوسرا پولیس اہلکار بولا۔

''پولیس تم دونوں کو شہر میں تلاش کرے گی۔ اس لئے کوشش کرنا۔ چھوٹے قصبوں یا پھر دیہاتوں کی طرف سفر کرنا۔ یہاں سے قریبی ریلوے اسٹیشن آدھے میل کی مسافت پر ہے۔ تم دونوں کو وہاں سے ٹرین مل جائے گی۔ جتنی دور بھاگ سکتے ہو۔ بھاگنے کی کوشش کرو۔ صبح تم دونوں کی گرفتاری کا حکم جاری کردیا جائے گا۔'' وہ چاروں وین میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔

قیوم اور پراسرار لڑکی انہیں ہکا بکا دور جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ پھر قیوم نے طویل سانس لیتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا۔ رات چاندنی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز کھیتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کھیتوں کے درمیان میں ٹرین کی پٹری واقع تھی۔ اور دور چند روشنیاں چمکتی دکھائی دے رہی

تھیں۔ وہ شانتی نگر کا ریلوے اسٹیشن تھا۔

رات کے پونے نو بجنے والے تھے۔ دور دور تک ھُو کا عالم طاری تھا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ بہتے ہوئے جوہڑ میں سے مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قیوم نے لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ لیکن لڑکی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ چند قدم آگے جانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لڑکی پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قیوم اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم واپس چک پینتیس نہیں جاسکتے۔ صبح پولیس والے ہماری تلاش شروع کردیں گے۔ اگر دوبارہ گرفتاری سے بچنا چاہتی ہے تو تجھے میرے ساتھ فرار ہونا ہی پڑے گا۔''

لڑکی مردانہ آواز میں بولی۔

''میں واپس حویلی جانا چاہتی ہوں۔ میرا شوہر ٹیلہ جوگیاں کا جاگیردار ہے۔ وہ پولیس والوں کو خود ہی سمجھا بجھا لے گا۔''

قیوم جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تو اسے کیا بتائے گی کہ تو رات کو اندھیرا ہوجانے کے بعد ٹی وی دیکھنے کے لئے چک پینتیس جاتی تھی۔ اور تجھے شناختی کارڈ پاس نہ ہونے کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا۔ بعد ازاں مک مکا کرنے کے بعد شانتی نگر اسٹیشن کے قریب چھوڑ دیا گیا۔ کیا تیرا شوہر اس سچائی کو قبول کرنے کے بعد تیرا ساتھ دے گا۔''

لڑکی نے پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

قیوم دوبارہ بولا۔ ''تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو چند دنوں کے لئے حویلی سے دور چلی جا، حالات بہتر ہونے کے بعد میں تجھے واپس ٹیلہ جوگیاں چھوڑ آؤں گا۔'' لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ اور قیوم کے پیچھے چلنے لگی۔ شانتی نگر ریلوے اسٹیشن کی مختصر عمارت بکنگ کلرک اور اسٹیشن ماسٹر کے کمروں پر مشتمل تھی۔ ان دونوں نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد قیوم نے پوچھا۔

''تیرا نام کیا ہے؟''

''سندری.....!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ہندو ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور شوہر کا نام کیا ہے؟''

''جانباز.....!''

''وہ بھی ہندو ہے؟ لڑکی نے دوبارہ انکار میں سر ہلایا۔

''دیکھو سندری مجھے نہیں معلوم آگے حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ تجھے اپنے ہمراہ رکھنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر تیرے ماں باپ، بہن بھائیوں میں سے کوئی قریبی گاؤں میں رہتا ہے تو میں تجھے ان کے پاس چھوڑ کر آسکتا ہوں۔''

سندری نے بتایا۔ ''شوہر کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔ یوں سمجھ کہ اب شوہر کا رشتہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اگر واپس حویلی کی طرف گئی تو وہ مجھے گولیوں سے بھون دے گا۔''

گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی۔ قیوم نے سندری کا ہاتھ تھاما۔ اسے دوبارہ جسم میں کرنٹ کی کیفیت دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سندری نے اعتراض نہیں کیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ ڈبے خالی پڑے تھے۔ وہ دونوں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ رات کا کھانا وہ کھا چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی نے پلیٹ فارم کو چھوڑ دیا۔ قیوم نے کھڑکی کو بند کیا۔ اور ڈبے کے اندر نگاہ دوڑائی۔ اکا دکا مسافر جن میں مردوں کی اکثریت تھی۔ دوسرے ڈبوں میں بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ اس نے کاندھے پر رکھے ہوئے کپڑے کو اتارا اور سامنے والی سیٹ کو صاف کرنے کے بعد سندری کو اس پر لیٹنے کے لئے کہا۔ وہ خاموشی کے ساتھ لیٹ گئی۔

قیوم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس

لئے کھڑکی کے پاس بیٹھنے کے بعد اگلا لائحہ عمل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کے پاس رقم محدود تھی۔ اگر کھینچ تان کر کے گزارا کرنے کی کوشش کرتا۔ تو ہفتہ نکال لیتا۔ رہائش کا مسئلہ علیحدہ تھا۔

پولیس والوں کے کہنے کے مطابق اس نے ٹکٹ دور دراز کے علاقے کا لیا تھا۔ لیکن وہاں اس کی جان پہچان نہیں تھی۔ گاڑی سے اترنے کے بعد رہائش کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ وہ رقم خرچ کر کے کمرہ کرائے پر لے سکتا تھا۔ تاہم ایسی صورت میں پھر کھانے پینے کے لئے رقم بہت کم بچ پاتی۔ اگر اس کے پاس سندری کی انگوٹھی ہوتی۔ تب اسے کسی بات کا غم نہیں ہوتا۔ لیکن انگوٹھی کو پاس رکھنے کے بعد پولیس والوں سے چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سندری کے پاس اس طرح کی اور بھی انگوٹھی موجود ہو۔ اس نے سامنے لیٹی ہوئی سندری کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ وہ خالی تھے۔ تاہم دودھیا رنگت والی صراحی دار گردن میں پتلی زنجیر صاف دکھائی دی۔ ہر چند کہ سونے سے بنی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس پر سونے کا پانی چڑھے ہونے سے کچھ بعید نہیں تھا۔

گاڑی کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے بے زاری کے ساتھ کاندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے چہرے کو ڈھانپا اور سونے کی نیت سے لیٹ گیا۔ کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے کا بہترین عمل اس کی نظر میں سب کچھ فراموش کر کے سو جانا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈبہ اس کے خراٹوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ اس کی آنکھ صبح آٹھ بجے کے قریب کھلی۔

ٹرین مختصر دیہاتی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ سندری سیٹ سے غائب تھی۔ وہ ہڑبڑا کر سیٹ سے نیچے اتر آیا اور اسے ڈبے میں تلاش کرنے لگا۔ لیکن وہ ڈبے میں نہیں تھی۔ ڈبے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ نیچے پلیٹ فارم موجود نہیں تھا۔ اس لئے اسے چھلانگ لگا کر نیچے اترنا پڑا۔ ٹرین کو کراس کی نیت سے اسٹیشن پر روکا گیا تھا۔ اسٹیشن سے آگے سرسبز لامتناہی کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کے درمیان پکی سڑک پر چند گاڑیاں اناج کی بوریوں سے لدی منڈی کی طرف جارہی تھیں۔ اور کھیتوں کے سلسلے کے درمیان سیاہ چادر اور سرخ شلوار قمیض پہنے ہوئے سندری بت بنی کھڑی تھی۔

اسی دوران گونج دار آواز کے ساتھ کراس ہوا۔ اور دوسری ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی ٹرین کے پیچھے سے تیز رفتاری کے ساتھ گزرنے لگی۔

قیوم نے کھیتوں کے درمیان کھڑی ہوئی سندری کی طرف دوڑ لگادی۔ اس کے چہرے کا رخ مخالف طرف تھا۔ اور وہ کھیتوں سے ہٹ کر دور بنے ہوئے چند کچے گھروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ قیوم کو اپنے پیچھے گاڑی کی وسل کی آواز سنائی دی۔ اس نے چلا کر سندری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہایت انہماک کے ساتھ گھروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس لئے اس نے یکسر توجہ نہیں دی۔ اس کے قریب پہنچنے کے بعد قیوم نے اسے کاندھے کے پاس سے تھامتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''گاڑی روانہ ہونے والی ہے۔ جلدی واپس چلو۔''

سندری نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر مردانہ آواز میں بولی۔

''وہ سامنے جانباز کا گھر ہے۔ ہم وہاں پولیس والوں کی نگاہوں سے چھپ کر رہ سکتے ہیں۔'' قیوم نے بے چین نگاہوں سے دور کھڑی ہوئی ٹرین کی طرف دیکھا۔ وہ برابر روانگی کی وسل دے رہی تھی۔ اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''کیا گھر خالی ہے؟ اور کیا تمہارا شوہر تمہیں تلاش کرتا ہوا گھر تک نہیں آئے گا۔''

سندری نے اُسے بتایا۔ ''یہ گھر اس کی عیاشیوں کے لئے پوشیدہ اڈے کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن چند عرصہ قبل اسے ایسی خطرناک بیماری لاحق

ہوئی کہ اسے عیاشیوں کو ترک کرنا پڑا۔ اب یہ گھر کافی عرصے سے خالی پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے متعلق اس کے خاص افراد کے علاوہ کسی کو معصوم نہیں ہے۔''

ٹرین نے باآہستگی پلیٹ فارم کو چھوڑ دیا اور آگے روانہ ہوگئی۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا کہ وہ سندری کی بات کو مان لیتا۔ سندری نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما۔ کرنٹ کی کیفیت نے سر ابھارا۔ اور وہ کچے دھاگے میں بندھا اس کے پیچھے چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

مکانوں کا وہ سلسلہ اکٹھا نہیں تھا۔ بلکہ ایک دوسرے سے ہٹ کر واقع تھا۔ تعداد کم و بیش بیس کے قریب تھی۔ ان سے بھی کچھ ہٹ کر درختوں کے سرسبز جھنڈ کے درمیان سندری کے شوہر کا گھر تھا۔ اس کی چاردیواری پکی اینٹوں پر مشتمل تھی۔

دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ کچے مکانوں میں رہنے والے زیادہ تر افراد کھیتوں کا رخ کرچکے تھے۔ اور عورتیں گھر کے کاموں میں مشغول تھیں۔

سندری نے قیوم کو تالا توڑنے کے لئے کہا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد ایک مضبوط پتھر کا انتخاب کیا۔ پھر تالے پر پل پڑا۔ اسے زیادہ مشقت نہیں کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر میں زنگ آلود تالا ٹوٹ گیا۔ اور وہ دونوں گھر میں داخل ہوگئے۔ ان کے سامنے اینٹوں سے بنا ہوا صحن تھا۔ جس کے کونے میں شہتوت کا درخت لگا ہوا تھا۔ صحن کے آگے برآمدہ تھا۔ اور برآمدے کے پیچھے دو کمرے تھے۔ کمرے مقفل تھے۔

قیوم نے تالوں کو توڑ دیا۔ پہلے کمرے میں دو چارپائیاں جن پر بستر لگے ہوئے تھے۔ چارپائیوں کے پاس موڑھا پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں ٹین سے بنے ہوئے ٹونکوں میں سامان رکھا ہوا تھا۔ رہائش کا مسئلہ حل ہونے کے بعد اب قیوم کی جیب میں موجود رقم سے ہفتے بعد کھینچ تان کر گزارا کیا جاسکتا تھا۔

سندری نے گھر کو صاف کیا۔ اور قیوم کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لئے قریبی دکان کی طرف چلا گیا۔

انہیں وہاں رہتے ہوئے ہفتے بھر سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران جیب میں موجود رقم ختم ہوگئی۔ گنتی کے چند مکانوں کے درمیان ذریعہ معاش کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا۔

قیوم نے سندری کے گلے میں پہنی ہوئی سونے کی زنجیر کو قریبی شہر لے جا کر بیچ دیا۔ زنجیر خالص سونے کی تھی۔ اسے رقم توقع سے زیادہ ملی۔ چند دنوں کی سوچ و بچار اور سندری سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے اونے پونے داموں گھوڑا گاڑی خرید لی۔ گھوڑا مریل اور گاڑی سالخوردہ تھی۔ تاہم روزگار کا ذریعہ ثابت ہونے لگی۔ بیس گھروں پر مشتمل اس گاؤں کا نام جہان آباد تھا۔ وہ چند مختلف دیہاتی قصبوں کے درمیان واقع تھا۔ وہاں سواری کا معقول انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ٹانگے کا کام چلنے لگا۔ وہ صبح منہ اندھیرے ٹانگہ لے کر قریبی سڑک کی طرف جاتا۔ اور سرِشام جب واپس آتا۔ تب اس کی جیب میں چالیس پچاس روپے ضرور ہوتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب اتنی رقم دن بھر کے خرچے کے لئے کافی خیال کی جاتی تھی۔

ایک شام قیوم کی طبیعت ناساز ہوئی۔ سر میں ہلکا درد تھا۔ کچھ حرارت بھی محسوس ہورہی تھی۔ اس لئے شام ہونے کے بعد اس نے گھوڑا گاڑی کا رخ گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ گھر کا دروازہ خلاف معمول چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے گھوڑے کو گاڑی سے علیحدہ کرکے مکان کے سامنے لگے ہوئے گھنے درخت کے نیچے باندھا۔ اور گھر کے اندر آ گیا۔ سندری وہاں نہیں تھی۔ گھر خالی پڑا تھا۔ اس نے اردگرد کے ہمسائیوں سے جب اس کے متعلق دریافت کیا۔ تو ایک نے بتایا کہ وہ ٹی وی دیکھنے کے لئے شیخوں کی حویلی کی طرف گئی ہے۔ قیوم غصے میں آگ بگولا ہوکر واپس گھر کے اندر آ گیا۔ اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی نو

بجے کے بعد ہوئی۔ چہرے پر خجلت بھرے تاثرات تھے۔ اور کچھ گھبرائی گھبرائی سی دکھائی دے رہی تھی۔ قیوم کے وجہ دریافت کرنے سے قبل ہی وہ مردانہ آواز میں بولی۔

''تمام دن گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی تھی۔ اس لئے ٹی وی دیکھنے شیخوں کی حویلی میں چلی گئی۔''

قیوم کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے۔ اور وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''تیری ٹی وی دیکھنے کی عادت تیرے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے گی۔ یہ یاد رکھ ہم دونوں کو پولیس والے گاؤں گاؤں تلاش کررہے ہیں۔ اگر شیخوں کے لڑکوں میں سے کسی نے مخبری کردی تو ہمیں حوالات کی ہوا کھانی پڑے گی۔''

سندری بولی۔ ''تو پھر تو مجھے ٹی وی خرید کر لادے۔ میں گھر سے باہر نکلنا ترک کردوں گی۔ مجھے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کپڑے لتے سے میں بے زار ہوں۔'' اس کی سادگی کو محسوس کرکے قیوم بے اختیار مسکرا دیا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔

''کپڑے اور جوتیاں لانا میرے اختیار میں ہے۔ لیکن ٹی وی خرید کر لانا ناممکن ہے۔ اگر تو زیادہ اصرار کرے گی تو ٹانگہ بیچ کر قسطوں پر لے آتا ہوں۔ لیکن پھر کھانے پینے کے لالے پڑجائیں گے۔''

سندری خاموش ہوگئی۔ تاہم اس نے شیخوں کی حویلی جانا ترک نہیں کیا۔

اتنا ضرور ہوا کہ وہ قیوم کے آنے سے پہلے واپس آجایا کرتی تھی۔ اس نے زیادہ زور زبردستی کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔

ایک مہینے سے کچھ زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ گاؤں والے سندری کو قیوم کی بیوی خیال کرنے لگے تھے۔ ان دونوں نے بھی بات کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن قیوم کو اب سندری کی عادت پڑنے لگی تھی۔ اس لئے ایک رات کھانا کھانے کے بعد اس نے سندری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''گاؤں والے ہمارے رشتے کے متعلق جاننے کے لئے بے چین ہیں۔ تیرا ٹیلہ جوگیاں جانا تو اب ممکن نہیں رہا۔ اگر برا نہ مانے تو ہم دونوں کو اب شادی کرلینی چاہئے۔''

سندری نے ہڑبڑا کر قیوم کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔

''تو کیسی بات کرتا ہے۔ میں ٹیلہ جوگیاں کے جاگیردار کی بیوی ہوں۔ اس کے ہوتے ہوئے تیرے ساتھ بھلا کیسے شادی کرسکتی ہوں۔ پھر آج نہیں تو کل مجھے واپس جانا ہی ہے۔ تب تک ہم دونوں جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں۔''

قیوم قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''واپسی کے خیال کو اپنے دل سے باہر نکال دے۔ وہ تجھے اب قبول نہیں کرے گا۔ تو حویلی سے باہر رات گزار چکی ہے۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ تجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بھون دے گا۔ پھر تو ہندو ہے اور وہ مسلمان تم دونوں کی شادی جائز نہیں ہے۔ میری بات مان اور میرے ساتھ شادی کرلے۔ ہم دونوں کے حق میں یہ بہتر ہوگا۔'' سندری کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ تاہم اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور منہ پھیر کر سونے کے لئے لیٹ گئی۔

رات گزر گئی۔ صبح منہ اندھیرے قیوم ٹانگہ لے کر مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ اور رات کو جب تھکے ہارے اس نے مکان کا رخ کیا۔ تب ایک دفعہ پھر اس نے دروازے کو چوپٹ کھلا ہوئے پایا۔ سندری گھر میں نہیں تھی۔ رات کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ وہ عموماً نو بجے سے قبل گھر آجایا کرتی تھی۔ اس نے برآمدے کے کنارے پر بنے ہوئے چولہے کا رخ کیا۔ ہانڈی میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ چولہے کی راکھ سرد پڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل ثابت نہیں ہوا کہ صبح ناشتہ بنانے کے بعد اسے دوبارہ جلایا نہیں گیا تھا۔

قیوم نے دل میں تہیہ کیا کہ آج رات وہ

سندری سے تفصیلی بات چیت ضرور کرے گا۔ وہ کھانا کھائے بغیر چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات گزر گئی۔ اور سندری واپس نہیں آئی۔

صبح کے قریب قیوم نے شیخوں کی حویلی کا رخ کیا۔ اور دروازے پر کھڑے دربان سے التجا کی کہ وہ شیخ سے ملنا چاہتا ہے۔ دربان نے اسے دھتکارنے کے بجائے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ حویلی کے پھاٹک کے ساتھ مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ دربان نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد شیخوں کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سندری بھی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر قیوم کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ شیخوں کے لڑکے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر اس کے مقابل رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تیس سے پینتیس کے درمیان تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سفاکیت جھلکتی تھی۔ باریک مونچھوں کو تاؤ دے کر اوپر کیا گیا تھا۔ وہ سفید کرتا اور پرجامہ پہنے ہوئے تھا۔ سندری کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات تھے۔ جیسے شیخوں کی حویلی میں اپنے اپ کو محفوظ محسوس کررہی ہو۔

شیخوں کا لڑکا بولا۔ ”میں تیرا ہی منتظر تھا۔ تو یقیناً سندری کو لینے کے لئے آیا ہے۔ اس بات کو اب بھول جا۔ کہ یہ تیرے ساتھ اب واپس جائے گی۔ لیکن میں تیری حق تلفی بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے تجھے سندری کو یہاں چھوڑنے کا منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔“ اس نے جیب میں سے رقم کی گڈی باہر نکالی۔ اور اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ رقم قیوم کی توقع سے بہت زیادہ تھا۔ اس نے عجلت کے عالم میں انہیں جیب میں منتقل کیا۔ پھر بولا۔

”مجھے اس کو یہاں چھوڑ جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ٹیلہ جوگیاں کے جاگیردار کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی کہ اس کی بیوی کو چند ہزار روپے کے عوض شیخوں کے لڑکے نے خرید کر اپنی حویلی میں قید کرلیا ہے۔ میں اور سندری جس مکان میں رہ رہے ہیں وہ سندری کے شوہر کا ہے۔ اس لئے اسے پتہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی کہ وہ جہان آباد میں رہائش پذیر تھی۔ اور اب شیخوں کی حویلی میں قید ہے۔“

لڑکے نے گن کر مزید رقم اس کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔

”تجھے رقم دینے کا مقصد یہ ہے کہ تو جلد از جلد گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا کہ سندری کے متعلق اس کے شوہر کو کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے۔ اور اگر تو نے اسے بتانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا تیرے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

قیوم نے رقم جیب میں ڈالی۔ اور لڑکے کو مطمئن کرنے کے بعد سرشاری کے عالم میں گھر چلا آیا۔ سامان سمیٹتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی داڑھی کافی بڑھ چکی ہے۔ اگر وہ سر پر پگڑی باندھ کے مہنگی دھوتی اور کرتا پہننے کے بعد چک پینتیس کا رخ کرتا تو کوئی بھی اسے پہچان نہیں پاتا۔ وہ شیخوں کے لڑکے سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن چک جوگیاں کا جاگیردار اسے ضرور سبق دے سکتا تھا۔ ایک دفعہ سندری ٹیلہ جوگیاں واپس آجاتی۔ تو وہ تین چار ہزار جیسی خطیر رقم خرچ کرکے ٹیلہ جوگیاں کے قریب دوسرا ہوٹل کھول سکتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ سندری کھانا پینا ترک کرسکتی تھی۔ لیکن ٹی وی دیکھنا چھوڑنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

سامان سمیٹنے کے بعد اس نے دوسرے دن تانگہ فروخت کردیا۔ اور تمام رقم کو احتیاط کے ساتھ محفوظ کرنے کے بعد ٹرین پکڑ کر چک پینتیس چلا آیا۔ اس کے گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ دیوار پھلانگ کر اندر آگیا۔ اس نے اپنا مختصر سامان کمرے میں رکھا کیا۔ پھر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے اندھیرے میں اس نے ٹیلہ جوگیاں

کے جاگیردار کی حویلی کا رخ کیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے دربان نے تفصیلی نگاہوں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ پھر جاگیردار سے ملاقات کروانے سے صاف انکار کردیا۔

قیوم نے اسے بتایا کہ معاملہ نہایت گھمبیر ہے۔ اور وہ جاگیردار کو سندری کے متعلق بہت کچھ بتانا چاہتا ہے۔ اس دفعہ دربان کے چہرے پر نرمی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اور وہ اسے وہیں کھڑے رہنے کے لئے کہنے کے بعد حویلی کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد قیوم مہمان خانے میں بیٹھا جاگیردار کا انتظار کررہا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس سے پچپن کے درمیان تھی۔ چہرہ کرخت اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں ہکا پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد نخوت بھری نگاہوں سے قیوم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو سندری کے متعلق کیا بتانا چاہتا ہے۔ ذرا سوچ کر بات کرنا۔ اور اس بات کو دماغ میں رکھنا کہ حویلی کی عزت پر حرف آنے سے پہلے میں گولی چلا دینے کو بہتر خیال کرتا ہوں۔“

قیوم نے منہ میں آئے ہوئے تھوک کو حلق میں منتقل کیا۔ پھر شروع سے آخر تک تمام واقعات سے اسے آگاہ کردیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس کے بیان کردہ واقعات سنتا رہا۔ اور وقتاً فوقتاً حقے کی نال منہ میں ڈال کر اسے گڑگڑاتا رہا۔ قیوم کے خاموش ہوجانے کے بعد بولا۔

”تو تیرے کہنے کے مطابق سندری اس وقت جہان آباد کے شیخوں کی حویلی میں ہے۔“ قیوم نے اثبات میں سر ہلایا۔ جاگیردار خاموش ہوگیا۔ قیوم اس کے جواب کا منتظر تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ اس نے حقے کی نال کو بھی سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھ دیا تھا۔ اس کا رویہ قیوم کی توقع کے برخلاف تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اسے غصے میں آگ بگولا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ تو نہایت تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ چند لمحات یونہی گزر گئے۔ پھر وہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

قیوم سوچنے لگا۔ اب شاید وہ اپنی بندوق اور آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگا۔ پھر جیپ میں بیٹھ کر شیخوں کی حویلی کی طرف روانہ ہوجائے گا۔ اگر جاگیردار سے اسے کچھ رقم حاصل ہوجائے تو اس کے وارے نیارے ہوسکتے تھے۔ گراں قدر معلومات کا معاوضہ کم از کم چار ہزار تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ جاگیردار کی واپسی دس منٹ کے بعد ہوئی۔ اس کے ہمراہ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے ایک کمرے میں داخل ہونے کے بعد لڑکی کو چادر ہٹانے کے لئے کہا۔ لڑکی نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چادر کو چہرہ سے ہٹادیا۔

قیوم کی حویلی کی چھت اور دیواریں ہوا میں اڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ سندری تھی۔ اس کی زبان گنگ ہوکر رہ گئی۔ سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ جاگیردار بولا۔

”یہ میری سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیوی ہے۔ تو نے جو بہتان اس پر لگایا ہے۔ اس میں چند باتیں ایسی ہیں۔ جن کی وجہ سے میں تجھے کچھ بھی کہے بغیر حویلی سے باہر جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ بصورت دیگر تیرا یہاں سے زندہ واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ پہلی بات اسے واقعی ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق ہے اور حویلی میں ٹی وی موجود نہیں ہے۔ یہ یقیناً ٹی وی دیکھنے باہر جاتی رہی ہے۔ دوسری بات اس کی آواز مردانہ ہے۔ اور اس کے متعلق میرے اور سندری کے علاوہ حویلی کے نوکروں کو بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تیسری بات میں نے اسے شادی کے موقع پر سونے کی انگوٹھی اور چین منہ دکھائی کے طور پر دی تھی۔ وہ اب اس کے پاس نہیں ہے۔ چوتھی اور آخری بات جہان آباد کے خفیہ اڈے کے متعلق میرے اور

چند مخصوص نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر تو سندری کے ساتھ وہاں رہ چکا ہے تو تیرے بیان کردہ واقعات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔ میں اس کے متعلق تحقیقات کرواؤں گا۔ رہی پولیس کی بات تو تو بے فکر ہو جا۔ وہ اب تجھے تنگ نہیں کریگی۔

لیکن تجھے مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ تو معاملے کی تفصیل سے کسی کو آگاہ نہیں کرے گا۔

قیوم نے قسم کھا کر اسے اطمینان دلایا کہ بات ان دونوں کے درمیان میں رہے گی۔ جاگیردار نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ رقم باہر نکالی اور اسے دینے کے بعد حویلی سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

قیوم اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کہ پولیس سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ اس نے جاگیردار سے حاصل کردہ رقم کو بھی شلوار کے نیفے میں منتقل کیا اور مطمئن قدموں کے ساتھ چلتا ہوا چک پینتیس چلا آیا۔

جوگی ہوٹل دوبارہ کھل گیا۔ اس دفعہ اس نے ہوٹل ریلوے کی زمین سے ہٹ کر بنایا تھا۔ یہاں عورتوں کے بیٹھنے کے لئے علیحدہ انتظام تھا۔ پروجیکٹر کی خریداری اس نے وقتی طور پر ملتوی کردی تھی۔ اسے خریدنے کے لئے قریبی شہر جانا ضروری تھا۔ اور وہ پولیس والوں کے خوف سے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔

بہرکیف چند ہی دنوں میں کام اچھا چلنے لگا۔ ہر چند کہ عورتوں کی تعداد اب بھی مردوں کی نسبت کم تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے چائے کے علاوہ اور بھی لوازمات رکھنے شروع کردیئے۔ کام سنبھالنے کے لئے اسے دو نوکروں کا بھی انتظام کرنا پڑا۔ جنہیں وہ ہفتہ وار اجرت دیتا تھا۔

انہی دنوں ٹیلہ جوگیاں سے ایک کم سن لڑکی نے جوگی ہوٹل کا رخ کرنا شروع کردیا۔ ہر چند کے اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے قیوم کو کیوں اس کی حرکات مشکوک دکھائی دیں۔ عورتوں کی اکثریت اس بات کی خواہاں ہوتی تھی کہ انہیں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا موقع میسر آ سکے۔ تاکہ ڈرامہ کسی رکاوٹ کے بغیر اطمینان و سکون کے ساتھ دیکھ سکیں۔

لیکن لڑکی ہمیشہ پچھلے بنچوں کا انتخاب کرتی تھی۔ اس کے باوجود کہ عورتوں والے حصے کو اندھیرے میں ڈوبا رکھا جاتا تھا۔ تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ وہ شدید گرمی کے باوجود بھی اپنے چہرے کو سیاہ چادر میں پوشیدہ رکھتی تھی۔ تاہم اس کی مخروطی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ اور وہ بے اختیار کھنچا ہوا پچھلے بنچوں کی طرف چلا آیا اور لڑکی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تو شیخوں کی حویلی سے واپس کیسے آئی۔"

لڑکی مردانہ آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"تجھے اس سے سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ دو ہزار کی رقم تیرے لئے کافی ہے۔ اگر معاملے کے متعلق زیادہ کریدنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں تیرے ہوٹل کو دوبارہ بھی بند کرواسکتی ہوں۔"

قیوم نے پوچھا۔ "جاگیردار کی حویلی میں تیری ہمشکل لڑکی کون تھی۔ جسے جاگیردار اپنی بیوی سمجھ رہا تھا۔"

سندری نے بے اختیار ہنستے ہوئے اُسے بتایا۔ "وہ میری ہمزاد ہے۔

میری غیر موجودگی میں حویلی کے معاملات کو بہ خوبی سنبھالتی ہے۔ اس وقت بھی وہ جاگیردار کے ساتھ حویلی میں موجود ہے۔ اور ہر رات آٹھ سے نو بجے کے دوران حویلی میں ہوگی۔ تاکہ میں ٹی وی دیکھنے تیرے ہوٹل میں آسکوں۔"

قیوم خاموشی کے ساتھ ابلتی ہوئی چائے کی دیگچی کی طرف آ گیا۔ اس سے زیادہ اسے جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔

انوکھی رات

صائمہ شاہد-ٹوبہ ٹیک سنگھ

کمرے کا منظر دل دھلاتا اور دماغ پر سکتہ طاری کرتا تھا، لڑکی کی ماں کی چیخیں حواس باختہ کررہی تھیں کیونکہ سامنے سرکٹی لاش پڑی تھی جسے دیکھ کر دل و دماغ کو قابو رکھنا محال تھا۔

دل و دماغ کو دہلا دینے والا اندھیرا ہر سو مسلط تھا، اسی گھٹا ٹوپ اندھیرے کی خوفناک کہانی

آج ہیلووین کی رات تھی۔ انہیں جلدی تھی۔ انہوں نے جانا تھا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر "ہیلووین" منانا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر انہیں "ہیلووین" کہنا تھا۔ آج تو ممی کی جانب سے بھی انہیں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وہ بہت بے چین تھے۔ سردی بھی آج زوروں پر تھی۔ ہر چیز منجمد ہوئی جارہی تھی۔ برف باری بھی ہورہی تھی۔ ممی کی جانب سے انہیں لباس میں احتیاط کرنے کی ہدایت تھی۔ لیکن وہ اس قدر پرجوش تھے کہ انہوں نے ان سنی کردی۔

سب نے کچھ دن پہلے ہی آج کی رات کے لئے تیاریاں شروع کردیں۔ جولی اور میگی نے اپنی فرینڈز کو بھی بلا رکھا تھا۔ سب مل کر ایک ساتھ نکلتیں۔ اپنے اپنے ماسک اور کاسٹیومز کے ساتھ۔ انہیں جلدی تھی اپنی دوستوں کو اپنے ماسک اور کاسٹیومز دکھانے

کی..... اور دوستوں کے کاسٹیومز خود دیکھنے کی..... اب دیکھنا یہ تھا کہ کس کا کاسٹیوم سب سے زیادہ ایکسائیڈ تھا۔

ڈور بیل ہوئی تو میگی دروازے پر دیکھنے بھاگی وہ اپنا کاسٹیوم پہن کر اور ماسک لگا کر تیار ہو چکی تھی۔ جبکہ جولی ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ میگی کو پختہ یقین تھا کہ اس کی تیاری عین وقت تک نامکمل ہی رہے گی۔ کیونکہ وہ کبھی بھی وقت پر تیار نہ ہوئی تھی تو آج کیسے ہوجاتی؟

دروازہ کھولنے پر اس کی چیخ نکل گئی کیونکہ سامنے انتہائی خوفناک شکل والا آدمی کھڑا تھا جس کی آنکھیں اُبلی پڑی تھیں اور منہ خون آلود تھا۔ ہونٹ کٹے ہوئے تھے۔

"کیوں.....؟ کیسے لگا.....؟ خوب ڈر گئی تم تو....." آواز میگی کی دوست شیلا کی تھی۔

"اوہ..... تو یہ تم تھیں..... میں تو بیچ میں ڈر گئی تھی..... آؤ نا.....!" میگی نے اسے راستہ دیا۔

"کیسا لگا میرا کاسٹیوم.....؟" شیلا نے پوچھا۔

"میری چیخ اس بات کا ثبوت تھی کہ تم دوسروں کو ڈرانے میں کامیاب رہوں گی۔"

"کاسٹیوم تو تمہارا بھی خوب ہے..... لیکن کلاسیکل سا ہے۔ ڈفرنٹ نہیں ہے۔ اک بوڑھی چڑیل کا روپ تو اکثر لڑکیاں دھار لیتی ہیں۔" شیلا نے کہا تو میگی کا منہ لٹک گیا لیکن ماسک میں ہونے کی وجہ سے شیلا اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ میگی کو اپنی ساری محنت اکارت ہوتی محسوس ہوئی۔

"ہر کوئی کچھ نیا کرنے کے چکروں میں ہے تو میں نے سوچا میں سب سے الٹ چلوں گی تو کیوں نا پیٹیکل سا کاسٹیوم پہنوں ویسے بھی مجھے کلاسیکل چیزیں پسند ہیں۔" میگی نے شرمندگی مٹانے کو وضاحت دی۔

میگی ہمیشہ شیلا سے خود کو کمتر محسوس کرتی آئی تھی۔ اس بار تو اس نے اتنے دنوں پہلے ہی تیاری شروع کردی تھی تاکہ شیلا کو متاثر کرسکے مگر ہمیشہ کی طرح اسے متاثر کرنے کے بجائے خود ہی اس سے متاثر ہوگئی تھی۔

"باقی سب آگئے ہیں کیا؟"

"نہیں ابھی..... ہمیشہ کی طرح تم ہی عین وقت پر آئی ہو۔" میگی کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ ڈور بیل پھر سے بج اُٹھی۔ میگی سست قدموں سے دروازہ کھولنے چل دی۔ اس کی ساری ایکسائٹمنٹ جھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھی۔ اُسے شیلا پر غصہ آرہا تھا۔ جس نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔

باقی کی دو سہیلیں بھی ایک ایک کرکے آگئی تھیں، ہر کسی نے شیلا کے کاسٹیوم کی تعریف کی جبکہ میگی کو کسی نے بھی نہیں سراہا۔ میگی دل برداشتہ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"خدا کرے یہ چڑیل مرجائے۔" میگی نے دکھی دل سے اسے بددعا دی۔ جولی بھی شیلا کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ آج کی رات وہ یہی کرنے والی تھی، جانتے ہوئے بھی کہ "ہیلووین" کی رات ہے۔ وہ بے دھیانی میں دوسروں کو دیکھ کر ڈرنے والی تھیں اور پھر بے تحاشا ہنسنے والی تھیں۔ بہت مزہ آنے والا تھا۔ لیکن میگی کے سوا۔ وہ سب گھر سے نکل کر کھڑی ہوئیں۔ کوئی منزل نہیں تھی نہ کوئی ٹھکانہ مگر انہیں پھر بھی چلتے رہنا تھا۔ یوں ہی شور مچاتے، ہنستے، گاتے..... اٹکھیلیاں کرتے ناز نخرے دکھاتے، انہیں کوئی پرواہ نہ تھی کون ان کے بارے میں کیا کہتا ہے کیا سوچتا ہے؟

یوں ہی دروازے بجاتے..... کوئی انہیں کھانے کو کچھ دیتا اور کوئی نظر انداز کردیتا تو کوئی سڑیل مزاج میڈم انہیں ڈانٹ کر بھگا دیتی..... یہی سب کرتے رات کا بیشتر حصہ بیت چکا تھا۔ اب واپسی کی فکر ہوئی۔ سب واپسی کیلئے چل دیں وہ کافی دور نکل گئی تھیں۔ ہنسی کا اک طوفان تھا جو ان کے منہ سے ابلا پڑ رہا تھا۔ سب نے بہت انجوائے کیا تھا۔ اب تو میگی بھی وہ بدمزگی بھول چکی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس نے شیلا کو کس قدر بددعائیں دی تھیں دل ہی دل میں۔

وہ سب ایک تنگ گلی میں داخل ہوگئیں۔ ان

میں سے کوئی بھی اس گلی کو نہیں جانتی تھی۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا تو چلتے چلتے ٹھٹک گئیں۔

ذرا رکو تو جولی بولی۔ "یہ جگہ کچھ عجیب سی لگ رہی ہے..... کیا تم میں سے کوئی اس راستے کو جانتا ہے؟" اس نے سب سے سوال کیا۔

"نہیں تو....." ہر کسی کا یہی جواب تھا۔

"تو پھر ہمیں اس راستے سے نہیں گزرنا چاہئے کیا خبر یہ کہاں جا کر نکلتا ہو یا ہوسکتا ہے آگے چل کر بند ہی ہوجاتا ہو....." میگی نے کہا۔

"اوہ کم آن..... کبھی کوئی راستہ بھی اختتام پذیر ہوا ہے؟ ہر راستہ کہیں نا کہیں جا کر کھلتا ہے۔ یہ بھی ہمیں مین روڈ تک لے جائے گا۔" شیلا نے کہا۔

"جب ہمیں پتہ ہی نہیں اس راستے کے بارے میں تو ہمیں واپس ہولینا چاہئے۔

لنڈا نے کہا۔ مگر شیلا بہ ضد رہی۔

"کچھ نہیں ہوتا جہاں تک میرا خیال ہے یہ راستہ ہمیں مختصر پڑے گا اور ہم اپنے علاقے کے قریب جا نکلیں گے۔"

"نہیں بھئی..... رات کے اس پہر جبکہ راستے بھی ویران پڑے ہیں آس پاس کوئی بھی نہیں ہے اوپر سے ہم لڑکیاں ہیں۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔" جولی بولی۔

"ہم بھی نہیں جائیں گے اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو خود چلی جاؤ۔" باقی سب نے بھی کہا۔

"تم لوگ تو ساری کی ساری ہی بزدل ہو..... میں تو اسی راستے سے جاؤں گی اور دیکھ لینا تم سے پہلے پہنچوں گی اور پھر میرا کاسٹیوم اس قدر خوفناک ہے کہ اگر کسی نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تو میں الٹا اسے ڈرا دوں گی۔" شیلا نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی ہم تو جارہی ہیں۔" سب واپس چل دیں انہیں اب دوسرے راستے سے جانا تھا۔ شیلا کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ چلتی چلی گئی۔ یہ گلی آگے چل کر اس سے بھی تنگ گلی کی جانب مڑ گئی۔ کچھ آگے چل کر وہ گلی مزید تنگ گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی اس قدر تنگ تھی کہ یہاں سے صرف ایک ہی آدمی ایک ہی وقت میں گزر سکے۔

شیلا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ آس پاس کی عمارتیں بھی قدیم تھیں اور گلی میں کھلنے والی کھڑکیوں سے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر کھڑکی کے پیچھے سے آنکھیں اُسے دیکھ رہی ہوں۔ اب تو اسے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ مگر وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت اپنی دوستوں سے پہلے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ اپنے اندر کے خوف پہ قابو پاکے چلتی رہی۔ کچھ ہی آگے گئی تھی کہ اسے راستہ بند ہوتا محسوس ہوا۔

"اوہ شٹ..... کاش میں ان سب کی بات مان لیتی تو اس مصیبت میں تو نہ پھنستی....." وہ خود سے بولی۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس گلی کے آخری سرے پر کوئی کھڑا ہو..... اس کے دل میں اس شخص کو ڈرانے کی خواہش مچل اٹھی..... وہ دبے قدموں اُس کی جانب بڑھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ بالکل ساکن کھڑا تھا۔

شیلا بالکل اس کے قریب چلی گئی۔ "ہاؤ....." شیلا نے اسے ڈرایا۔

مگر اس ساکن وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

شیلا مزید اس کے قریب گئی اور ڈراؤنی آوازیں نکالیں۔ مگر بے سود۔ اب تو وہ جھنجھلا گئی۔ وہ اس کے بہت ہی نزدیک چلی گئی۔ اس نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو اس ساکن وجود میں حرکت پیدا ہوئی وہ پلٹا۔ اسے دیکھ کر شیلا کو بالکل ڈر نہیں لگا۔ حالانکہ اس نے بھی خوفناک کاسٹیوم پہن رکھا تھا۔ لیکن اس کا ہیٹ بہت بڑا تھا۔ جس نے اس کی گردن اور چہرہ مکمل چھپا رکھا تھا۔ آج رات انہوں نے یہی کیا تھا۔ اک دوسرے کے روپ دیکھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ، وہ ذہنی طور پر کسی خوفناک شکل والے ماسک کے لئے تیار تھی۔

"ہیلو مسٹر.....! تم جو کوئی بھی ہو مجھے ڈرانے میں بالکل کامیاب نہیں ہوئے۔" شیلا نے چٹکی بجا کر کہا۔ اتنے میں ہوا کا جھونکا آیا تو اس آدمی کا ہیٹ اڑ کر دور جا گرا..... اسے دیکھ کر اب تو واقعی شیلا کی چیخ نکل گئی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت خوفناک چہرے والا ماسک پہنے ہوئے تھا۔ بلکہ وہ کوئی بھی ماسک پہنے ہوئے نہیں تھا۔ پھر بھی شیلا ڈر گئی تھی کیونکہ اس شخص کی گردن پر چہرہ تھا ہی نہیں۔ وہ ایک سر کٹا آدمی تھا۔ شیلا کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ جلدی سے پلٹ کر بھاگی۔ اسے کسی انہونی کا احساس شدت سے ستا رہا تھا۔

اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ شخص سچ میں سر کٹا ہے۔ اس نے کوئی بھی ماسک نہیں پہن رکھا۔ وہ ہانپتی کانپتی اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ وہ کئی موڑ مڑی لیکن وہ ٹھیک راستے پہ نہیں جا رہی تھی۔ یہ عجیب سی تنگ گلیاں تھیں۔ وہ راستہ کھو چکی تھی۔ جس راستے سے وہ آئی وہ جانے کہاں گم گیا تھا؟ کچھ ہی دور گئی تھی کہ اسے وہی سر کٹا آدمی اپنے سامنے کھڑا نظر آیا۔ گلی اس قدر تنگ تھی کہ اس سر کٹے کی موجودگی میں گزرنے کی جگہ بھی باقی نہ تھی۔ شیلا نے خوف سے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں سے کوئی راستہ مل جائے بھاگ جانے کا مگر بے سود.....

وہ سر کٹا اس کی جانب بڑھا وہ الٹے قدموں پیچھے ہوئی..... اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ گلی میں کھلنے والا اک گھر کا دروازہ زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ مگر..... کوئی جواب نہ آنا۔ وہ جلدی سے پیچھے بھاگی کافی دور جانے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا وہ سر کٹا غائب تھا۔ اس نے جلدی سے ایک دوسرے گھر کا دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ بجاتی رہی یہاں تک کہ دروازہ کھلا تو اسے کچھ تسلی ہوئی وہ خوف زدہ انداز میں پیچھے دیکھتے ہوئے دروازے میں داخل ہوگئی۔ اس کا داخل ہونا تھا کہ دروازہ زور سے بند ہوا۔ اس نے خوف سے تھرتھراتے ہوئے بند دروازے کو مڑ کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھا تو وہی سر کٹا لمبے اوورکوٹ میں اس کے سامنے تھا۔ وہ پیچھے مڑی اور چیختے ہوئے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس میں اس سر کٹے کو دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

دفعتاً اسے اپنے کندھوں پہ کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اسکا سانس اٹک گیا۔ اس میں پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ دروازہ بھی کھلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اسے وہ ہاتھ اپنی گردن کی جانب بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پلٹی اس آس پر شاید بھاگنے کا کوئی راستہ مل جائے لیکن وہ عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے شیلا کو گردن سے پکڑ کر ہوا میں اُٹھالیا۔ شیلا کی دلدوز چیخ درو دیوار دہلا رہی تھی۔ مگر کوئی اس کی سننے والا نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

انہیں فکر تھی کہ شیلا کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔

"ہمیں اسے اس طرح اکیلا چھوڑ کے نہیں آنا چاہئے تھا۔" لنڈا نے کہا۔

"فکر مت کرو، وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔" جولی بولی۔ وہ اپنے گھروں کو جانے سے پہلے شیلا کے گھر چلی آئیں یہ دیکھنے کہ وہ صحیح سلامت پہنچ گئی ہے لیکن وہاں کچھ اور ہی منظر تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ شیلا کی ممی کی چیخیں انہیں حواس باختہ کر گئیں۔ اندر ایک سر کٹی لاش پڑی تھی اور شیلا کی ممی دیوانوں کی مانند چیخ رہی تھیں۔ وہ بلاشبہ شیلا کی لاش تھی۔ ان کی بھی چیخیں نکل گئیں۔

"آنٹی یہ سب کیسے ہوا.....؟"

"پتہ نہیں مجھے....." وہ روتے ہوئے بولیں۔

"دروازے پہ بیل ہوئی تو میں نے دروازہ کھولا تو شیلا دھڑام سے اندر آن گری اس کے وجود پہ سر نہیں تھا۔ مگر یہ شیلا ہی ہے۔ یہ اسی کا کاسٹیوم ہے..... اور....." آگے ان سے بولا ہی نہیں گیا وہ ایک بار بے تحاشا رو رہی تھیں۔ وہ سب بھی رونے لگیں۔

میگی کو افسوس ہوا کہ اس نے شیلا کو بد دعائیں دی تھیں۔ اسے لگا اس کی بد دعا ہی شیلا کو لگ گئی ہے۔ اسے لگتا تھا جس دن شیلا مرے گی سب سے زیادہ خوشی اسے ہی ہوگی۔ مگر نہیں یہ اس کی بھول تھی۔ سب سے زیادہ دکھ تو اسے ہوا تھا۔

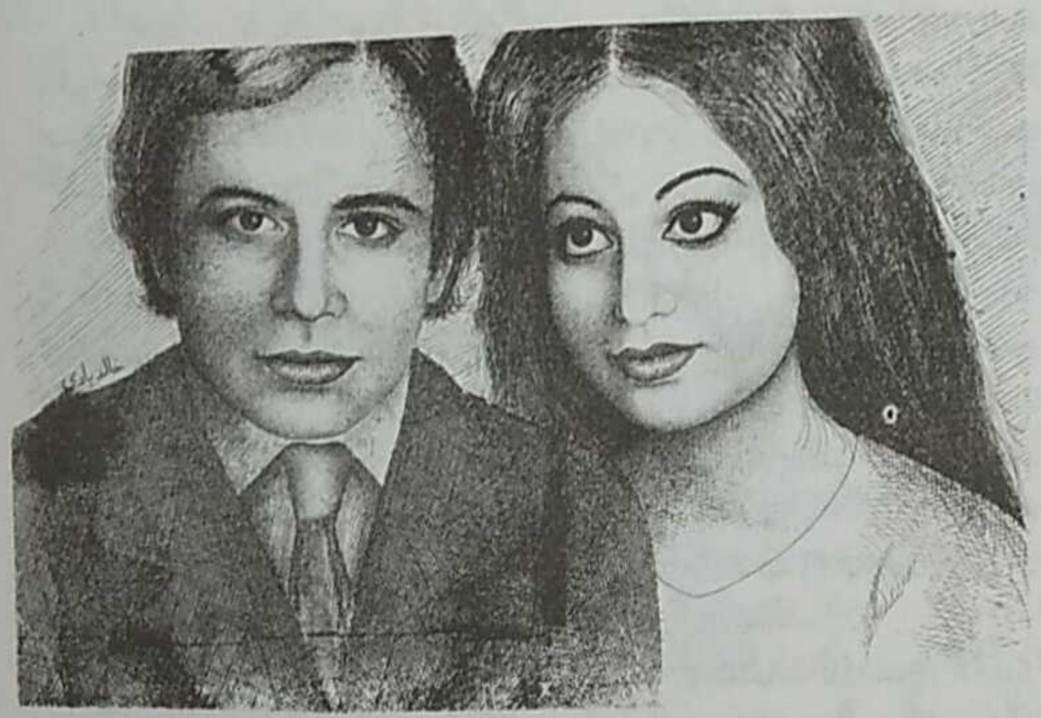

پیاسی آتما

ملک فہیم ارشاد- ڈجکوٹ فیصل آباد

اچانک نوجوان کے جسم میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور پھر تیز روشنی پورے ہال میں پھیلنے لگی وہ روشنی اتنی تیز تھی کہ وہاں پر موجود لوگوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں اور پھر.....

انتقام کی آگ میں..... جلتی ہوئی ایک روح کی..... عجیب وغریب خوفناک روداد

"**انجلی** چنتا کیوں کرتی ہو۔ وہ تو صرف ایک سپنا تھا۔" ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے کنال نے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔ "نن..... نہیں کنال تھا تو وہ سپنا ہی..... پپ..... پر نتو اس سپنے کا خوف ابھی تک میرے ذہن پر چھایا ہوا ہے کئی دنوں سے وہی سپنا بار بار میری راتوں کی نیند اڑا رہا ہے۔" انجلی ہکلاتے ہوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ کنال نے انجلی کے لہجے میں ڈر کا عنصر بھی صاف محسوس کیا تھا۔ انجلی میری جان سپنے سپنے ہوتے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی ناطہ نہیں ہوتا۔ کنال نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور انجلی کے قریب آ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

انجلی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کیا کروں کنال اب تو وہ سپنا جاگتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ انجلی بے بسی کے عالم میں بولی۔

کک..... کیں وہ سپنا حقیقت نہ ہوجائے۔ انجلی کی آواز بھرا گئی۔

"ارے..... ارے میری جان تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو..... کنال نے انجلی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ تم خواہ مخواہ خود کو خوفزدہ کر رہی ہو۔ سپنوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" کنال بولا۔

آپ اور کیلاش دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ میں لوگوں کو مدد کے لئے پکارتی ہوں پر نتو کوئی نہیں آتا۔ پھر میں آپ دونوں کو بچانے کے لئے آگے بڑھتی ہوں تو میں بھی دلدل کی لپیٹ میں آجاتی ہوں۔ ہم تینوں "ہیلپ ہیلپ" پکارتے ہیں پر نتو کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آتا اور دلدل ہمیں نگل لیتی ہے۔ اتنا کہہ کر انجلی نے رونا شروع کر دیا۔

"انجلی میری جان کیا ہو گیا ہے تمہیں..... تم تو بالکل بچوں کی طرح باتیں کر رہی ہو....." کنال نے انجلی کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ بھگوان کی کرپا سے ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ چنتا چھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ آج ہم باہر کہیں گھومنے کے لئے چلتے ہیں۔"

"نہیں کنال..... میرا من نہیں کر رہا۔" انجلی نے ناک چڑھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"پر نتو میرا تو من کر رہا ہے ناں۔ چلو اب جلدی کرو اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔" کنال نے اٹھتے ہوئے انجلی کا بازو پکڑا۔

"نہیں کنال رہنے دیں پھر کبھی سہی۔" انجلی نے ٹالنا چاہا۔

"ابھی نہیں تو کبھی نہیں تمہارا من بھی بہل جائے گا۔ انجلی انسان ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جائے تو اس کا موڈ فریش ہو جاتا ہے۔ اب میری مثال ہی لے لو دفتر میں جب بھی مجھے کوئی ٹینشن ہوتی ہے تو تمہیں اور کیلاش کو دیکھ کر میری ٹینشن جھٹ سے ختم ہو جاتی ہے۔" کنال نے انجلی کو سمجھایا اب جلدی کرو اور یہ کیلاش کہاں ہے؟"

"وہ باہر لان میں کھیل رہا ہوگا۔" انجلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اسے اندر بھیجتا ہوں اسے بھی فٹ فٹ تیار کرو اور خود بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" کنال نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا، انجلی نے منہ سے ایک بوجھل سانس خارج کی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ تیار ہو گئی۔ کنال کہاں رہ گئے انجلی خود سے ہمکلام ہوئی۔

اسی وقت اس کی ملازمہ کمرے کا دروازہ زور سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئی وہ گھبرائی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"ان..... ان..... انجلی..... جلدی..... وہ..... وہ....." گھبراہٹ کے باعث ملازمہ چمپا کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

انجلی کے دل نے تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ "کک..... کیا ہوا..... چچ..... چمپا....." انجلی کو اپنا جسم بے جان سا محسوس ہوا، وہ سمجھ گئی تھی کہ چمپا کوئی اچھی خبر نہیں لائی۔

"وہ..... وہ انجلی دیدید..... کک..... کیلاش..... کیلاش....." چمپا پھر ٹوٹے ہوئے الفاظ میں آدھی بات کہہ سکی تو انجلی تیزی سے چمپا کے قریب آئی۔ "تو بول کیوں نہیں رہی چمپا..... کیا ہوا کیلاش کو....." انجلی نے ہکلاتے ہوئے بھرائی آواز میں چمپا سے پوچھا۔

"انجلی دیدی..... وہ کیلاش بابو باہر لان میں فٹ بال سے کھیل رہے تھے تبھی کنال بابو اندر سے باہر لان میں کیلاش بابو کو بلانے آئے تو کیلاش بابو کا فٹ بال رینگتا ہوا باہر سڑک پر جا گر کیلاش بابو اسے پکڑنے کے لئے باہر کی طرف بھاگے تو۔" چمپا کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر رکی۔

"تو کیا چمپا.....؟" اس مرتبہ انجلی نے غصے سے چمپا کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ت..... تو..... سڑک پر آتی تیز رفتار گاڑی نے کیلاش بابو کو کچل دیا!!" چمپا نے دھماکہ کیا۔

"کک..... کیا.....؟؟" انجلی زور سے چلائی۔

"نن..... نن..... نہیں!!"

انجلی چیختی ہوئی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی چیخ کی آواز سن کر اس کے ساتھ لیٹا ہوا کنال بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ انجلی نے حیرت سے ارد گرد نظریں دوڑائیں وہ سمجھ گئی کہ ہر بار کی طرح یہ بھی ایک سپنا ہی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا..... انجلی کیا ہوا..... کنال نے تیزی سے آگے بڑھ کر انجلی کو سینے سے لگایا۔

"یہ..... یہ سپنے میری جان لے لیں گے۔" کنال وہ روتے ہوئے بولی۔ "یہ سپنے کسی کارن ہی مجھے نظر آتے ہیں۔"

"اوکم آن انجلی۔ پھر وہی سپنے تم ان سپنوں سے اتنی خوفزدہ کیوں ہو۔" کنال کا لہجہ بے زار تھا۔ نہیں کنال۔ ان سپنوں کا ضرور کوئی نہ کوئی کارن ہے۔ یہ..... یہ سپنے مجھے پاگل کر دیں گے۔ انجلی نے کنال کے سینے سے اپنا سر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کارن..... کارن تو ضرور ہے انجلی۔ اور وہ ہے تم تینوں کی موت۔" اچانک انجلی کے پاس بیٹھے کنال کی آواز خوفناک اور کھردری ہوگئی، انجلی نے حیرانگی سے کنال کی طرف دیکھا تو خوف کے باعث اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی کیونکہ کنال کی جگہ اب وہاں ایک خوفناک شکل والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

نئے ماڈل کی کار کی ہیڈ لائیٹس رات میں اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے سڑک پر دوڑ رہی تھی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبصورت نوجوان اور ساتھ والی سیٹ پر ایک خوبرو حسینہ سیٹ کی ٹیک سے سر لگائے سو رہی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا لڑکا بار بار اس لڑکی کی طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا مصیبت ہے۔ وہ لڑکا غصے سے بڑبڑایا..... اتنی خوبصورت کنیا ساتھ ہے اور مجھے اس سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا۔ اور اوپر سے نیند بھی آرہی ہے۔"

لڑکے نے ایک مرتبہ پھر بے زار نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا اور اکتا کر ڈیش بورڈ سے سگریٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگا لڑکے نے دوبارہ لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر شرارتی ہنسی ہنس دیا، لڑکے نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور دھویں کی تیز لہر لڑکی کے چہرے کی طرف پھینکی اور دھواں جب لڑکی کی ناک کے نتھنوں میں گھسا تو لڑکی نے جھٹکے سے کھانستے ہوئے آنکھیں کھولیں اور لڑکا اپنی اس شرارت پر ہنسنے لگا، اب لڑکی کھا جانے والی نظروں سے لڑکے کو گھور رہی تھی۔ "ویسے پرکاش جی مردوں میں یہ عادت بہت بری ہے۔" وہ لڑکی منہ بناتے ہوئے بولی۔

کونسی عادت؟ اس لڑنے کے حیرانگی سے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"یہی جو آپ کے منہ میں گھسی ہے اور کینسر جیسی بیماریوں کا کارن بھی ہے۔" لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا تو پرکاش نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"ویسے مناکشی جب کوئی رات میں سفر کر رہا ہو تو ساتھ بیٹھے ہمسفر ساتھی کو چاہیے کہ وہ ڈرائیور کو باتوں میں لگائے تاکہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے اور آپ ہیں کہ ایسا لگ رہا ہے کہ کئی سمے سے نیند کی پیاسی ہوں۔" پرکاش نے بظاہر لڑکی مناکشی کو سمجھایا۔

"واہ پرکاش..... واہ اپنے دل کی بات کہنے کا انداز تو کوئی آپ سے سیکھے۔" مناکشی نے تالی بجاتے ہوئے کہا تو اس کے کانوں کو ایک مرتبہ پھر پرکاش کا قہقہہ سننا پڑا۔ "ابھی تک میرا حلق آپ کے اس کڑوے دھویں کی کڑواہٹ کو محسوس کر رہا ہے۔"

"چلئے ہم آپ سے سوری کر لیتے ہیں۔ پرکاش نے تعظیماً اپنے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

غلطی ماننے کا طریقہ بھی آپ کا خوب ہے۔ آپ تو سوری ایسے کر رہے ہیں جیسے مجھ پر احسان کر رہے ہیں مناکشی نے جلتے لہجے میں کہا تو پرکاش بے اختیار ہنس پڑا۔ اچھا مناکشی جی آپ پریشان نہ ہوں میں آپ سے دلی طور پر سوری کرتا ہوں۔ پرکاش اس مرتبہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

جایئے میں نے آپ کو معاف کیا اس مرتبہ مناکشی

مسکرائی تو جواباً پرکاش بھی مسکرا دیا جلد ہی پرکاش نے گاڑی ایک لوہے والے گیٹ کے پاس روک دی اور دونوں کار سے باہر نکلے پرکاش نے کار کی ڈگی سے ایک لمبی سلاخ اور ٹارچ نکالی، ایک منٹ مناکشی جی پرکاس نے اس مکان کی طرف بڑھتی ہوئی مناکشی کو آواز دی تو وہ رک گئی پرکاش نے اس کے قریب جا کر منہ میں کچھ پڑھا اور پھر اپنے اوپر اور مناکشی پر ایک ایک بار پھونک ماری۔

"اب چلیے۔" پرکاش نے کہا تو وہ دونوں اس مکان کے گیٹ کی طرف بڑھے۔

گیٹ پر زنجیر کے ساتھ ایک تالا لگایا گیا تھا پرکاش نے اس سلاخ کی مدد سے اس تالے کو توڑا اور گیٹ کھول کر وہ دونوں اس مکان میں داخل ہو گئے، مکان کے اندرونی دروازے کے قریب پولیس کی وارننگ پٹی لگی ہوئی تھی وہ دونوں اس پٹی کے نیچے سے گزرے اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ یہاں بھی ایک عدد تالے نے ان کا استقبال کیا۔

مناکشی نے ٹارچ آن کر لی تھی یہ تالا بھی اس سلاخ کی مدد سے کھل گیا انہوں نے دروازہ کھولا تو مٹی کا بھبھوکا سا ان کی ناک سے ٹکرایا اور وہ کھانسنے لگے وہ اندر داخل ہوئے انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا وہ گھر کافی خوبصورت تھا۔ لیکن بند ہونے کی وجہ سے اس کی حالت کافی خستہ حال تھی، فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی اور چھت پر جگہ جگہ مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے گھر میں چھوٹا سا ہال جس میں آمنے سامنے تین کمرے اور ایک واش روم تھا چھت پر جاتیں سیڑھیاں بھی تھیں وہ ٹارچ کی روشنی کی راہنمائی میں ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوئے مکان کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی عرصے سے کسی ذی روح نے یہاں بسیرہ نہ کیا ہو وہ جس کمرے میں داخل ہوئے اس کمرے میں گرد و غبار سے اٹا ہوا ایک بیڈ دو کرسیاں جو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل جس کا آئینہ ٹوٹا ہوا تھا پرکاش اور مناکشی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آئے، پرکاش نے ٹارچ کی روشنی میں ڈریسنگ ٹیبل کے ٹوٹے ہوئے شیشہ پر جما ہوا خون لگا ہوا تھا ایسے ماحول میں ناکشی کا دل تیز، تیز دھک دھک کر رہا تھا وہ اس ماحول سے کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"میاؤں....." اچانک بیڈ کے نیچے سے ایک بلی نکلی تو مناکشی تیزی سے چیختی ہوئی پیچھے ہٹی، بلی باہر ہال کی طرف بھاگ گئی تھی۔ "آپ تو کافی ڈرپوک ہیں مناکشی جی۔" پرکاش نے ہنستے ہوئے مناکشی کا مذاق اڑایا۔

"یہ تو غنیمت ہے پرکاش جی آپ ساتھ ہیں ورنہ جیسا ماحول ہے میں کئی سے پہلے کی بے ہوش ہو چکی ہوتی۔" مناکشی نے پرکاش کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

آپ بالکل بھی چنتا نہ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ پرکاش نے مناکشی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آپ اپنا کام جلدی کمپلیٹ کریں پرکاش جی..... م مجھے تو یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے مناکشی نے ہکلاتے ہوئے اپنی کیفیت بیان کی۔ ابھی صبر کریں منکاشی جی۔ ابھی اس کام میں تھوڑا سمے ہے۔ پرکاش نے اردگرد نظریں گھماتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کک..... کتنا سمے....." مناکشی نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ سمے آنے پر آپ کو پتہ چل جائے گا۔ پرکاش نے کہا۔ آیئے میرے ساتھ مجھے ایک اور جگہ خون کا بتایا گیا تھا پرکاش کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو مناکشی نے بھی تیزی سے اس کی پیروی کی وہ دونوں ہال میں آئے آور پرکاش نے ٹارچ کی روشنی فرش پر ڈالی، فرش مکمل طور پر گرد میں چھپا ہوا تھا، پرکاش نے آگے بڑھ کر ایک جگہ سے جوتوں سے فرش پر سے گرد ہٹائی تو پرکاش نے دیکھا وہاں کافی سارا خون جما ہوا تھا۔ ہوں پرکاش نے ایک گہری سانس اپنے اندر کھینچی ساتھ ہی وہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ تو یہ ہے ان دونوں کا خون۔

"پرکاش جی..... م..... مم..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مناکشی نے فرش پر جمے ہوئے خون کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرا کر کہا۔ مناکشی جی یہ سمے گھبرانے کا نہیں بلکہ کچھ کرنے کا ہے۔ ورنہ غضب ہو جائے گا۔ پرکاش

نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مناکشی کی طرف دیکھا۔

"اب میں آپ کو جیسا کہوں گا آپ نے ویسا ہی کرنا ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔" پرکاش نے پہلے مناکشی کو سمجھایا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل والے کمرے کی طرف بڑھ گیا مناکشی بھی اس کے ساتھ اس کمرے میں چلی آئی۔ اب آپ اس بیڈ پر لیٹ جایئے پرکاش نے کمرے میں پڑے گرد و غبار سے اٹے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میری ساڑی خراب ہو جائے گی۔ مناکشی نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹی تو پرکاش بے اختیار مسکرا پڑا۔ مناکشی جی چنتا نہ کریں میں آپ کو نئی ساڑی لے دوں گا۔ پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب جلدی کریں رات پہلے ہی اپنا سفر کافی طے کر چکی ہے ہمیں رات کے انت سے پہلے پہلے اس کام کو پورا کرنا ہے۔

مناکشی ہچکچاتے ہوئے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی پرکاش نے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی جس میں لال کلر کا کوئی محلول تھا۔ اب آپ گھبرایئے گا مت اس شیشی میں موجود خون، میں آپ کے دونوں بازوؤں پر لگاؤں گا اور پھر ایک منتر پڑھ کر آپ پر پھونکوں گا جس سے آپ کو نیند آ جائے گی۔ پرکاش نے کہا تو مناکشی نے اثبات میں سر ہلا دیا، پرکاش نے اس شیشی میں سے تھوڑا سا خون ہاتھ کی ہتھیلی پر ڈالا اور مناکشی کے دونوں بازوؤں پر مل دیا اور منہ میں ایک منتر پڑھ کر مناکشی پر پھونک ماری تو مناکشی کو اپنی پلکیں بھاری ہوتی ہوئیں محسوس ہوئیں جلد ہی اس نے آنکھیں موند لیں اور پھر ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی۔

پرکاش نے اطمینان سے ایک لمبی سانس کھینچی اور کمرے سے باہر ہال میں نکل آیا اب وہ اس جگہ پر آیا جہاں فرش پر خون جما ہوا تھا، پرکاش نے اس شیشی میں سے خون کے چند قطرے فرش پر اس جمے ہوئے خون پر ٹپکا دیئے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک نسوانی چیخ کی آواز تھی جسے سن کر بیڈ پر لیٹی مناکشی کی آنکھ کھلی تھی مناکشی بیڈ پر لیٹی حیرت سے اردگرد دیکھنے لگی کمرہ اب مکمل طور پر روشنی میں نہایا ہوا تھا اور کمرے کی حالت بالکل ایک استعمال ہونے والے کمرے جیسی تھی، ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ بھی بالکل صحیح حالت میں تھا۔

ایک مرتبہ پھر نسوانی چیخ نے مناکشی کو اپنی طرف متوجہ کیا، وہ نسوانی چیخیں ہال سے آ رہی تھیں، ہال بھی اب روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ اور بالکل صحیح حالت میں تھا۔

مناکشی بیڈ سے نیچے اتری اور ہال میں آئی تو مناکشی کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا، مکان کے بیرونی دروازے سے دو بٹے کٹے خوبصورت نوجوان اندر داخل ہوئے ان میں سے ایک نے ایک لڑکی کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا اور وہ لڑکی اپنے آپ کو بچانے کے لئے ٹانگوں، بازوؤں اور چیخوں کا سہارا لے رہی تھی۔ ٹانگیں وہ زور زور سے ہلا رہی تھی، ہاتھوں کے مکے وہ لڑکے کی کمر پر برسا رہی تھی اور ساتھ ساتھ منہ سے چیخ بھی رہی تھی وہ دونوں لڑکی کو اٹھائے مناکشی کی طرف ہی آ رہے تھے۔

"بچاؤ..... بچاؤ۔" وہ لڑکی پھر چلائی۔ جتنا مرضی چیخو۔ یہاں تمہاری کوئی سننے والا نہیں ہے۔ کندھے پر لڑکی اٹھائے اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کندھے پر لڑکی اٹھائے اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مم..... مم مجھے چھوڑ دو تمہیں بھگوان کا واسطہ۔" وہ لڑکی منت بھرے لہجے میں بولی۔

وہ لڑکے مناکشی کے قریب آئے تو مناکشی تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور وہ دونوں لڑکے اس ڈریسنگ ٹیبل والے کمرے میں پہنچے تو رنویر نے اس لڑکی کو بیڈ پر پٹخ دیا۔

"دد..... دد..... دیکھو رنویر بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ گھر میں میرے ماتا پتا پریشان ہو رہے ہیں۔" لڑکی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے رنویر سے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"اپنے ماتا پتا کی پریشانی کا خیال ہے۔ اور میرا، میں جو بچپن سے لے کر آج تک تمہارے پریم میں تڑپا ہوں۔" رنویر غصے سے چیختے ہوئے بولا۔

"مم..... مم..... میں تم سے پریم نہیں کرتی رنویر ..... مم..... میرا کنال سے ویواہ ہونے والا ہے۔ پلیز بھگوان کے لئے مجھے جانے دو۔" وہ لڑکی بدستور روتے

ہوئے بولی۔

"میرے سپنوں کا محل توڑ کر تم کسی اور کی ہو جاؤ یہ میں ہونے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں کسی کو منہ دیکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گا۔" رنویر سفاک لہجے میں بولا۔

کسی سے پریم کرو تو لوگ اپنی پریمیکا کو پلکوں پر بٹھاتے ہیں اور تم۔" اس لڑکی نے روتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یہ تو اپنا اپنا انداز ہے انجلی!!" اس مرتبہ دوسرے لڑکے نے مسکراتے ہوئے لڑکی کا نام انجلی لیا۔ "کسی کو پھول کی خوشبو سونگھنے میں مزہ آتا ہے اور کسی کو پھول مسلنے میں۔ مجھے تو پھول مسلنے میں مزہ آتا ہے۔"

"میں نے تم سے اپنے دل کی بات کہی تھی انجلی پرنتو تمہیں یاد ہے تم نے اس کا کیا جواب دیا تھا۔" اس مرتبہ رنویر اپنے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "پرنتو تم بھی جانتے ہو میں نے تمہیں وہ تھپڑ کس کارن مارا تھا۔ میں وہ پہلی لڑکی نہیں تھی جس سے تم نے پریم کیا تھا میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اور یہ شیکھر کالج میں کیا رنگ رلیاں مناتے ہو۔ اور اس کی مثال ابھی بھی شیکھر نے تمہارے سامنے دی ہے تم اور یہ شیکھر صرف لڑکیوں کو استعمال کرتے ہو اور پھر انہیں بے کار چیزوں کی طرح چھوڑ دیتے ہو۔" انجلی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے سچا پریم کیا تھا انجلی۔" رنیور کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"سچے پریمی ایسے کام نہیں کرتے رنویر جو تم کر رہے ہو..... اگر تمہیں مجھ سے سچا پریم تھا تو تم ہر برا کام چھوڑتے خود کو سدھارتے پرنتو تم۔ تمہارا سارا کالا چٹھا مالنی نے میرے سامنے کھول دیا تھا اور یہ بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ شیر کے منہ کو خون لگ جائے تو وہ دودھ نہیں پیتا ایسا ہی حال تمہارا ہے تمہارے ماتا پتا نے بھی تمہیں کئی بار سمجھانے کی کوشش کی پرنتو تمہاری حرکتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تم مجھ سے نہیں میرے شریر سے پریم کرتے ہو تم صرف میرے شریر سے کھیلنا چاہتے ہو اور کچھ نہیں۔" اس مرتبہ انجلی نفرت انگیز لہجے میں بولی۔

"وہ تو میں اب بھی کھیلوں گا فرق صرف اتنا سا ہے پہلے میں تمہاری مرضی سے کھیلتا اور اب میں اپنی مرضی سے کھیلوں گا۔ اس مرتبہ۔" رنویر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"نہ پہلے نہ اب۔ جب تک میرے شریر میں سانسوں کی یہ ڈور ہے میں تم دونوں کو اپنے اس شریر پر ہاتھ بھی لگانے نہیں دوں گی۔" اس مرتبہ انجلی پختہ لہجے میں بولی۔

"اچھا تو اب بھیگی بلی شیرنی بن گئی۔" رنویر طنزیہ لہجے میں انجلی کا مذاق اڑایا۔

"جب بات عزت پر ہو تو ناری شیرنی بننے میں سے نہیں لگاتی۔" انجلی انگارہ اگلتی آنکھوں سے رنویر اور شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اور ویسے بھی پولیس یہاں کسی بھی سے پہنچنے والی ہے۔

"کک..... کیا مطلب؟" اس مرتبہ شیکھر ہکلایا۔

"مطلب یہ کہ جب تم نے مجھے فون کیا کہ دیوا سے پہلے تم مجھ سے ایک مرتبہ ملنا چاہتے ہو تو میری دیدی مناکشی نے مجھے منع بھی کیا کہ رات کے اس سمے تمہارا س سے ملنا ٹھیک نہیں۔ پرنتو میری ہی مت ماری گئی تھی جو میں تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی اور اپنے گھر کی پچھلی گلی میں تم سے ملنے آ گئی۔ پرنتو اب تک تو مناکشی نے ماتا پتا کو سب کچھ بتا دیا ہوگا اور ماتا پتا نے پولیس کو انفارم کر دیا ہوگا اور پولیس تمہاری اور میری تلاش میں نکل کھڑی ہوگی۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ تب تو ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔ ویسے بھی ہمیں چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس گھر کے بارے میں کسی کو بھی پتہ نہیں ہے اور پولیس اگر یہاں پہنچ بھی جاتی ہے تب تک تم کسی کو منہ دیکھانے کے لائق نہیں رہو گی۔" رنویر پہلے پریشانی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا رنویر کی اس بات سے پریشانی اور گھبراہٹ نے انجلی کے چہرے پر بسیرہ کر لیا تھا۔ "جب تک میری سانس

میں سانس ہے میں تم دونوں کو اپنے شریر کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دوں گی۔ مر جاؤں گی پر نتو تم دونوں کو اپنے گندے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" انجلی ایک عزم سے بولی۔

رنویر اور شیکھر نے انجلی کی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ لگایا انجلی تیزی سے بیڈ سے نیچے اتری اور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہو گئی وہ رنویر اور شیکھر کا ناکام مقابلہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ رنویر مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اس نے انجلی کو بازو سے پکڑنے کی کوشش کی تھی اس نے بھی ایک زوردار تھپڑ انجلی کے گال پر دے مارا تو نازک سی انجلی کے گال پر اتنا زوردار تھپڑ شاید زندگی میں پہلی بار پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سامنے تارے ناچنے لگے اور وہ چیختی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے جا ٹکرائی اور ڈریسنگ ٹیبل کا کانچ ٹوٹ گیا انجلی کا سر پھٹ گیا تھا اور اس کا تھوڑا سا خون ڈریسنگ ٹیبل کے ٹوٹے ہوئے شیشہ پر لگ چکا تھا انجلی کو چکر سے آتے ہوئے محسوس ہوئے اس نے زور سے سر کو جھٹکا وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ اگر وہ اس موقع پر کمزور ہو گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جانی تھی شیکھر اور رنویر نے انجلی کو بازوؤں سے پکڑا انجلی نے اپنا گھٹنا رنویر کی ٹانگوں کے بیچ نازک مقام پر دے مارا اب آنکھوں کے سامنے ناچتے تارے دیکھنے کی باری رنویر کی تھی اس کے منہ سے بے اختیار زوردار چیخ نکلی اور وہ جھک کر بیٹھ گیا اب انجلی نے اپنے ناخنوں سے شیکھر کا چہرہ لہولہان کر دیا وہ اپنا چہرہ پکڑ کر بیٹھ گیا انجلی نے موقع غنیمت جانا اور تیزی سے کمرے کی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔

دروازے پر کھڑی مناکشی ایک مرتبہ پھر ڈر کر پیچھے ہٹی۔ "پپ..... پپ..... پکڑو اس حرامزادی کو شیکھر۔" رنویر نے تکلیف کے باعث ہکلاتے ہوئے کہا۔ شیکھر اپنے چہرے کی تکلیف بھول کر تیزی سے ہال کی طرف بھاگا اور گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگتی انجلی کو بالوں سے پکڑ لیا رنویر بھی کراہتا ہوا اٹھا اور ہال میں آ گیا۔

مناکشی چپ چاپ کھڑی یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔

شیکھر نے انجلی کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا جب کہ رنویر نے ان دونوں کے قریب پہنچ کر انجلی کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی انجلی کے دونوں ہونٹ پھٹ چکے تھے اور پھٹے سر کے خون سے اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا تھا وہ فرش پر جا گری اب شاید اس میں مزید لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ "حرامزادی کتیا۔" رنویر چیخ سے مشابہ لہجے میں بولا۔ "ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اچانک زمین پر بیٹھی انجلی یکدم اٹھی اور شیکھر کی پینٹ کی بیلٹ میں لگے ریوالور کو نکال لیا اس نے شاید ریوالور دیکھ لیا تھا آج قدرت شاید انجلی پر مہربان تھی شیکھر انجلی سے ریوالور چھیننے کے لئے انجلی کی طرف لپکا..... ٹھاہ....." ہال میں فائر کی ایک آواز گونجی انجلی نے شیکھر پر گولی چلا دی تھی۔ شیکھر کی چیخ بھی نہ نکل سکی وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا اب انجلی نے ریوالور کا رخ رنیور کی طرف کیا۔

"دد..... دیکھو انجلی..... مم..... مم..... میری.....

بب..... بات سنو....." رنویر گھبراتے ہوئے ہکلایا۔

"ذلیل کمینے انسان تیرا انت سمے آ گیا ہے۔ شاید تیرا انت میرے ہی ہاتھوں لکھا ہے۔" اتنا کہہ کر انجلی نے رنویر پر فائر کھول دیئے رنویر بھی شیکھر کی طرح بغیر چیخے فرش پر ڈھیر ہو گیا رنویر اور شیکھر کے جسم سے نکلنے والا خون فرش پر پھیل چکا تھا۔

د..... دیکھا انجلی تم نے ہمارا کیا حال کیا۔

اچانک مناکشی کو اپنی عقبی جانب سے رنویر کی آواز سنائی دی مناکشی تیزی سے گھومی تو اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی پیچھے رنویر کھڑا تھا۔ "مجھے معلوم تھا انجلی کہ تم یہاں ضرور آؤ گی۔" رنویر پرجوش ہوتے ہوئے بولا۔

"نن..... نہیں رنویر..... مم..... میں انجلی نہیں مناکشی ہوں۔"

مناکشی نے دھڑکتے دل کے ساتھ ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اب ہم ایک ہو جائیں گے انجلی تم بھی میری دنیا میں آ جاؤ گی۔" رنویر نے مناکشی کی بات ان سنی کرتے

ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''د...... دیکھو...... رن...... ویر میں مناکشی ہوں انجلی دیدی تو گھر میں کنال اور کیلاش کے ساتھ ہیں۔'' مناکشی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

اسی وقت نجانے پرکاش کہاں سے نکلا اور اس نے شیشی میں بچا خون وہاں کھڑے رنویر کے سر پر ڈال دیا تو ہال رنویر کی چیخوں سے کانپ اٹھا پرکاش منہ میں کچھ پڑھ بھی رہا تھا۔

اچانک رنویر کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر ایک سفید دودھیا تیز روشنی پورے ہال میں پھیلنے لگی وہ روشنی اتنی تیز تھی کہ مجبوراً ہال میں موجود پرکاش اور مناکشی کی اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں، ہال میں رنویر کی چیخیں بھی گونج رہی تھیں اور پھر وہاں یکدم خاموشی چھا گئی۔

پرکاش اور مناکشی نے آنکھیں کھولیں تو وہ گھر اب دوبارہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور گھر کی حالت پہلے جیسی خستہ حال تھی اور ہال کی چھت پر مکڑیوں کے جالے ابھی لٹک رہے تھے۔

''لیجیے مناکشی جی اب رنویر کی آتما انجلی جی کو تنگ نہیں کرے گی اب رنویر کی آتما نرکھ میں سڑ رہی ہوگی۔ رنویر کی آتما انجلی جی کے خون کی پیاسی تھی اسی کارن وہ انہیں اتنا خوفزدہ کیے ہوئے تھا۔ وہ سپنے رنویر کے کارن ہی انجلی جی کو نظر آتے تھے اگر آپ لوگ اور سمے برباد کرتے تو یہ ڈشٹ آتما انجلی جی اور ان کے پریوار کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ خیر اب تو یہ نرکھ میں جا چکی ہے۔'' پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کا بہت بہت دھنے واد پرکاش جی......'' مناکشی نے مسکراتے ہوئے تہہ دل سے کہا۔

''میرا تو کام ہی یہی ہے مناکشی جی بھٹکی خون کی پیاسی آتماؤں کو ٹھکانے لگانا۔'' جواباً پرکاش بھی مسکرا دیا۔

''آپ بہت پنے کا کام کر رہے ہیں۔ میری دیدی انجلی بہت خوفزدہ رہنے لگی تھیں۔ انسان تو انسان سے لڑ سکتا ہے پرنتو بھوت پریت آتماؤں سے نہیں۔ اور آج میں نے یہاں جو کچھ دیکھ لیا ہے مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہو رہا۔ رنویر اپنی اصل زندگی میں بھی کم خطرناک نہیں تھا پرنتو میری دیدی نے رنویر اور شیکھر کا بڑے بہادری سے مقابلہ کیا وہ تو بھگوان کی کرپا ہوئی، کرائم سین پر موجود ثبوتوں کے کارن میری دیدی عدالت سے باعزت بری ہوگئیں میرے جیجا جی (کنال) بھی بڑے بھلے انسان ہیں اتنی بڑی گھٹنا گھٹنے کے بعد بھی انہوں نے انجلی دیدی کو اپنایا اور اب بھی جب وہ سپنوں کے کارن خوفزدہ رہنے لگیں تو کنال جیجا نے ہی مجھے کال کر کے بلایا اور ساری صورتحال سے آگاہ کیا انجلی دیدی نے آج رنویر کا بھیانک چہرہ بھی دیکھا تھا۔

میری ایک سہیلی نے آپ کا ذکر کئی دفعہ کیا تھا سو میں آپ کے پاس چلی آئی میں ایک مرتبہ پھر آپ کا دھنے واد کرتی ہوں۔ آپ نے ہمیں اتنی بڑی مصیبت سے نکالا۔'' مناکشی نے کہا تو جواباً پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''Its My Duty مناکشی جی۔''

''اچھا پرکاش جی مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔'' مناکشی نے الجھن آمیز نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھا۔ وہ کیا مناکشی جی۔ پرکاش نے سوالیہ نگاہوں سے مناکشی کی طرف دیکھا۔

یہی کہ رنویر کی آتما مجھے کیوں انجلی سمجھ رہی تھی۔ مناکشی نے پوچھا تو پرکاش مسکرا دیا۔ ''وہ اس لیے مناکشی جی کہ میں نے آپ کے بازوؤں پر جو خون لگایا تھا وہ انجلی جی کا تھا اور میں نے آتے سمے انجلی جی کے بازوؤں سے لیا تھا میں نے آپ پر ایک منتر بھی پڑھا تھا بس اسی کارن رنویر کی آتما آپ کو انجلی سمجھ رہی تھی۔'' پرکاش نے بتایا۔ اور مناکشی نے سمجھنے والے انداز میں ہونٹوں کو دائروی شکل دی۔ ''اب آپ جلدی سے اپنے بازوؤں سے یہ خون صاف کر دیں ورنہ رنویر کی آتما پھر آپ کو انجلی سمجھ کر نرکھ سے واپس نہ آ جائے۔'' پرکاش نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو مناکشی تیزی سے اپنے بازو پر ہاتھ پھیرنے لگی اور ہال پرکاش کے قہقہے سے گونج اٹھا۔

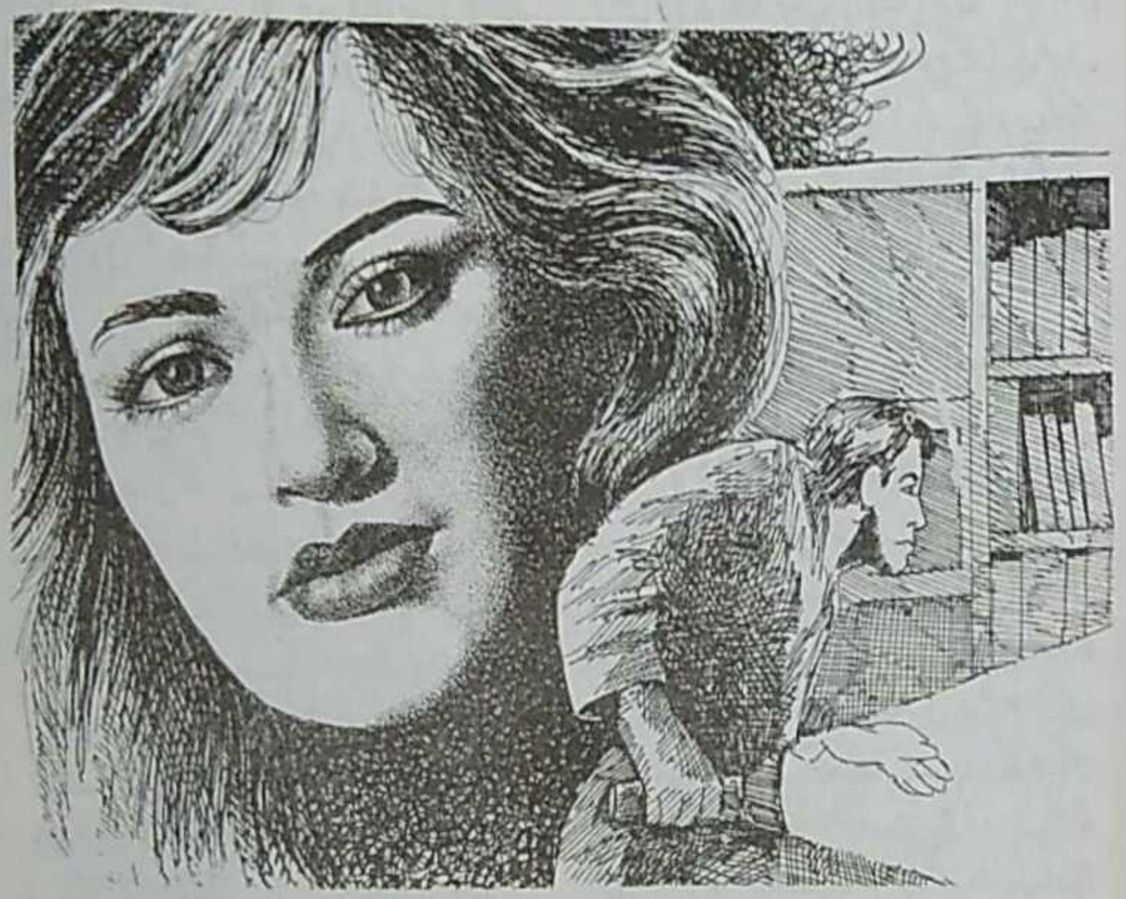

گمشدہ ممی

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

کانسٹیبل ایک دم ہی چونکا اور پھر فوراً ہی ایک ساتھ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا اس کی ٹارچ کی روشنی مختلف مجسموں اور تاریک گوشوں کو کھنگال رہی تھی کہ

دل ودماغ پر کپکپی طاری کرتی...... عجیب وغریب نوعیت کی...... دل دہلاتی کہانی

وہ اگست کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ کھچڑی داڑھی والا لمبے قد کا ایک دُبلا پتلا آدمی سنٹرل میوزیم کے مین ہال میں داخل ہوا۔ اس کا کوٹ اس کے جسم پر بمشکل پورا تھا۔ سر پر اطالوی طرز کا اونچا ہیٹ اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جسے وہ لاپروا اندا زمیں گھماتا ہوا ادھر اُدھر یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ پہلی دفعہ یہاں آیا ہو۔ پھر وہ اوپری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا عجیب سنکی انداز تھا وہ وقفے وقفے سے اونچی آواز میں کھانس بھی رہا تھا۔

اس کے انداز اور نحیف ونزار شخصیت نے اس میوزیم کے نگران سمیت کئی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔ وہ بڑی محویت کے عالم میں مصری اہراموں سے دریافت ہونے والی قدیم فرعونوں کی ممیوں کے تابوتوں کے اوپر جھکا ایک ٹک انہیں دیکھے جا

رہا تھا اور مسلسل کھانس رہا تھا۔ میوزیم بند ہونے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے زیادہ تر سیاح واپس جا رہے تھے۔ وہ نحیف و نزار شخص بھی سیڑھیوں کی طرف گیا تو نگرانوں نے سمجھا کہ وہ بھی میوزیم سے باہر جا رہا ہے مگر اس کو شاید کوئی جلدی نہ تھی وہ پھر رک گیا۔

رات کو اس میوزیم میں پہرہ دینے والے پولیس کے لوگ آ چکے تھے۔ رات کو اس میوزیم کے ہر کمرے میں ایک پولیس والا متعین ہوتا تھا۔ یہ اس کے فرائض میں تھا کہ وہ اس کمرے کے ہر کونے کھدرے کی تلاشی لے۔ یہ سب کرنے کے بعد میوزیم کے سارے داخلی اور خارجی دروازے بند کر دیے جاتے۔ ہر کمرے کو بھی مقفل کر دیا جاتا اور کمرے کے اندر موجود پولیس کا محافظ صبح تک نہ باہر جا سکتا تھا نہ کوئی اور اندر آ سکتا تھا۔ ہر ایک گھنٹے کے بعد انسپکٹر اور سارجنٹ پوری عمارت کا چکر لگاتا۔ اس طرح کسی چڑیا کو بھی اس عمارت میں ساری رات پر مارنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

مگر اس رات مصری نوادرات کے کمرے میں موجود "ممی" کے ساتھ ہونے والے واقعہ نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ جو لوگ اس میوزیم سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کمرے میں ایسے تابوت بھی رکھے ہوئے ہیں جو ممیوں کو رکھنے کے کام تو آتے ہیں مگر کئی ایک وجوہات کی بنا پر ان کی نمائش نہیں کی جاتی۔ ان کے ڈھکن دوسرے تابوتوں کی طرح شیشے کے نہیں بلکہ لکڑی کے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر رکھی مہیب ممیوں کو رات کی تنہائی اور سناٹے میں جھانکنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پولیس کا جو کانسٹیبل رات بھر اس کمرے میں ان تابوتوں کے ساتھ تنہا رہتا اس کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ بجلی کے قمقموں کی روشنی اتنے بڑے کمرے کے ہر گوشے کو منور کرنے کے لیے ناکافی تھی اور پھر رات کو دروازہ بھی باہر سے مقفل ہوتا۔

اس رات بھی ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل نے اس کمرے میں موجود سارے تابوتوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر ٹارچ اوپر اٹھا کر تاریک گوشوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرنے لگا پھر وہاں کسی کو نہ پا کر وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیلری کی طرف چلا گیا وہاں سے ٹارچ کی روشنی ڈال کر نیچے کمرے کو پھر دیکھا۔ نیچے والے کمرے کی روشنیاں جل رہی تھی اور سارجنٹ ابھی چابیاں لے کر نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ وہاں کھڑا اس کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ واقعہ ہو گیا۔

نیچے کمرے کے کسی تاریک گوشے سے کسی کے کھانسنے کی آواز ابھری۔

کانسٹیبل ایک دم چونکا اور پھر فوراً ہی ایک ساتھ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اس کی ٹارچ کی روشنی مختلف مجسموں اور تاریک گوشوں کو کھنگال رہی تھی مگر آواز دوبارہ نہ ابھری اس لیے اس کی سمت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔ کانسٹیبل نے دوسری دفعہ تمام تابوتوں کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھا۔ جب وہ ہر جگہ کا اچھی طرح معائنہ کر چکا اور کوئی مشکوک چیز نہ ملی تو وہ سوچنے لگا کہ یہ آواز شاید اس کے تخیل کا شاخسانہ تھی۔ اس کی ٹارچ کی روشنی آخری تابوت کے اوپر رینگتے ہوئے آگے بڑھی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اس نے دیکھا کہ تابوت بالکل خالی تھا حالانکہ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب اس نے ان تابوتوں کو چیک کیا تھا تو اس تابوت میں بھی ایک ممی لیٹی ہوئی تھی۔

اس خوف ناک انکشاف نے اس کے پورے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس نے فوراً سے پیشتر اس کمرے کی ساری روشنیاں جلا ڈالیں۔ اوپر نگاہ ڈالی تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ اوپر گیلری اندھیرے میں ڈوب چکی تھی حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر نیچے بھاگا تھا تو اس گیلری کی ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی قدم اٹھاتا سارجنٹ کی تیز آواز کمرے کے سکوت کو چیر گئی۔

"یہاں روشنیاں کس نے بند کی ہیں؟۔۔۔"

"میں بھی یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ

روشنیاں کس نے گُل کی ہیں۔" کانسٹیبل نے فوراً وضاحت کی اور پھر اس نے کسی کے کھانسنے اور ممی کے غائب ہونے کی ساری بات جلدی جلدی بتا دی۔

"یہ ممی اس کمرے میں کب سے تھی؟۔" سارجنٹ نے پوچھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے تقریباً ایک ماہ پہلے اس ممی کو اوپر والے کمرے میں بھیج دیا گیا تھا مگر پچھلے ہفتے اسے دوبارہ اس کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا مگر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کل رات یہاں اس کمرے میں ڈیوٹی پر کوئی اور تھا۔"

سارجنٹ جانتا تھا کہ اس کی یہ بات بالکل سچ ہے کیونکہ کسی کانسٹیبل کی کسی ایک کمرے میں مستقل ڈیوٹی نہیں لگائی جاتی تھی بلکہ ہر دو تین روز بعد انہیں بدل دیا جاتا تھا اور اس کانسٹیبل کی ڈیوٹی پچھلے دو ہفتوں سے یہاں نہیں لگی تھی۔

"بہت عجیب بات ہے۔" سارجنٹ بڑبڑایا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی سیٹی بج اٹھی۔ سارے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے کیونکہ ابھی کوئی بھی دروازہ مقفل نہیں ہوا تھا۔ "یوں لگتا ہے کوئی شخص میوزیم میں چھپا ہوا ہے۔ سب کمروں کی دوبارہ تلاشی لو۔" اس نے مختصر حکم دیا۔

سارے کانسٹیبل اِدھر اُدھر پھیل گئے اور سارجنٹ خود نیچے اس کمرے کے معائنہ کے لیے چلا گیا مگر وہاں کوئی سراغ نہ ملا۔ دوسرے لوگوں کو بھی کوئی کامیابی نہ ملی۔ کہیں کسی آدمی کے چھپنے کا کوئی نشان نہ تھا۔ باقی کی رات مزید کسی قابل ذکر واقعہ کے گزر گئی۔ غائب ہونے والی ممی اور بھوت کی چھینک بھی معمہ ہی رہ گئی۔

پولیس صبح واپس چلی گئی مگر سارجنٹ گمشدہ ممی کے معاملے کی مزید تحقیق کے لیے جلد ہی میوزیم میں لوٹ آیا۔ اب اسے میوزیم کے نگران سے کچھ معلومات حاصل کرنا تھیں۔

"سب سے آخری تابوت میں ممی۔۔۔؟"۔

اس کی بات سن کر میوزیم کا نگران حیرت سے اچھل پڑا۔

"مگر جناب۔۔۔ وہ تابوت تو کافی عرصہ سے خالی پڑا ہے اس کے اندر تو کوئی ممی نہیں تھی۔"

"مگر میرے کانسٹیبل نے بتایا کہ اس نے کل رات اس تابوت میں ایک ممی دیکھی تھی۔" سارجنٹ نے وضاحت کی تو نگران نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر اپنے ایک ماتحت کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "کل اس کمرے کا انچارج کون تھا۔"

"میں خود تھا جناب۔"

"کیا وہاں کوئی خاص یا عجیب شخص دیکھا گیا۔"

"نہیں۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ کم از کم شام چھے بجے تک کوئی نہیں۔"

"اور اس کے بعد۔۔۔؟"

"پھر میں چائے پینے چلا گیا تھا۔"

"تب وہاں کون نگران تھا۔؟"

"مسٹر رابنز۔۔۔"

"رابنز کو جلدی بلاؤ۔۔۔"

جلد ہی رابنز وہاں آ گیا۔ نگران اس سے پوچھنے لگا۔ "تم کل شام مصری کمرے میں کتنی دیر تک تھے۔"

"تقریباً آدھ گھنٹہ جناب۔۔۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہاں کوئی مشکوک شخص نہیں آیا تھا۔"

وہ کچھ ہچکچایا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "میں معافی چاہتا ہوں جناب کہ میں نے اس کی اطلاع پہلے آپ کو نہیں دی۔ وہاں ایک شخص آیا تھا جو فراک کوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے سر پر اطالوی طرز کا اونچا ہیٹ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے اس کمرے سے باہر آتے دیکھا ہو۔"

"تمہیں اس واقعے کی فوری اطلاع مسٹر بارٹن کو دینی چاہیے تھی۔" نگران نے تشویش زدہ انداز میں کہا پھر وہ سارجنٹ کی طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے یہ سب واہمہ کے سوا کچھ نہیں پہلے بھی ایسے واقعات ہوتے رہے ہیں۔"

ابھی یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ میوزیم کا ماہر آثار قدیمہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا وہاں آیا اور چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جناب ۔۔۔۔۔ مصری شاہی پیالہ اپنی جگہ سے غائب ہے۔''

''کیا ۔۔۔۔۔۔۔؟'' سب ایک ساتھ حیرت سے چلا اٹھے۔ کوئی توقف کیے بغیر وہ اٹھے اور اس کمرے کی طرف بھاگے تیزی کے ساتھ سیڑھیاں عبور کیں اور مصری کمرے کے اوپر گیلری میں پہنچ گئے جہاں یہ مصری شاہی پیالہ ایک الماری میں مقفل تھا۔ یہ پیالہ دیکھنے میں تو کوئی خاص نہیں تھا مگر ساری دنیا اس کی قدر و اہمیت اور قیمت سے بخوبی آگاہ تھی۔ یہ فرعون طوطخ آمون کا استعمال شدہ پیالہ تھا جس میں وہ ہر روز رات کے کھانے کے بعد شراب پیتا تھا۔ بعد میں یہ پیالہ اس کی ممی کے ساتھ اس کے مقبرے سے دریافت ہوا تھا۔ یہاں اس میوزیم سے اس کا چرانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا مگر اس وقت وہاں اس الماری کے اندر اس کی جگہ ایک نقلی پیالہ پڑا تھا جو دیکھنے میں اصلی کی ہو بہو نقل تھی اور اتنی کمال نقل تھی کہ عام آنکھ سے اس کو پہچاننا ناممکن تھا۔ یہ تو ماہر آثار قدیمہ کا فن تھا کہ اس نے ایک نظر میں نقلی پیالے کو پہچان لیا۔ ہر شخص کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

''اب کیا کیا جائے ۔۔۔۔۔۔؟'' سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میوزیم کو خالی کروا کر تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ ہر کوئی اس انہونی پر پریشان اور حیرت زدہ تھا۔ سارجنٹ نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''سنو۔۔۔ کہیں سے کوئی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔''

ایک دم پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور سارے لوگ چوکنے ہو گئے۔ آہٹ ایک بار پھر سنائی دی تو سب اس طرف بھاگے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ ایک شیشے کے دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جلدی سے چابیاں لائی گئیں اور جب دروازہ کھلا تو پھر شاہی پیالے کی گم شدگی کے بعد اس صبح کی دوسری حیرت انگیز دریافت سامنے آئی۔ ایک آدمی جس کے ہاتھ پاؤں بندھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا وہ ایک ممی کے تابوت کے پیچھے پڑا تھا۔

اس آدمی کے ہاتھ پاؤں جلدی جلدی کھولے گئے اور ابتدائی طبی امداد دی گئی تو اس نے نقاہت کے عالم میں آنکھیں کھول دیں۔ اس کے جسم پر لباس بھی مکمل نہیں تھا اور وہ تیز تیز یوں سانس لے رہا تھا جیسے کسی نشے کے زیر اثر ہو۔

سارے لوگ بے تابی سے اس کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ یقیناً وہ ہی اس راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد وہ تھوڑا سا بولنے کے قابل ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ کانسٹیبل اسمتھ تھا جس کی کل رات مصری کمرے میں ڈیوٹی تھی۔ کل رات جب وہ ڈیوٹی پر گشت لگا رہا تھا تو کسی نے عقب سے اس پر حملہ کر کے اس کو باندھ دیا۔ وہ اپنے مخالف کی کوئی جھلک نہ دیکھ سکا کیونکہ اس نے اسے عقب سے یوں دبوچا تھا کہ وہ بالکل بھی مزاحمت کے قابل نہ رہا تھا۔ حملہ آور نے کوئی دوا، شاید کلوروفارم اس کو سونگھا دیا تھا کیونکہ جب اس کو دوبارہ ہوش آیا تو وہ ممی کے تابوت کے پیچھے پڑا تھا۔ یہ تھی اس کی کل کہانی۔ اس قابل ذکر واقعہ کے بعد ایک آخری اور تیسری دریافت بھی ہوئی اور وہ یہ کہ محافظوں کو وہاں پرانے کپڑوں کا ایک بنڈل ملا جس میں ایک قدیم اطالوی طرز کا ہیٹ، ایک رنگ اڑا فراک کوٹ، ایک پتلون اور ایک جوڑا جوتے شامل تھے اور یہ بنڈل ایک طویل قامت مجسمے کے پیچھے چھپائے گئے تھے جہاں پر پہلے کسی کی نظر ان پر نہ پڑی تھی۔ مزید کوئی سراغ نہ ملا تو مصری کمرے کو بند کر دیا گیا۔

اگلے دن یہ معاملہ اخبارات کی شہ سرخیوں کی زینت بھی بن گیا۔ کئی دن تک میوزیم سراغ رسانوں کی آماج گاہ بنا رہا۔ دو ہفتے گزر گئے اور مصری روم بدستور

بند رہا۔ کانسٹیبل اسمتھ کی شخصیت اس معاملے میں مشکوک تھی مگر کوئی قابل ذکر ثبوت تفتیش کاروں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔

مگر پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی گیارہ دن بعد میوزیم دوبارہ کھول دیا گیا اور فرعون کا اصلی شاہی پیالہ اپنی پرانی جگہ نظر آنے لگا۔ اب وہ دوبارہ لوگوں کے نظارے کے لیے اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ کہاں گیا تھا؟، اسے کون لے گیا تھا؟ اور یہ کہاں سے واپس ملا؟۔۔۔۔ یہ راز کوئی نہیں جانتا تھا سوائے چند اعلیٰ حکام کے اور میرے۔

اب آپ پوچھیں گے میں کون ہوں اور مجھے اس پیالے کے بارے میں کیسے معلوم ہے تو۔۔۔۔۔ بس آپ اتنا جان لیجیے کہ یہ پیالہ گیارہ دن تک میرے قبضے میں رہا تھا۔ اس سے آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ میں کوئی عام چور اچکا نہیں ہوں۔ میں ایک فنکار ہوں اور میرا کام ہر ادارے کی خامیاں تلاش کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس کام کے بدلے میں گراں قدر فیس وصول کرتا ہوں۔

ایک فرانسیسی میوزیم میں نپولین کا مشہور شاہی تاج ناقص حفاظت میں تھا۔ میں نے ایک معقول فیس کے بدلے اسے ایک عرب شہزادے کی خواہش پر نقلی تاج سے اس طرح بدلا کہ آج تک کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ وہاں میوزیم میں رکھا تاج نقلی ہے۔ اسی طرح قاہرہ کے عجائب گھر سے ایک ممی کو میں نے اس طرح غائب کیا کہ حکام کو دو دن بعد ہی اس کی جگہ پڑی ممی کے نقلی ہونے کا شک گزرا۔ ان قدیم اور تاریخی اشیاء کی نقل بنانے میں میرا مددگار برمنگھم سے تعلق رکھنے والا ایک انگریز فنکار تھا۔ مجھے اپنے ان کارناموں پر کوئی زیادہ فخر نہیں مگر اس پیالے کے معاملے میں مجھے اپنی پوری توانائی صرف کرنا پڑی۔

اس عجائب گھر کے حفاظتی انتظامات کو جانچنے کے لیے میں دو تین دن مسلسل یہاں آتا رہا۔ اس دوران میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ جس الماری میں یہ شاہی پیالہ رکھا ہوا تھا اس کی حفاظت کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا۔ اس سہ پہر بھی میں اسی الماری کے آس پاس منڈلا رہا تھا جب میوزیم کا ایک گائیڈ، خواتین کے ایک گروپ کو اس مصری کمرے کی سیر کروا رہا تھا۔ اس نے الماری کا تالا کھولا اور اس کے اندر پیالے کے قریب رکھے ایک قیمتی ہار کو ہاتھ میں لے کر اس کی تاریخ بیان کرنے لگا کہ یہ کہاں سے، کب اور کیسے ملا۔ اس کی پشت الماری کی طرف تھی جہاں چابی الماری کے تالے کے ساتھ ہی لٹک رہی تھی۔ آپ یقیناً اس کو بہت بڑی بے احتیاطی قرار دیں گے مگر چار نوجوان اور دلکش امریکی خواتین کی موجودگی میں اس غلطی کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

میں بھی لاپروایانہ انداز میں ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ گائیڈ اپنے پیشہ ورانہ انداز میں تاریخ کو مسخ کر کے پیش کر رہا تھا جسے وہ خواتین منہ کھولے حیرت سے سن رہی تھیں۔ میں بھی کچھ دیر وہاں کھڑا اس کی بے سروپا باتیں سنتا رہا پھر میں نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موم کے ٹکڑے کو تھام لیا پھر میں آگے بڑھنے کے لیے اس کے پیچھے سے گزرا۔ مجھے جگہ دینے کے لیے وہ بولتے بولتے کچھ تھوڑا سا آگے کھسک گیا۔ مجھے بس اسی موقع کی تلاش تھی کیونکہ جب میں وہاں سے گزرا تو ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ جیب سے باہر آیا اور پھر چابی کا نقش اس موم کے ٹکڑے پر پورا پورا اتر چکا تھا۔ اس کارروائی کے دوران میں چابیاں ایک دوسرے کے ساتھ جلترنگ بجانے سے باز نہ رہیں۔ خواتین نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا مگر گائیڈ تو اپنے الفاظ کی جادوگری دکھانے میں اس قدر محو تھا کہ اس نے توجہ کرنے کی کوئی زحمت محسوس نہ کی۔

اس کے بعد میں نے کئی دن تک اس میوزیم میں رات کو پولیس والوں کی ڈیوٹی کا بغور مشاہدہ کیا کہ ان کو کیسے بدلا جاتا ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ یہ کُل تین آدمی تھے اور ہر ایک کو ایک ایک ہفتہ ذمہ داری دی جاتی تھی۔ پہلا پولیس والا جو مصری کمرے میں ڈیوٹی دیتا تھا وہ چھوٹے قد اور موٹے جسم کا تھا۔ اگلے ہفتے جس افسر کی ڈیوٹی تھی

اس کا نام اسمتھ تھا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبا آدمی تھا۔ یہ شخص میرے کام کا تھا۔ میں نے کئی روز اس کا مشاہدہ کیا اور تب ایک سہ پہر میں میوزیم میں داخل ہوا میری بکھری داڑھی، مجہول سراپا اور کھوکھلی کھانسی وہ سب ایک ڈرامے کا حصہ تھا۔ میں ٹہلتا ہوا مصری کمرے میں گیا اور یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ ممی کا وہ خاص تابوت ابھی تک اپنی جگہ خالی پڑا ہے۔

میں موقع دیکھ کر ایک تاریک کونے میں کھسک گیا اور تقریباً آدھ گھنٹے تک وہاں دبکا رہا۔ اس دوران میں میوزیم کا وقت ختم ہوگیا اور پولیس والوں نے پہرے کی ذمہ داری سنبھالنا شروع کر دی۔ ایک پولیس والا اس کمرے میں بھی آکر جائزہ لینے لگا۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ ہی نہ لے اس لیے میں کچھ گھبرا رہا تھا مگر پھر خوش قسمتی سے ایک کام میرے حق میں ہو گیا۔ سارجنٹ سیڑھیوں کے اوپر نمودار ہوا اور اس نے پکارا۔ ''رابنز ------''

رابنز اس کے حکم پر فوراً لپکا اور سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اگلے پندرہ سیکنڈز میں میرا پورا حلیہ بدل گیا۔ نقلی کھچڑی داڑھی اور مونچھیں ہٹ گئیں۔ کالا بدرنگ لباس اتر گیا اور ٹوٹے جوتے بھی کھسک گئے۔ میں نے لباس کو لپیٹا، اس کا بنڈل بنایا اور اس کو ایک بلند مجسمے کے پیچھے پھینک دیا جہاں وہ مشکل سے ہی کسی کی نظر میں آسکتا تھا۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے ربڑ کا ایک ماسک اپنے چہرے پر چڑھا دیا۔ میرے جسم پر پہلے ہی ایک حنوط شدہ ممی کی طرح پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں صرف پاؤں اور ہاتھ خالی تھے میں نے فوراً ان پر بھی پٹیاں لپیٹ لیں۔ اب میں ایک لمبی سفید مردہ ممی بن گیا تھا۔ میری کمر پر چمڑے کا ایک چھوٹا سا بیگ تھا اس کے سمیت، میں ممی کے خالی تابوت میں اتر گیا اور ایک ممی کی طرح سیدھا لیٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک پولیس والا اس کمرے میں داخل ہوا اس نے اِدھر اُدھر جھانکا اور پھر واپس چلا گیا۔ اصل مسئلہ دو گھنٹے بعد شروع ہوا جب ایک پولیس والے نے سارے کمرے کی تلاشی شروع کر دی۔ ہر کونے کھدرے کو کھنگالتا ہوا وہ اس تابوت کے قریب پہنچا جس کے اندر، میں ممی بنا لیٹا ہوا تھا تو ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا کیونکہ اس کی ٹارچ کی روشنی میرے ربڑ کے ماسک پر پڑی، ایک لمحے کے لیے رکی مگر اسے کوئی شک نہ ہوا کیونکہ میں نے جلد ہی اس کے قدموں کی آہٹ واپس جاتے ہوئے سنی۔ میں نے اس کے اوپر والے کمرے میں جانے کا انتظار کیا۔ تب میں اچھل کر اپنے تابوت سے نکلا اور سیڑھیوں کے نیچے ایک تنگ سی جگہ پر جا چھپا۔ میرے حلق سے کھانسی کی آواز بلند ہوئی۔ جسے سنتے ہی وہ محافظ تیزی کے ساتھ سیڑھیوں پر واپس آیا، پھرتی سے نیچے اترا اور بھاگتے ہوئے آدھا کمرہ پار کر لیا۔ ٹارچ روشن کی اور اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کر دیا مگر اس کا چکر پورا کرنے سے پہلے ہی میں پھرتی سے اپنی جگہ سے نکلا اور ایک پتھریلے ستون کے پیچھے جا چھپا جو کمرے کی اونچی چھت کو چھو رہا تھا۔

میں اپنے ہر قدم کی پہلے سے ہی منصوبہ بندی کر چکا تھا مگر مجھے اعتراف ہے کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ میں ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے ایک بندر کی سی مہارت سے گھومتا ہوا اس ستون کے اوپر چڑھ گیا۔ میرے چمڑے کا بیگ اب میرے دانتوں میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ میں ستون کے اوپر ٹکا تھک چکا تھا مگر ابھی ایک اور مداری کا کارنامہ میرے سامنے تھا۔

ستون کا اوپری سرا، اوپر والی گیلری کی چھت سے زیادہ دور نہ تھا جہاں سے سیڑھیاں مصری روم میں اترتی تھیں۔ یہاں دیوار میں اینٹوں کی ایک ابھری ہوئی تقریباً گیارہ انچ چوڑی قطار تھی جو پوری دیوار میں چلی گئی تھی۔ میں نے اپنا قدم ستون سے ہٹا کر ان ابھری ہوئی اینٹوں پر رکھا، جسم کو اوپر اٹھایا اور پھر ایک ہلکی سی جست لگا کر سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھام لیا۔ اگلے ہی لمحے میں سیڑھیوں کے اوپر تھا اور پھر گیلری کے اندر پہنچنے میں مجھے کوئی تاخیر نہ ہوئی۔

منصوبے کے مطابق میں نے اس کمرے کی

ساری روشنیاں گل کر دیں۔ میری چمک دار نئی چابی نے مخصوص الماری کا قفل آسانی سے ڈھونڈ لیا۔ مجھے الماری کھول کر تاریخی پیالے کو چمڑے کے بیگ میں محفوظ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس تاریخی پیالے کی ہو بہو نقل کو اپنے بیگ سے نکالا اور اسے اصل پیالے کی جگہ رکھ کر الماری کو دوبارہ تالا لگا دیا۔ اس سارے کام میں میرے چند لمحے ہی صرف ہوئے اور میں ایک کونے میں رکھے ایک بڑے سے بکسے کے پیچھے کھسک گیا۔

اسی وقت سارجنٹ تیزی سے بھاگتا ہوا نیچے والے کمرے میں پہنچا۔ کانسٹیبل اسمتھ اسی کمرے میں تھا۔ چند لمحے ان کی تیز تیز گفت گو سنائی دیتی رہی پھر اس کے بعد گیلری کی روشنیاں جل اٹھیں اور سیٹیاں بجنے لگیں مجھے ان سے اسی کام کی توقع تھی۔ کانسٹیبل اسمتھ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ گیلری میں داخل ہوا وہ اس کمرے کی روشنیاں بند ہونے پر حیران زدہ تھا۔ مجھے کانسٹیبل اسمتھ پر افسوس ہو رہا تھا مگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے مجھے یہ کام کرنا ہی تھا۔

جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گربہ پا اس کے پیچھے لپکا۔ میرے پاؤں پر لینن کی باریک پٹیاں لپٹی تھیں اس لیے چوبی فرش پر کوئی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں کلوروفارم میں تر ایک رومال تھا۔ میں نے عقب سے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر گھٹنا مارا اور ہاتھ کو پیچھے کی طرف ایک خاص انداز میں مروڑا۔ وہ ایک مضبوط آدمی تھا اس نے اپنے ان دیکھے مخالف کے سامنے بھرپور مزاحمت کی مگر میں نے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد جماتے ہوئے اس کو پیچھے کی طرف کھینچا اور کلوروفارم میں تر رومال اس کی ناک پر جما دیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ بے ہوش ہو کر میری بانہوں میں جھول گیا۔ اب مجھے سارجنٹ کے اوپر آنے سے پہلے سارا کام مکمل کرنا تھا جس کے لیے میں مکمل تیار تھا۔ میں نے کانسٹیبل اسمتھ کا دبلا پتلا جسم مضبوطی سے ایک رسی کی مدد سے باندھ دیا اور گھسیٹ کر ایک شیشے کے دروازے کے پیچھے ڈال دیا۔ مگر اس سے پہلے میں اس کے جسم سے پولیس کی یونیفارم اتارنا نہیں بھولا جسے میں نے جلد ہی اپنے جسم کی زینت بنا لیا۔ اس کے بعد سارا کام آسان اور میرے منصوبے کے مطابق تھا۔

ممی کی پٹیاں میں نے لپیٹ کر چمڑے کے تھیلے میں ٹھونس لی تھی پھر میں باقی پولیس والوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ صبح چھ بجے کے قریب اسمتھ بے چارے نے کسمسانا شروع کر دیا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب اسے اگلے کئی گھنٹے تک خاموش کرنے کے لیے دوائی کی دوسری خوراک کی ضرورت تھی جو میں نے اسے دے دی۔ صبح پولیس کے دوسرے عملے کے ساتھ میں باہر نکل گیا۔

وہ تاریخی پیالہ میرے بیگ کے اندر موجود تھا جو میرے کوٹ کے نیچے میری کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔ آگے قصہ مختصر ------ سراغ رساں اس چوری کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر میں اپنے پیچھے کوئی سراغ چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔

اب میرے منصوبے کا اگلا مرحلہ اس پیالے کی واپسی کا تھا۔ میں ہمیشہ اپنا ''شکار'' اسی میوزیم کو فروخت کیا کرتا تھا جہاں سے شکار کرتا تھا کیونکہ وہی مجھے اس کی اچھی فیس ادا کر سکتے تھے اور وہی اس کے اصل گاہک ہوتے تھے۔ اپنی خفت مٹانے اور اپنی چیز کو واپس لینے کے لیے وہ کوئی بھی رقم ادا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ یہاں بھی چند دن جب وہ دیواروں سے سر ٹکرانے کے بعد بے بس ہو گئے تو میں نے اپنی فیس اور شرائط ان کے سامنے رکھ دیں اور بتایا کہ اگر انہوں نے فوراً جواب نہ دیا تو میں یہ پیالہ کسی اور میوزیم کو فروخت کر دوں گا۔ انہوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ایک معقول رقم کے بدلے پیالہ صرف اپنی جگہ واپس رکھ دینے سے معاملہ حل ہو سکتا تھا اور میوزیم کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال ہو سکتی تھی تو یہ سودا مہنگا نہیں تھا اور انہوں نے میرے ساتھ سودا کر کے یہ معاملہ حل کر لیا۔

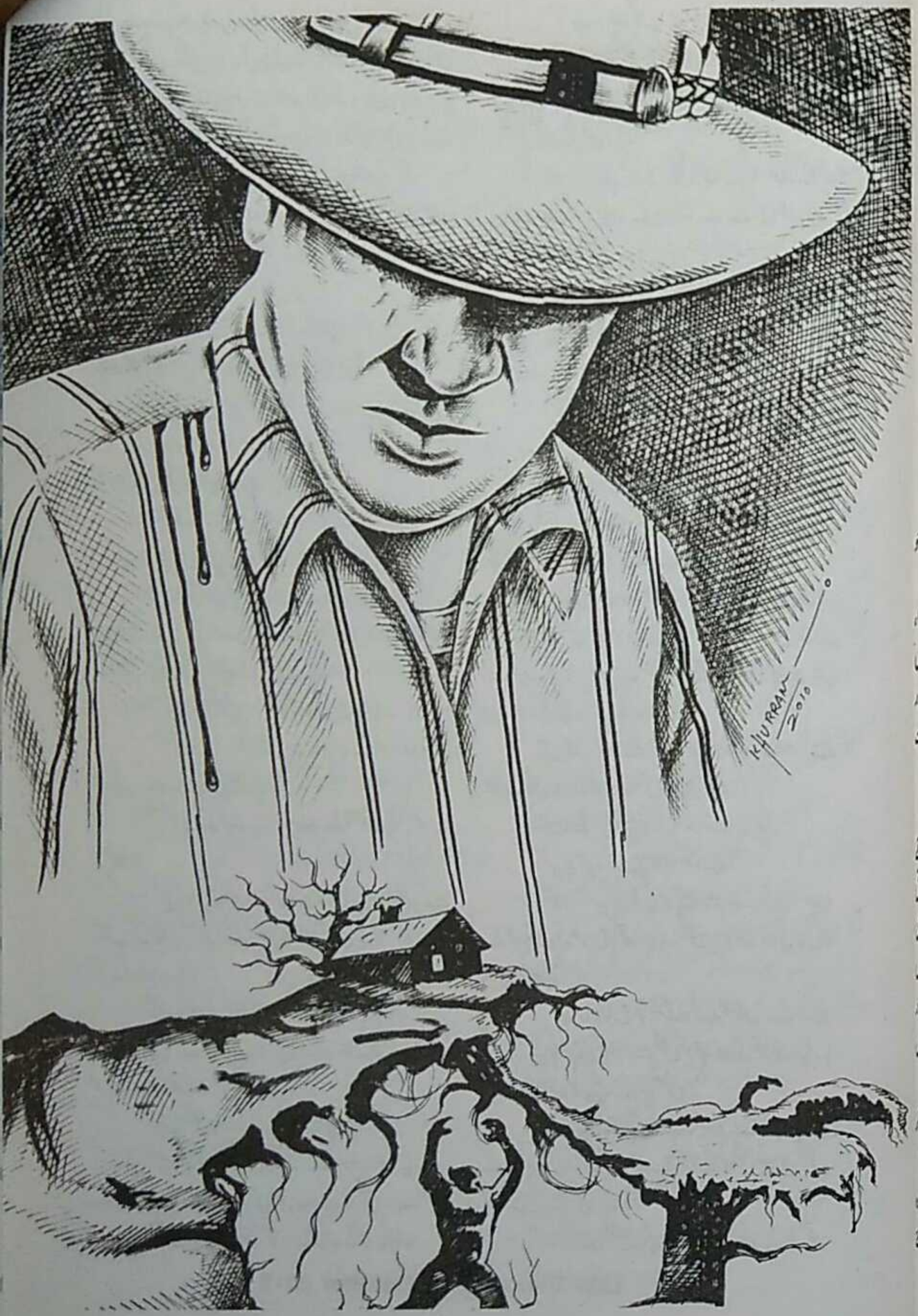

جان لیوا

قسط نمبر:8

راشد نذیر طاہر

برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کرکے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دھشت طاری کرتی کھانی۔

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں اور سدو بے اختیار اس ''کوہ آشیاں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس عمارت پر دن کے وقت بھی بدروحیں منڈلا رہی ہوں۔ کچھ ایسا ہی تاثر ابھر رہا تھا۔

اس کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے کے اوپری جانب روشن دان بھی موجود تھا۔

''یہ جگہ کتنی ویران لگ رہی ہے۔'' سدو بڑ بڑایا۔ ''جیسے کوئی قبرستان ہو۔''

''ہاں..... !!'' بالے نے کہا۔ ''جو شے اس میں رہتی ہے اسے ویرانی پسند ہے۔ چلو'' میں نے کہا اندر چلتے ہیں۔

بالے قدرے ہچکچایا تھا لیکن میرے اٹھتے ہوئے قدموں نے اسے بھی آگے بڑھنے پر مجبور کردیا۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ایسا لگا جیسے کسی بند مقبرے میں آگئے ہوں۔ چھوٹی سی راہداری تھی۔ جس سے گزارنے کے بعد دائیں اور بائیں جانب 2 کمرے موجود تھے۔ اسی رو میں سامنے کی جانب رسوئی کے ساتھ حاجت روائی کا بھی معقول انتظام موجود تھا۔

''کافی پرانی ہے یہ عمارت.....!'' میں نے پوچھا۔

اور پھر مجھے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ جو کہ کافی بلند اور تیز تھی۔ میں خود حیران رہ گیا۔

''ہاں سردار.....'' بالے آہستہ سے بولا تھا لیکن اس کی آواز بھی گونج کر رہ گئی۔ ''کسی زمانے میں یہاں انگریزوں کا قبضہ تھا۔ وہ اس جگہ کو سرحد کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اسی دوران یہ عمارت بنائی گئی تھی۔''

''خوب.....'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں سردار..... لیکن پھر ایک ہندو راجہ نے انگریزوں کو یہاں سے مار بھگایا اور پھر اس راجہ نے کافی عرصے تک اپنی فوج کے ساتھ یہاں قیام کیا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ ان لوگوں نے ان اطراف میں باقاعدہ گاؤں بسا رکھا تھا۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اجڑ گیا۔ اور چاروں طرف خاک اڑنے لگی۔ وہ راجہ اسی عمارت میں ایک دن پراسرار موت کا شکار ہوگیا۔''

''پراسرار موت.....؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں..... یہ بات مشہور ہے کہ ایک دن وہ رات میں سویا اور پھر اسے صبح دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اسے

دلیر، بارعب اور نڈر انسان کی یہ اچانک موت کسی کو ہضم نہ ہوسکی تھی۔ لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت تھی۔ اور پھر اس راجہ کی موت کے کچھ عرصے بعد راجہ کے باقی ماندہ گروہ نے وہاں سے نقل مکانی کرلی اور کسی اور شہر میں جا بسے، سنا ہے کہ اسی راجہ کی روح یہاں بھٹکتی ہے اور.....''

بالے کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ عین اسی وقت ایک زور دار دھماکہ ہوا، اور عمارت کا صدر دروازہ بند ہوگیا۔

بالے کے ساتھ ساتھ سدو کا چہرہ بھی فق ہوگیا۔ خود میں بھی اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا تھا۔

''یہ.....کیا ہوا.....؟؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''دروازہ بند ہوا ہے سردار.....!!'' بالے کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

''اوہ.....تو کیا باہر ہوا تیز ہے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

بالے کی سٹی گم تھی، اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا، میں نے جھٹ سے قدم آگے بڑھائے اور دروازے کو پکڑ کر کھینچا، وہ کھل نہ سکا۔

''کیا ہوا شکیل.....؟'' سدو نے پکارا۔

''انہونی.....!! میں بڑبڑایا۔ دروازہ دوسری طرف سے بند کیا جاچکا ہے۔''

''کس نے کیا ہے؟'' سدو نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

''یہ دوسری طرف سے بند ہوا ہے، ادھر سے نہیں کہ میں تمہیں بتا سکوں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اب کیا کریں.....؟'' سدو نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے بالے کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں بھئی بالے اب کیا کرنا چاہیے؟''

''میری تو خود عقل دنگ ہے سردار.....'' بالے نے جواب دیا۔ یہ حرکت اسی عفریت کی ہوسکتی ہے۔''

''یعنی شامور کی؟'' میں نے بالے کو دیکھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہے سردار..... بھلا شامور کا اس عفریت سے کیا تعلق؟'' میں جلد ہی ثابت کردوں گا۔ میرا جواب تھا۔ ''فی الحال تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں آؤ۔''

دروازے پہ زور آزمائی کرنا بے کار تھا۔ کیونکہ اس کا دروزہ کسی قلعے کے دروازے سے کسی طور بھ کم نہیں تھا۔

میں ان دونوں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ لیکن کہیں بھی نہ کوئی دروازہ تھا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ تھی کہ جہاں سے کود کر نکلا جاسکتے۔

کسی حویلی کی طرز پر بنے ہوئے پتھروں کا یہ گھر دوسرے الفاظ میں زندان تھا۔

مین کچھ سوچ کر باتھ روم میں جا گھسا۔ یہ بھی چاروں طرف سے بند دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اس کے سامنے والی دیوار پر ایک عجیب سی چیز دکھائی دی۔

یہ ایک چوکور سا خانہ تھا۔ جو دیوار میں فٹ تھا اور اس کی شکل کسی چوکور خانے کی طرح تھی۔ اسی خانے سے ایک لوہے کا پائپ نکل کر باتھ روم کی چھت میں جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میں کافی غور سے اس پائپ کو دیکھتا رہا، میرے عقب میں بالے اور سدو بھی آچکے تھے۔

میں نے بے خیالی میں سدو سے پوچھا۔

''یہ پائپ کس چیز کا ہوسکتا ہے؟''

''لو.....یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ سدو نے عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔ بھئی یہ باتھ روم کی نالی کا پائپ ہے۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ میں نے اسے گھورا۔ یہ پائپ دیوار سے نکل کر چھت کی طرف جارہا ہے۔ بھلا اس کا نیچے سے کیا تعلق۔''

''ہاں یہ بات بھی ہے۔ سدو نے بے چارگی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' واقعی میری عقل گھانس چرنے گئی ہے۔''

''حالانکہ وہ تمہیں چرنی چاہیے۔ خیر بالے کچھ

تمہاری سمجھ میں آرہا ہے۔''

''نہیں سردار۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ میرا ذہن تو دروازے کی طرف ہی لگا ہوا ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ وہ کھل جائے گا۔ میں نے اعتماد سے کہا تھا۔ میں ذرا اس پائپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کے خیال میں یہ کس چیز کا پائپ ہے؟'' بالے نے پوچھا۔

''میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ لیکن میں اسے کھول کر ضرور دیکھوں گا۔''

وہ پائپ کافی اونچا تھا۔ میں نے سدو کی طرف دیکھا۔

''جاؤ سدو.....میں نے کمرے میں اسٹول رکھا ہوا دیکھا ہے وہ اٹھا کر لے آؤ۔''

''ارے باپ رے سدو اچھل پڑا۔'' میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ سامنے ہی دروازہ ہے۔ اگر وہ اچانک ہی کھل گیا تو۔ تمہاری روح فنا ہوجائے گی۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''بالے تم چلے جاؤ اس کے ساتھ۔''

''جو حکم سردار۔ بالے نے بھی گویا بادل نخواستہ کہا تھا۔ میں بے ساختہ ہنس پڑا اور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔''

''ارے نہیں سردار.....'' بالے جلدی سے باہر نکلا تھا۔ ''میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

ساتھ ہی اس نے سدو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ گویا وہ بھی اکیلے جانے سے گریز کررہا تھا۔

میں ایک بار پھر مسکرا دیا۔ جلد ہی ان دونوں کی واپسی ہوگئی بالے نے اسٹول سنبھالا ہوا تھا۔

اس نے اسٹول میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں بڑی وحشت ہے سردار۔ اگر یہ دروازہ نہ کھلا اور رات یہاں گزارنی پڑی تو کیا ہوگا۔؟''

میں نے اس کی آواز میں خوف کا عنصر محسوس کیا تھا۔ اب میں سدو کی طرف گھوما تو اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔

تم دونوں پاگل ہو میں کہہ کر اسٹول پر چڑھ گیا۔

اب وہ چوکور خانہ مجھے صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔

میں نے اسے چاروں طرف سے ٹٹول کر دیکھا اور پھر یک بیک اس کا ایک حصہ کھل گیا۔

یہ پائپ اب واضح طور پر سامنے والی دیوار میں جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اور پھر مجھے اس پائپ پر لگا ہوا ایک لاک صاف دکھائی دیا۔

یہ چابی نما لاک تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر لاک کو گھما دیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کانوں سے ایک مانوس سی آواز ٹکرائی ان دونوں کے ساتھ ساتھ میں بھی چونک اٹھا، کیونکہ یہ وہی آواز تھی۔ جو بستی میں رات کے سناٹے میں گونجتی تھی۔

یہ آواز جو اس وقت کافی دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس وقت بند جگہ پر موجود تھا۔

میں نے چابی والے لاک کو دوبارہ گھما دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ پراسرار آواز آنا بند ہوگئی۔

بالے اور سدو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں نہ جانے کن سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔

پھر سدو کی آواز نے مجھے چونکایا تھا۔

''شکیل.....یہ سب کیا ہے.....؟ یہ تو وہی آواز ہے جو کسی کی موت کی نشانی ثابت ہوتی ہے۔''

''ہاں وہی آواز ہے۔ میں نے سر ہلا کر تائید کی۔ لیکن فی الحال کسی کی موت متوقع نہیں ہے۔ کیونکہ مارنے والا یہاں موجود نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ دونوں چونک کر ایک ساتھ بولے تھے۔

''مطلب تو ابھی مجھ پر واضح نہیں ہوا۔'' میں نے کندھے اچکائے اور پھر اسٹول سے نیچے اتر آیا۔

''اب کیا ارادہ ہے سردار جی کا.....؟'' سدو نے بڑے ادب سے پوچھا تھا۔

میری ہنسی نکل گئی تھی۔ وہ منہ بنا کر بولا۔

"اڑا لو مذاق بیٹا اگر یہاں رات ہوگئی تو پھر پوچھوں گا تم سے۔"

"رات تک تو پتا نہیں کیا کیا ہو جائے گا سدو۔" میں آہستہ سے بولا۔ "کیونکہ رات ابھی بہت دور ہے۔"

پھر میں باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔

"کیا ارادے ہیں استاد جی....." سدو نے ہانک لگائی۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر ہی دروازے کے قریب آ کھڑا ہوا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ تو واقعی دوسری طرف سے بند ہو گیا ہے۔" میں بڑبڑایا۔

"اور یہ تو ممکن بھی نہیں ہے کہ دروازہ کھل سکے۔ بالے نے پیچھے سے لقمہ دیا۔ میں نے گھوم کر بے خیالی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا۔

"میں..... کوشش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ذرا پیچھے ہٹا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر زوردار انداز میں کندھا مارا۔

"ارے..... ارے....." وہ دونوں بول اٹھے اور میری طرف لپکے لیکن مجھے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ دروازہ ضرور اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ سدو کے ساتھ ساتھ بالے کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، شاید انہیں اس مضبوط اور دیوہیکل دروزے کے ٹس سے مس ہونے کی رتی برابر بھی امید نہیں تھی۔

میں نے دوسری ضرب لگائی تو اس بار دروازے کے قبضے اکھڑ گئے، تیسری ضرب میں دیوہیکل دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دوسری طرف جا گرا۔

"کمال ہے سردار..... بالے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آپ تو انسان ہی معلوم نہیں ہوتے۔"

"تو کیا میں جانور ہوں؟" میں نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"ارے میری توبہ....." بالے نے گال پیٹے۔ "میری کیا مجال کہ ایسا کچھ سوچوں بھی۔"

"تم نے ابھی خود ہی تو بولا ہے کہ میں تمہیں انسان نہیں لگتا۔" میں مسکرایا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ۔"

"اچھا چھوڑو۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔ اب میری بات غور سے سنو۔ اس دروازے کو اسی طرح اٹھا کر لگانا ہے۔ اور کچھ اس طرح کہ اندازہ ہی نہ ہو کہ اسے توڑا جا چکا ہے۔"

"اچھا سردار۔"

پھر ہم تینوں نے دروازے کو اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے سردار۔؟"

"سامنے چلو۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ دیکھو ڈھلان کی طرف جو درخت موجود ہے ہمیں ان میں چھپ کر انتظار کرنا ہوگا۔"

"کس کا انتظار؟" بالے نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بے وقوف جس نے ہمیں یہاں بند کیا ہے۔ وہ ضرور یہاں آئے گا۔"

"اوہ..... ہاں..... بالے نے چونک کر کہا۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"تم بادام کھایا کرو۔" سدو نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

جلد ہی ہم تینوں اسی گھنے درخت کی آڑ میں چھپ گئے شام ڈھل رہی تھی اور اب رات کا جھٹپٹا چاروں طرف پھیلنے کی تیاری میں مصروف تھا۔

ابھی رات پوری طرح پھیلی بھی نہیں تھی کہ اچانک ہی ایک سایہ نمودار ہوا اور نپے تلے قدموں سے عمارت کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

میں نے ان دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر خود وہاں سے نکل آیا۔

میرا رخ سامنے کی طرف تھا۔ جلد ہی یہ فاصلہ

آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔

میں نے سائے کے قریب پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

یوں لگا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ اچھل کر پلٹا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"سردار..... ت..... تم"

"ہاں شامور....." میری مسکراہٹ یقیناً شاندار تھی۔ "تمہیں حیرت ہوگی کہ میں عمارت سے باہر کیسے نکل آیا۔ کیوں؟"

شامور کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی گردن جھک گئی تھی۔

اتنی دیر میں بالے اور سدو بھی وہیں آ گئے۔

"یہ..... یہ تو واقعی شامور ہے..... بالے کے منہ سے نکلا۔ تم واقعی بہت عقل مند اور عظیم ہو سردار۔"

دوسرا جملہ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

میں تو اب شامور کو دیکھ رہا تھا۔

"شامور اب جلدی سے بتا دو کہ یہ سب کیا چکر ہے؟ تم یہاں لا کر لوگوں کی جان کیوں لیتے ہو.....؟ تم انہیں کس طرح مارتے ہو کہ مرنے والوں کے جسموں پر کوئی نشان نہیں ہوتا۔"

شامور کا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔ وہ جیسے پتھر کا بت ہی بن گیا تھا۔

"بولو شامور....." اس بار میرا لہجہ سخت تھا۔ جلدی سے سب کچھ اگل دو۔ ورنہ میں تمہیں ننگا کر کے یہاں سے مارتا ہوا بستی لے جاؤں گا۔"

"ٹھہرو..... رکو..... دفعتاً شامور نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس وقت میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔ کیا میں جیب سے دوا نکال کر کھا سکتا ہوں.....؟"

"تم سانپ سے زیادہ خطرناک ہو شامور..... بالے بول اٹھا۔ اگر تم نے جیب سے کوئی خطرناک چیز نکال لی تو کیا ہوگا؟"

"میرے پاس اس دوا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔" شامور نے جواب دیا۔ "چلو تم اپنے ہاتھ سے نکال کر مجھے دے دو۔"

"میں یہی کروں گا۔"

یہ کہہ کر بالے نے آگے بڑھ کر اس کی جیب ٹٹولی اور پھر ایک چھوٹی سی پڑیا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

شامور نے پڑیا کھولی اور پھر اسے منہ کی طرف لے جا کر خالی کر دی۔

پڑیا کو ہوا میں لہرا کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

"لو..... میں نے تم لوگوں کو ایک اور شکست دے دی۔ اب تم لوگ کبھی یہ نہیں جان سکو گے کہ میں لوگوں کی جان کیوں لیتا تھا۔ کیونکہ میں خود اس دنیا سے جا رہا ہوں۔ اس پڑیا میں زہر تھا۔ انتہائی خطرناک زہر..... ہاہا..... ہاہا....."

خود میں بھی بوکھلا اٹھا تھا، کیونکہ شامور دیوانہ وار ہنستے ہنستے زمین پر گرا اور گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا، لیکن زہر نے لپک جھپکتے ہوئے اپنا کام دکھایا تھا۔ شامور کا جسم مردہ ہو چکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

میرے ساتھ وہ دونوں بھی پتھر کے بتوں کی طرح شامور کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

نیلگوں رنگ کا سیال سا تھا جو شامور کے منہ سے جھاگ کی طرح نکلا تھا اور پھر یہ جھاگ بھی زمین میں جذب ہو گیا۔

شامور کی لاش آنکھوں کے سامنے تھی۔ جسم کے کسی بھی حصے کو دیکھ کر یہ تاثر نہیں ملتا تھا کہ موت کس طرح واقع ہو گئی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ شامور نے ہمارے ہی سامنے زہر کھایا تھا اور پھر آناً فاناً ہی اس نے دم توڑ دیا۔ اگر اس نے ہمارے سامنے زہر کی پڑیا منہ میں نہ ڈالی ہوتی تو بڑے میدان میں ملنے والی لاشوں کی طرح اس کی لاش بھی معمہ بنی رہتی۔

کچھ باتوں کا جواب شامور نے خود ہی دے دیا

تھا، اور بہت سی باتوں کو سوالیہ ہی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔

یہ بات تو اب یقینی تھی کہ بڑے میدان سے ملنے والی لاشوں میں شامور کا ہی ہاتھ تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا تھا.....؟ اس کی کیا وجہ تھی.....؟

''یہ..... یہ سب کیا ہے سردار.....؟'' کافی دیر بعد بالے کی کھوئی کھوئی سی آواز گونجی۔

''میری عقل خود کام نہیں کر رہی۔'' میں بڑبڑایا تھا۔ ''رات کو بستی میں گونجنے والی آواز کا راز تو کھل چکا ہے۔ دراصل اس پائپ کے ذریعے جب پہاڑوں سے آنے والی ہوا گزر کر اوپر کی طرف نکلتی ہے تو اس کے ارتعاش اور دباؤ کی بناء پر وہ آواز خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے عورتیں بین کر رہی ہیں۔ شامور کو اس کے بارے میں پوری معلومات تھی۔ لیکن اب یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ یہ لوگوں کو موت کے گھاٹ کیوں اتارتا تھا اور یہ زہر اس کے ہاتھ کہاں سے لگا۔''

''کافی پراسرار شامور.....'' سدو بول اٹھا۔ اور کافی گہری شخصیت کا مالک بھی تھا۔

''ایک بات بتاؤ بالے۔ میں اچانک ہی بالے کی طرف گھوما تھا۔

''حکم سردار۔''

''کیا شامور شروع سے ہی تمہاری بستی کا باشندہ ہے؟''

''نہیں سردار.....'' بالے نے جلدی سے کہا۔'' یہ بے یار و مددگار یہاں آیا تھا اور سردار نے ترس کھا کر اسے اپنی خدمت گزاری کے لئے رکھ لیا تھا۔ اور پھر کئی سالوں سے اسی بستی میں رہ رہا تھا۔''

''ہوں.....'' میں گہری سوچ میں ڈوب کر بولا۔ ''خیر فی الحال تو اس کی لاش کو دفنانے کے انتظام کرو۔ یہ معاملہ بھی دیکھتے ہیں۔ فی الحال تو شامور نے ہمیں اندھیرے میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اگر یہ زندہ ہوتا تو ضرور کئی راز کھل سکتے تھے۔ لیکن اس نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔ اب سوچنا پڑے گا کہ شامور کے ساتھ ساتھ ان لاشوں کا کیا مقصد تھا؟ اگر شامور نے ہی ان سب کو قتل کیا تھا، تو اس کی وجہ کیا تھی.....؟ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ سب کچھ کوئی گہرا چکر تھا۔ اور میں اس راز سے پردہ ضرور ہٹاؤں گا.....''

☆.....☆.....☆

شامور کی آخری رسومات میں تقریباً بستی کا ہر فرد شریک تھا۔ خاص طور پر سابقہ سردار روکا فی نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا طلب یہ تھا کہ اسے شامور سے دلی لگاؤ تھا، اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے خادم خاص کی موت پر بے حد مضموم ہے۔

ابھی تک شامور کے متعلق کسی کو بھی اصل حقائق کا علم نہیں تھا۔ میں نے بالے کو خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھے۔

بستی والوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ شامور کی لاش شام کے وقت بڑے میدان سے ملی ہے۔

''اوہ.....!'' کسی نے کہا تھا۔ ''تو اس بار بے چارہ شامور اس کا نشانہ بنا ہے۔ کیونکہ آج ہم لوگوں نے دن کے وقت وہ جان لیوا آواز سنی تھی۔ جو کہ آدھی رات کو سنائی دیتی ہے۔''

''جان لیوا.....؟'' میرے منہ سے بڑبڑاہٹ کے انداز میں نکلا۔

کتنے عرصے بعد یہ لفظ سماعت سے ٹکرایا تھا..... ہاں.....! میں کچھ اس قسم کے معاملات میں الجھا ہوا تھا کہ جان لیوا ذہن سے ہی محو ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ اب کہاں تھا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے جیل کی قید میں ڈلوا دینے کے بعد اس کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو اور اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔

''کیا ہوا استاد جی..... سدو نے مجھے غیر محسوس طور پر ٹہوکا دیا۔ کہاں کھو گئے ہو.....؟''

''آں..... میں چونکا۔ نن..... نہیں..... میں تو

بس یونہی کچھ سوچ رہا تھا ہاں۔''

☆.....☆.....☆

شامور کے معاملے سے فی الحال درکنار ہونا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ بستی والوں کی نقل مکانی کا بھی مسئلہ در پیش تھا۔

میں نے شامور کی رسومات سے فارغ ہونے کے بعد جبران سے فوری طور پر رابطہ کیا تھا۔

''ہیلو..... شکیل احمد آقال اسپیکنگ ..... اوور.....!!''

''ہاں شکیل..... بولو..... اوور.....'' جلد ہی جبران کی آواز ابھری تھی۔

''بستی والوں کا کیا کرنا ہے؟''

''کیا مطلب.....؟''

''بھئی میں انہیں نقل مکانی کا راگ پاٹ دے چکا ہوں۔ اور اب یہ ضروری ہے کہ ان کا دوسرا انتظام کیا جائے۔''

''ہاں بالکل..... جبران کی آواز آئی۔ میں دراصل اسی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ آج ہی سہ پہر کے وقت چند ماہرین وہاں آئیں گے۔ جو اس علاقے کا نقشہ تیار کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ اسی ہفتے میں ان لوگوں کے لئے نئی بستی کی تعمیر کا آغاز ہو جائے گا۔ جس میں ان لوگوں کو بہتر سے بہتر سہولت ملے گی۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب.....؟ کس بات کا یقین نہیں آ رہا۔''

''یہی کہ بستی والوں کو واقعی ایک الگ علاقہ تعمیر کروا کے دیا جائے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ..... ہاں..... یقین تو واقعی نہیں ہونا چاہئے۔ جبران شاید ہنسا تھا۔ لیکن یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ یہ سب کرنا ضروری ہے۔ تاکہ ہمارا راستہ کھل سکے۔ میں نے تو تمہارا مطالبہ صرف آگے ریفر کیا تھا۔ اور اس کا حیرت انگیز طور پر ردِعمل آیا تھا۔ چنانچہ حکومتی سطح پر فوری طور پر یہ کام ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل مشینری وغیرہ بھی پہنچ جائے گی۔''

''اوہ.....!''

''ہاں..... کیونکہ خود اوپری سطح کے افسران یہ چاہتے ہیں کہ بستی جلد سے جلد خالی ہو تاکہ وہاں کام شروع ہو سکے۔''

''وہاں کیا کام ہوگا؟''

''یہ میں اسی وقت بتاؤں گا۔ جب بستی خالی ہو گی۔ ورنہ مزا نہیں آئے گا۔''

''اچھا۔ آپ کی مرضی۔''

''چلو تم نے یہ مشن تو خوش اسلوبی سے نمٹا ہی لیا۔ اب آگے کیا ارادہ ہے؟'' جبران کی آواز میں بے تکلفی تھی۔

''ارادہ..... مطلب؟''

''اوہو..... کیا اب وہیں رہنے کا پروگرام ہے؟''

''تو کیا آپ مجھے دوبارہ جیل میں بند کرنے کے لئے بے چین ہیں؟'' میں ہنسا۔

''بالکل.....'' جبران بولا۔ ''تو کیا تمہارے بدلے کی سزا میں بھگتوں گا؟'' جبران نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں جناب..... میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن.....!''

''لیکن کیا.....؟''

''ایک مسئلہ در پیش ہے یہاں..... اسے حل کرنے کے لئے تھوڑی سی مہلت درکار ہے مجھے.....''

''کیا مسئلہ.....؟''

''تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دراصل یہاں ایک آدمی نے خودکشی کر لی ہے۔ اور میں اس خودکشی کا راز جاننا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا اب تم مردوں سے بھی باتیں کرنے لگے ہو؟'' جبران کے لہجے میں حیرت تھی۔ یار تمہارے تو نئے نئے فن سامنے آ رہے ہیں!''

''ارے ایسی کوئی بات نہیں جناب..... میں ہنس پڑا۔ دراصل مجھے مرنے والے کے متعلق چھان

بین کرنی ہوگی۔ اور پھر اصل بات کی تہہ تک پہنچنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"خیر..... میں تو تمہیں اس لئے بلا رہا تھا کہ تمہیں کچھ دن آرام کراؤں۔ کیونکہ یہ مشن بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ خیر اب تمہاری مرضی ہے، جب فارغ ہو جاؤ تو بتا دینا میں تمہیں وہاں سے بلوا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب.....!!"

"اوراینڈ آل.....!!"

اس کے ساتھ ہی ٹرانس میٹر آف ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کے بعد واقعی ایک ٹیم وہاں آن پہنچی تھی۔ اور پھر بستی سے کافی دور انہوں نے اس جگہ کی پیمائش وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے بالے نے دی تھی۔

"چلو اچھا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ورنہ بستی والوں کے دل میں شک ہی رہتا کہ میں ان سے بہانہ تو نہیں تراش رہا۔

"لیکن مجھے آپ کی بات پر مکمل بھروسہ تھا۔ بالے فوراً بولا۔ اور میں جانتا تھا کہ آپ اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔"

"اچھا اب زیادہ مکھن مت لگاؤ مجھے۔ میں نے اسے ٹوک دیا۔ میں اب ایسی بات کرنے والا ہوں کہ تمہارا دم خشک ہو جائے گا ہاں۔"

"کیسی بات سردار.....؟ حکم کرو۔" بالے تو گردن بھی کٹوا دے گا تمہارے واسطے۔"

"نہیں گردن کا میں کیا کروں گا۔؟" میں فوراً بولا۔ "مجھے تو تمہارا ساتھ درکار ہے۔"

"ساتھ.....؟"

"ہاں بالے....." میں ڈرامائی انداز میں بولا۔ "کیونکہ آج رات میں ایک بار پھر اسی پراسرار عمارت میں جانا چاہتا ہوں۔ اور میرے ساتھ سدو کے علاوہ تم بھی ہو گے۔"

رات کا وہ سناٹا کافی پر ہول تھا۔ جو اس تاریک رات کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت آدھا چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں کہیں جو سویا تھا۔

بالے کے پاس اگر ٹارچ نہ ہوتی۔ تو شاید کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

میرے ساتھ اس کے علاوہ سدو بھی تھا۔ اور ہم تینوں کالے سیاہ پہاڑوں کے درمیان پہنچ چکے تھے۔

ایسے میں بالے نے پوچھا۔

"سردار..... آپ دن کے وقت کیوں نہیں آئے ادھر.....؟"

"ہاں بتا دو سردار..... سدو بول پڑا۔ دم نکلا جا رہا ہے بے چارے کا۔"

میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا، اور پھر بالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بات یہ ہے بالے کہ اب ڈر و خوف کی کوئی بات نہیں رہی۔ جو کچھ یہاں ہو رہا تھا وہ صرف اور صرف شامور کی اپنی اختراع تھی۔ ورنہ وہ یہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش میں ہوں کہ آخر وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا۔ اس نے درجنوں لوگوں کی جان کیوں لی۔ وہ زہر اس کے پاس کہاں سے آیا۔ رات میں ذرا سکون ہوتا ہے۔ میں ذرا تفصیل سے اس عمارت کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

"تو آپ دن کے وقت بھی معلوم کر سکتے تھے یہ سب۔" بالے نے اعتراض کیا۔

"نہیں بالے..... میں نے نفی میں سر ہلایا۔ دن کے وقت بستی میں ہماری غیر موجودگی سوالیہ نشان بن جاتی، اور کوئی ہماری ٹوہ لے کر یہاں آ سکتا تھا، جبکہ میں نہیں چاہتا کہ ابھی کسی کو ادھر کی سن گن ہو۔"

"آپ دور اندیش ہو سردار.....!!" بالے نے طویل سانس لی۔ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"بھئی کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ سدو نے اسے گھورا۔ تمہارا منہ ہے۔ کسی کے باپ کا ہرگز نہیں ہے۔"

بالے صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔ میں یہ بتانا

ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں یہاں کافی انتظام سے آیا تھا۔ کچھ ضروری سامان کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہمراہ تھیں۔ کم از کم رات کا یہ حصہ تو اب یہاں گزارنا ہی تھا۔ یوں بھی اگر چیزیں ساتھ نہ لاتے تو شاید کسی بھی چیز کی غیر موجودگی میں بھوک لگ جانے کا خطرہ موجود تھا۔

لہٰذا میں نے اسی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے لیا تھا۔

جلد ہی ہم تینوں عمارت کے صدر دروازے کے سامنے موجود تھے، میں نے اسے ہاتھ سے باہر کھینچا۔ چرچراہٹ کی گونج کے ساتھ وہ کھلتا چلا گیا۔

اندر حسب روایت اندھیرے کا راج تھا۔ بالے کے ہاتھ میں کیروسین لیمپ موجود تھا۔ اندر کئی مقامات پر پرانے زمانے کے چراغوں کا انتظام موجود تھا۔ جو کسی خاص چربی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی روشنی کافی تیز اور مسلسل برقرار رہنے والی تھی، چنانچہ بالے اور سدو نے مل کر ماچس کی مدد سے عمارت کو روشن کر دیا۔

اگر ان چراغوں کو قندیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے کئی پرانی فلموں میں اس ٹائپ کی مشعلیں دیکھی تھیں۔

پھر ہم ایک کمرے میں موجود مسہری پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں خاموشی سے میری شکل تک رہے تھے۔

"اب کیا پروگرام ہے سردار.....؟" تھوڑی دیر بعد سدو کراہ کر بولا۔

"دم کیوں نکل رہا ہے۔ میں بولا۔ کام شروع کرتے ہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔"

"شامور نے خود تو اپنی جان چھڑا لی اور ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ سدو برا سا منہ بنا کر بولا تھا۔

"شاید میں آہستہ سے بولا۔" اگر وہ مرتا نہیں تو میں واقعی اس وقت یہاں نہ ہوتا۔ کیا تم میں سے کسی کو بھوک لگ رہی ہے۔"

"نہیں دونوں یک زبان ہو کر بولے تھے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"ٹھیک ہے تو پھر تیار ہو جاؤ۔ میں اس عمارت کا ایک شان دار معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ دونوں کمرے بالکل خالی نہیں تھے۔ ان میں پرانا فرنیچر موجود تھا۔ جسے کاٹھ کباڑ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ البتہ ایک اور کمرے میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ یقیناً اس کی تازگی بتا رہی تھی کہ یہ شامور کے استعمال میں رہا ہوگا۔ یہ اندازہ لگانا تو کافی مشکل تھا کہ شامور یہاں کتنا وقت لگاتا ہوگا۔ لیکن یہ بات بے یقینی تھی کہ یہاں وہ یقیناً قیام کرتا ہوگا۔ کیونکہ میں نے یہاں اس کے استعمال کی چند مخصوص چیزیں دیکھی تھیں۔ جنہیں میں نے اکثر اس کے پاس دیکھتا تھا۔ خاص طور پر اس کے استعمال کے کپڑے میں نے پہچان لئے تھے۔ اس کمرے میں باقاعدہ پلنگ بھی موجود تھا۔

اسی کمرے کے ایک کونے میں مجھے مٹی کے برتن رکھے ہوئے دکھائی دئے۔ خدا کو معلوم ہے کہ وہ ان میں کیا کرتا تھا۔

اسی وقت بالے نے یونہی پلنگ پر بچھا ہوا بستر الٹ دیا۔

اس کمرے میں اتنی روشنی تھی کہ چاروں طرف بہ خوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پلنگ پر موجود چیزوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

سدو بھی آگے جھک آیا تھا۔ یہ کالے رنگ کی چمگادڑ کی چند تصویریں تھیں، جو بستر کے نیچے گویا چھپا کر رکھی گئی تھیں۔

"یہ..... یہ کسی تصویریں ہیں؟" بالے کے منہ سے نکلا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر میں نے ان ہی تصویروں میں سے ایک منتخب کی اور اسے اٹھا کر قریب سے دیکھنے لگا اسی تصویر کے نیچے کسی غیر مانوس سی زبان میں کچھ تحریر بھی تھا۔

یہ چند مختلف تصویریں تھیں، لیکن ان میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان سب میں ہی اس چمگادڑ کا وجود تھا۔ جس کے منہ کے دہانے سے سفید رنگ کے

نوکیلے دانت جھانکتے ہوئے کافی خوفناک منظر پیش کر رہے تھے۔

"شکیل" دفعتاً سدو کی سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "میں..... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں..... بولو....." میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اور پھر دوسرا لمحہ میرے لئے حیران کن تھا۔ کیونکہ سدو کے چہرے پر بے پناہ خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"شکیل جتنی جلدی یہاں سے ممکن ہو۔ نکل چلو۔ ورنہ ہم لوگ کسی گہرے شیطانی چکر میں پھنس جائیں گے۔"

میں اسے تکتا ہی رہ گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ کیسا شیطانی چکر.....؟"

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ سدو واقعی گھبرا رہا تھا۔ بس یہاں سے نکلو۔ ورنہ ممکن ہے کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

اس کی حالت نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخرکار میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولا۔

"کچھ تو بتاؤ سدو۔ تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں سب کچھ بتا دوں گا شکیل۔ اس نے جواب دیا۔ مجھے تمہاری طاقت اور ذہانت پر پورا بھروسہ ہے۔ لیکن میں اب یہاں ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی یہ چاہوں گا کہ تم دونوں یہاں رہو۔ اس لئے سامان اٹھاؤ اور نکل بھاگو یہاں سے۔"

اس کے لہجے میں واقعی ایسا کچھ تھا کہ میں نے فوری طور پر ہتھیار ڈال دئے اور بولا۔

"ٹھیک ہے۔ سامان سمیٹو.....!!"

دونوں نے پھرتی دکھائی تھی، اس دوران میں نے ان دونوں کی نظر بچا کر ایک تصویر اٹھائی اور اپنے کپڑوں میں چھپالی۔

کافی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم اس عمارت سے باہر نکل آئے سدو کے قدم تو یوں اٹھ رہے تھے، جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔

بستی میں داخل ہوتے ہی گھر کا رخ کیا گیا۔ بالے بھی ساتھ ہی آ گیا تھا۔ کمرے میں آرام سے بیٹھنے کے بعد میں نے سدو کو گھورا۔

"ہاں اب بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے، کیونکہ میں تمہاری وجہ سے واپس لوٹا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہارا دم نہ خشک ہو جائے۔"

"کچھ تو میں واقعی سہم گیا تھا۔ سدو نے اقرار کیا۔ اور کچھ جان بوجھ کر میں نے ایسا کیا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے جونہی ضد کی تو تم وہاں سے ہرگز نہیں نکلو گے۔"

"وہ تو میں سمجھ گیا..... میں نے سر ہلایا۔ لیکن اب یہ سمجھاؤ کہ ایسا کیوں ہوا تم نے کیا دیکھا وہاں.....؟"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس دنیا میں شیطان کے پجاری بھی موجود ہیں؟" سدو نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں سنا تو ہے۔ میں نے جواب دیا۔

"تم نے وہ تصویریں دیکھی تھیں؟"

"کون سی.....؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔

"جس میں چنگاڑ کی شبیہہ تھی۔"

"اوہ..... اچھا..... یہ....."

میں نے اس عمارت سے لائی ہوئی تصویر جھٹ سے اس کے سامنے کر دی تو وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ..... یہ تم یہاں لے آئے ہو.....!!"

"ہاں..... تو کیا ہوا.....؟"

"یہ شیطان کی تصویر ہے۔ سدو کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ شامور شیطان کا پجاری تھا۔

میں نے اور بالے نے ایک آنکھ کھولتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"شیطان کا پجاری.....؟" میرے منہ سے نکلا

"مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ وہ اسی بناء پر لوگوں کو موت کے

گھاٹ اتارتا تھا۔ سدو نے بتایا اور انہیں شیطان کی خدمت میں پیش کرتا ہوگا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں لوگوں کو باقاعدہ شیطان کے آگے بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ جبکہ بڑے میدان سے ملنے والی لاشیں صحیح سلامت ہوتی تھیں۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ان کی لاشوں کے ساتھ کچھ کرتا ہو۔" سدو نے خیال ظاہر کیا۔ "آخر وہ قبرستان میں کیا کرنے جاتا تھا۔

میں سناٹے میں آ گیا..... سدو نے روا روی میں بول تو دیا تھا لیکن شاید اسے فوری معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا کہہ دیا ہے؟"

ہم دونوں ٹکر ٹکر اسے گھورے جا رہے تھے۔ آخر کار اس سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ بول اٹھا۔

"میں نے کیا جرم کر دیا ہے کہ تم ایسے دیکھ رہے ہو۔"

"آں..... میں چونکا۔ تمہارے یہ الفاظ دل ہلا دینے والے ہیں۔ اگر ایسا ہی کچھ ہے تو پھر اس راز پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔ کیونکہ شامور کون تھا۔ کیا تھا اس نے زہر کیوں کھایا۔ اور وہ لوگوں کو ہلاک کیوں کرتا تھا۔ یہ تمام سوالات ان سب کی زندگی ختم ہونے کے بعد صرف سوالات ہی رہ گئے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر چیز سامنے آ جائے۔"

اگر شامور کی بستی میں آمد سے پہلے کی زندگی کے بارے میں پتا لگ جائے تو شاید کچھ سامنے آ جائے۔" بالے نے خیال ظاہر کیا۔

"کیا مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ وہ کہاں سے آیا تھا؟" بالے نے جواب دیا۔ کیوں آیا تھا؟ اور کہاں کا رہائشی تھا؟" ہوسکتا ہے کہ اس کے ماضی سے کچھ حاصل ہو جائے۔ ہمارے ساتھ رہ کر تم بھی ہوشیار ہوتے جا رہے ہو۔ سدو نے تعریفی انداز میں کچھ اس طرح کہا جیسے خود اپنی تعریف کر رہا ہو۔

میں اس کی طرف دھیان دئے بغیر کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر بعد میں نے کہا۔

"بالے شامور کی کوئی تصویر مل سکتی ہے؟"

"بالے کے بجائے سدو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"سدو کے پاس عمرو عیار کی زنبیل موجود ہے سردار۔"

"کیا مطلب؟"

"کیمرہ۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ میرے پاس شامور کی کئی تصویریں موجود ہوں گی۔ فکر مت کرو۔"

"اوہ....." میرے منہ سے نکلا تھا۔

سدو کے کیمرے کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اب بستی میں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا اور یہاں رکنا فضول تھا۔

ترقیاتی کام آندھی اور طوفان کی طرح جاری تھا، نئی بستی کی از سر نو تعمیر سے لوگوں میں ایک واضح تبدیلی آ رہی تھی۔ کیونکہ یہ نئی بستی ضروریات زندگی کے ہر شعبے کو مدِ نظر رکھ کر بنائی جا رہی تھی۔

میں نے بالے کو منصب سرداری پر مامور کیا اور وہاں سے رخصت چاہی بالے تڑپ سا اٹھا اور بولا۔

"تمہارے بغیر تو اب یہ سب کچھ ادھورا ہے سردار۔ تم یہاں سے مت جاؤ۔"

"میں تو خود ادھورا ہوں بالے۔" میں مسکرایا ابھی مجھے خود کو بھی مکمل کرنا ہے۔

"میں سمجھا نہیں سردار۔"

"زندگی نے کبھی فرصت کے لمحات دئے تو ضرور بتاؤں گا۔ جس طرح یہاں بستی کی تعمیر ہو رہی ہے۔ کچھ اسی طرح میرا بھی معاملہ ہے۔ میں بھی زیر تعمیر عمارت کی طرح ہوں۔ میری داستان کافی طویل ہے۔ کبھی فرصت لی تو ضرور سناؤں گا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا سردار۔"

"ضرور..... میں نے سر ہلایا۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

اور پھر میں سدو کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرے اردگرد الوداع کہنے والوں کا ہجوم تھا۔ اور اسی ہجوم میں مجھے نرگس بھی دکھائی دی۔

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

☆.....☆.....☆

سدو کو میں نے سامان کے ساتھ گھر کی طرف روانہ کردیا تھا۔ اور اب خود جبران کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

جبران کافی دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا، پھر یک بیک ہنس کر بولا۔

"اب بتاؤ تمہارا کیا کروں.....؟"

"مرضی ہے آپ کی۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "کیونکہ میرا اچار ڈالیں گے۔ تو کوئی نہیں کھائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ جیل میں ہی ڈال دیں۔"

"ابھی نہیں" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "ابھی مجھے تم سے بہت سے کام لینے ہیں اس کے بعد۔"

"کیا پھر جیل میں ڈالیں گے.....؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"نہیں.....اچار ڈالوں گا تمہارا۔"

"خیر.....جو بھی کریں۔ لیکن اس سے پہلے مجھے چند باتوں کا جواب ضرور دے دیں۔"

"پوچھو....." وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"سب سے پہلی بات بستی میں آپ کے کون سے کارندے موجود ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں....." وہ اطمینان سے بولا۔

"ارے....." میں چونک اٹھا۔ "لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ....."

"ہاں .....ضرور کہا تھا۔ اس نے میری بات کاٹی۔ میں نے تو یہ بھی جھوٹ کہا تھا کہ کسی مشکل وقت میں تمہاری مدد بھی کی جائے گی۔ حالانکہ وہاں تم تن تنہا تھے۔"

"اوہ.....لیکن آپ نے ایسا کیوں کہا۔؟"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا حوصلہ بلند رہے اور تم ذہنی طور پر چاق و چوبند رہو۔"

"لیکن اگر میں واقعی کسی مشکل میں پڑ جاتا تو کیا ہوتا؟"

"مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا۔" وہ بولا۔ "میں جانتا تھا کہ تم ہر قسم کی صورت حال سے نمٹ لو گے۔ اور اب اسی وجہ سے تم میرے سامنے موجود ہو۔ جبکہ تم ایسا کام کر چکے ہو کہ جس کے لئے ہم لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اور بستی والے ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔"

"ہوں..... اور بستی خالی کیوں کروائی جا رہی ہے؟"

"یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے۔ جبران نے ایک طویل سانس لی اور اس کا جواب یہ ہے کہ بستی کا وہ علاقہ کہ جہاں وہ لوگ آباد تھے۔ قدرتی طور پر نہایت قیمتی دھاتوں سے مالا مال ہے۔ اور یہ بات معدنیات کے ماہرین نے کافی عرصے پہلے حکومت کے کانوں میں ڈالی تھی۔ اور پھر اس موضوع پہ باقاعدہ رپورٹ تیار ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ اس بستی کی زمین میں بیش بہا خزانہ دفن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خزانے کو حاصل کرنے کے لئے حکومت نئی بستی تیار کرنے کے اخراجات آرام سے برداشت کر رہی ہے۔ کیونکہ جو کچھ یہاں سے حاصل ہوگا۔ اس کی مد میں یہ اخراجات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"اوہ.....تو یہ بات ہے.....!!" میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں دوست..... !!" جبران مسکرایا۔ "فی الحال تم گھر کا راستہ لو۔ اور آرام کرو۔ میں جلد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔"

"وہ کس سلسلے میں ہوگا۔؟"

"وہ بھی بتا دوں گا۔ فی الحال تو میں خود بھی اس شگوفے کے تانے بانے جوڑ رہا ہوں۔ اسے حتمی شکل دینے کے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔"

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو

شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا

گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش

جنات کا سایہ | دیگر مسائل

سید عالم شاہ

کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں

وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

آزمائیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہے

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک مرتبہ ضرور لیں عامل وہ جس کا علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام رازداری کے ساتھ کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواہش

زندگی کی کوئی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمایئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے

نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو

سیّد عالم شاہ

رام تلائی چوک۔ جی ٹی روڈ گجرات

0300-6282386

"تو پھر آپ مجھے جیل کی سزا نہیں دے رہے۔"

"نہیں..... فی الحال تم..... آزاد ہو..... جاؤ عیش کرو.....!!"

یہ سن کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جبران نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ جسے میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جبران نے الوداعی انداز میں کہا۔

"بستی کی جانب کے تمام معاملات طے ہو جائیں۔ تو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گا۔"

"جی بہتر.....!!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

اور پھر پلٹتے وقت اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں لپک پڑا اور میں گھوم گیا۔

"جبران صاحب.....!"

"ہاں..... بولو.....!!"

"اگر کسی شخص کی تصویر آپ کو دے دی جائے۔ تو کیا اس کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں گی۔؟"

"ہاں ہو سکتی ہیں.....!!"

"جی اچھا.....!!"

"کیا معاملہ ہے؟" جبران نے غور سے مجھے دیکھا۔

"ایک شخص کے متعلق مجھے جانکاری چاہئے۔ پوری تفصیل آپ کو تصویر کے ساتھ ہی بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے.....!! اگر تم یہاں آنے میں کسل مندی محسوس کرو تو پھر میری رہائش گاہ پر آ جانا۔" جبران نے کہا۔ یوں بھی میں اکثر ڈیوٹی پر مصروف ہی رہتا ہوں اور گھر پر آرام سے بات چیت ہو سکے گی۔ تم سات بجے کے بعد کسی بھی وقت مجھ سے مل سکتے ہو۔"

"جی بہتر.....!!"

جبران نے مجھے اپنا ذاتی پتا بتا دیا اور میں ایک بار پھر اسے سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔

مین روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی والا میری طرف لپکا۔

"جی صاحب.....!! کہاں جائیں گے۔"

وہ کافی غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے قاسم ماموں کی رہائش گاہ کا ایڈریس بتایا۔

نہ جانے کیوں اس کو خوش گوار موڈ یک بیک خراب ہو گیا اور وہ منہ بنا کر بولا۔

"اوہ..... آپ کو فیصل ٹاؤن جانا ہے؟"

"ہاں..... تو پھر.....؟" میں حیران تھا۔

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا بادل نخواستہ ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کہا۔

"بیٹھ جائیں.....!!"

"اگر تمہارا موڈ نہیں ہے۔ تو میں کوئی اور ٹیکسی کر لوں گا۔ تم جاؤ.....!!" میں نے کہا۔

"ہر کوئی ایسا ہی منہ بنائے گا صاحب....." وہ مسکرایا۔ کیونکہ فیصل ٹاؤن جانے والی شاہراہ پر تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے کافی گھوم پھر کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ اور پھر ہم اضافی کرایہ مانگتے ہیں تو سواری منہ بناتی ہے۔"

"ارے نہیں ..... میں ہنس پڑا۔ تم مجھے لے چلو۔ ایمان داری سے جو مانگو گے ضرور دوں گا۔"

اس نے پرمسرت انداز میں سر ہلایا۔ اور میں اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"آپ جیل میں کسی سے ملنے آئے تھے؟"

"ہاں....."

"کوئی عزیز ہے؟"

"نہیں..... دوست ہے.....!!"

"اوہ..... کس وجہ سے اندر ہوا ہے وہ .....؟" اس نے پوچھا۔

میں ہنس پڑا اور بولا۔ "جرم تو کوئی نہیں کیا اس نے۔"

"ارے.....!! وہ چونکا۔ تو کیا اس بے چارے کو بے گناہ ہی جیل ہو گئی؟"

"اسے جیل نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ جیل میں ہی ہوتا ہے۔ میں مسکرایا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسپکٹر ہے۔"

"اوہ.....!!" ٹیکسی ڈرائیور کے منہ سے نکلا۔

پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور پھر اس کے بیان کے مطابق ٹیکسی ان راستوں سے گزرنے لگی کہ جن سے میں واقف نہیں تھا۔

اب ٹیکسی والا قدرے بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اور پھر میں اس وقت چونکا، جب مجھے چاروں طرف سناٹا اور ویرانی کے آثار دکھائی دیئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سفر اب شہری حدود سے باہر نکل آیا ہو۔

"یہ تم کہاں جا رہے ہو مسٹر.....؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فیصل ٹاؤن.....!!" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"لیکن یہ علاقہ تو بالکل سنسان اور بے آباد لگ رہا ہے۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تو میں نے کب کہا یہ ہی فیصل ٹاؤن ہے؟ اس نے الٹا سوال کر ڈالا تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہاں سڑک بند ہے اور ہمیں کافی گھوم کر جانا پڑے گا۔ اسی لئے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اس وقت جس روڈ پر ٹیکسی بھاگ رہی تھی۔ اس کے دونوں جانب درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ دور دور تک کسی اور گاڑی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

میں اب قدرے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ شاید میری چھٹی حس مجھ سے کوئی سرگوشی کرنا چاہتی تھی۔

ٹیکسی والا اب بھی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔

اور پھر ایک بڑے سے میدان کے قریب پہنچ کر ٹیکسی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوئی اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"لو جناب.....!! اس نے ایک طویل سانس لے کر میری طرف دیکھا اب کیا کریں پٹرول ختم ہو گیا۔"

میں اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے تھے۔

"کیا تم ہوش میں ہو؟" میرے منہ سے نکلا۔

اس نے اس طرح چونک کر میری طرف دیکھا۔ جیسے اب تک میرے وجود سے لاعلم رہا ہو۔

"آپ کو شک ہے کوئی؟"

"جب تمہیں اتنا لمبا سفر طے کرنا تھا۔ تو پٹرول کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ میں نے منہ کر کہا۔ اب کیا ہو گا؟"

"انتظار.....!! اس نے جواب دیا۔ کوئی گاڑی اس طرف آئے گی تو اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ یہاں کوئی آتا ہو گا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ تم مجھے غلط راستے سے لائے ہو۔ شاید تمہیں خود بھی سڑکوں کی پہچان نہیں ہے۔"

"میرے روزانہ 36 چکر لگتے ہیں اس طرف کے۔ اس نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے۔ آؤ۔ ذرا باہر نکل کر جائزہ لیں۔

مجھے غصہ تو بہت آ رہا تھا۔ لیکن صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں اسے پینے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

باہر نکلتے ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اچانک ہی چند لمبے تڑنگے آدمی درختوں کی آڑ سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا جس کی نالوں کا رخ میری ہی طرف تھا۔

"خبردار.....!! ان میں سے ایک دہاڑ کر بولا۔ کوئی غلط حرکت کئے بغیر ہاتھ سر سے بلند کر لو۔ ورنہ چھلنی کر دیئے جاؤ گے۔"

یہ نئی صورت حال میرے لئے قطعی خوش گوار نہیں تھی۔ اور نہ ہی میں اس جھٹکے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ چنانچہ میں قدرے بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم نے سنا نہیں.....؟ وہی کڑک کر بولا۔

ہاتھ سر سے بلند کرو اور چپ چاپ اس طرف قدم بڑھا دو۔ جلدی کرو۔"

"تم لوگ کون ہو.....؟ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ کیا چاہتے ہو۔"

"میں بتاشہ ہوں۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ ریوڑی ہے۔ وہ گڑ کا لڈو ہے اور اس کے ساتھ جو کھڑا ہے اس کا نام تل کا لڈو ہے۔"

دلبر دوسرے اسلحہ بردار نے دخل دیا۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے چلو بھئی آگے بڑھو۔"

پھر وہی ٹیکسی ڈرائیور کی طرف گھوما۔

"تم بھی اب اپنا راستہ ناپو..... ٹیکسی گھماؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

ٹیکسی والے نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اسے ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے آناً فاناً وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس بات نے میرے دل پر ایک اور دھچکا لگایا تھا۔ کیونکہ ٹیکسی کے چلے جانے کا صاف مطلب یہ تھا کہ ڈرائیور نے میرے ساتھ ڈرامہ کھیلا تھا۔ وہ مجھے پھانس کر یہاں لایا گیا تھا۔

"کیا تمہیں اٹھا کر لے جانا پڑے گا؟" دلبر نامی بدمعاش نے پوچھا۔

سب ہی خوف اور خون خوار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان بندوقوں کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ وہ میری خاطر تواضع کریں گے۔

بادل نخواستہ میں نے قدم آگے بڑھا دئے۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے ایک پرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار دکھائی دئے۔ جلد ہی یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہماری منزل یہی عمارت تھی۔ اس کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

"چلو اندر.....!!" کسی نے پیچھے سے للکارا تھا۔

"لیکن یہاں تو اندھیرا دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے صدر دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ واقعی ہو کا عالم دکھائی دے رہا تھا۔

"تم اندر جاؤ گے تو روشنی ہو جائے گی۔" ہنس کر کہا گیا۔ "تمہارے پاؤں برکتی ہیں بہت۔"

میں خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک کمرے سے روشنی پھوٹتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"وہیں چلو..... یہ شاید دلبر کی آواز تھی۔ جس نے تمہیں بلایا ہے وہ اسی کمرے میں ہے۔"

"اچھا....." میرے منہ سے نکلا۔

اب مجھے بھی تجسس ہو رہا تھا کہ مجھے اس طرح بلانے والا کون تھا؟ اور اس کا کیا مقصد تھا؟

روشنی والے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک آدمی دکھائی دیا۔ اس کے جسم پر چست لباس تھا اور اس نے اپنا رخ دوسری جانب کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی شکل دیکھنے سے قاصر تھا۔

"سر جی..... بندہ حاضر ہے.....!" دلبر نے آواز لگائی۔

"ٹھیک ہے..... کافی بھاری آواز تھی۔" تم لوگ ادھر ہی رکو۔"

"اوکے سر....." دلبر نے کہا اور پھر وہ سب کے سب باہر نکل گئے۔

اب میں اس نامعلوم شخص کے ساتھ کمرے میں اکیلا تھا، وہ اب بھی میری طرف پیٹھ کئے ہوئے تھا۔

"اس طرح بلایا ہے تم نے..... میں نے زبان کھولی۔ تو کیا آنکھیں ملانے کے روادار نہیں ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں مجھے دیکھ کر تمہارا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔" قدرے ہنس کر کہا گیا۔

"میرا دل بہت مضبوط ہے برادر.....! میں اپنی جون میں آچکا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ گھبراہٹ سے کوئی حل نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نے زندہ لوگوں کے علاوہ مردوں کے ساتھ بھی کافی وقت گزارا ہے۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ تم عام انسان نہیں ہو۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف پلٹ گیا۔ کیونکہ میرے گال پر پڑنے والا وہ تھپڑ کسی عام آدمی کا ہرگز نہیں تھا۔

میں نے دیکھا۔ وہ جیل کی چہار دیواری میں

رہنے والا ٹائیگر تھا۔

چند لمحوں کے لئے میں سناٹے میں آ گیا۔ کیونکہ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ اس شخص سے اس جگہ ملاقات ہو جائے گی۔ اور وہ بھی ایسی صورت حال سے دوچار ہو کر۔

جیل کا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جب کھانے کی لائن توڑتے ہوئے ٹائیگر نے اپنا تھال آگے بڑھایا تھا اور میں نے اس کے گال پر تھپڑ جڑ دیا تھا۔

"کیوں.....؟" وہ ہنسا۔ "سونگھ گیا تا سانپ.....؟"

"تو کیا یہاں سانپ بھی ہیں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"باتوں میں مت اڑاؤ۔" اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ "میں تمہاری حالت سے پوری طرح محظوظ ہو رہا ہوں۔ اس وقت تم سوچ رہے ہو گے کہ کاش ٹائیگر سے پنگا نہ لیا ہوتا۔"

"نہیں..... میں طویل سانس لے کر بولا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب تم کیا چاہتے ہو۔"

"بدلہ..... میں تم سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ وہ خون خوار لہجے میں بولا۔" کیونکہ اسی دن سے میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جو بجھنے کا نام نہیں لے رہی۔ بلکہ دن بہ دن اس کی حدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اس کے چہرے کے تاثرات مزید وحشت ناک ہو گئے آنکھیں یوں سرخ ہو گئیں جیسے پورے جسم کا خون ان میں ہی اتر آیا ہو۔

میک بیک وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

"دلبر..... نادر..... سب ادھر آ جاؤ۔"

فوراً ہی اس کے چیلے چماٹے اسلحہ اٹھائے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"حکم کریں جناب۔" دلبر نے کہا تھا۔

"رسی اٹھاؤ۔ اور اس کمینے کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔" ٹائیگر دانت پیس کر بولا۔ "میں اسے پھٹروں میں نہلا دوں گا۔ اور جب تک مارتا رہوں گا کہ جب تک یہ اپنے ہوش نہ کھو بیٹھے۔"

دلبر نے فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اور پھر میرے ہاتھوں کو پشت پر باندھا جانے لگا، ساتھ میں ٹانگیں بھی باندھ دی گئیں۔

"کیا یہ مردانگی ہے ٹائیگر.....؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ٹائیگر کی طرف دیکھا۔

"خاموش رہو۔ وہ غرایا۔ یہاں کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا۔ میں تو تم سے صرف بدلہ لے کر اپنی آگ بجھانا چاہتا ہوں۔ صرف اور صرف بدلہ۔"

"اگر بدلہ ہی لینا ہے تو باہر آؤ اور اپنی زور آزمائی سے بدلہ لو۔ اس طرح مجھے بے دست و پا کر کے تمہیں کیا ملے گا؟"

"سکون.....! وہ ڈھیٹ انداز میں ہنسا۔ ہاں سکون اور طمانیت ملے گی مجھے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت طاقتور ہو۔ اس لئے تم سے مقابلہ کی بے وقوفی میں ہرگز نہیں کروں گا۔"

میں خاموش رہا تھا۔ اور پھر میرے ہاتھوں کو پشت پر باندھ دیا گیا۔

"تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔ ٹائیگر نے سب کو حکم دیا۔ میرے تھپڑوں کی الگ بات ہے، لیکن یہ خود سے کوئی حرکت کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔ پھر میں دیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر....." دلبر نے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے کمرے کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا اور پھر ٹائیگر کے علاوہ سب ہی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ گویا وہ تماشہ دیکھنا چاہتے تھے۔

ٹائیگر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس لمحے خود کو کافی بے بس محسوس کیا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے ہاتھوں میں

بندھی ہوئی رسی کو توڑنے میں مجھے زیادہ دقت نہیں ہو گی۔ لیکن میں اس اسلحے کا کیا کرتا، جس کا رخ میری طرف تھا میری کوئی بھی غلط حرکت خود میری جان کا وبال بن سکتی تھی۔

چنانچہ میں نے مجبور ہو کر دم سادھ لیا۔ ٹائیگر اب میرے کافی قریب آچکا تھا۔

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر گویا وحشت طاری تھی۔ خون سوار تھا۔

اس نے بجلی کی سرعت سے اپنا داہنا ہاتھ گھمایا اور اس کی دانست میں نشانہ میرے گال کی طرف تھا۔

لیکن دوسرا لمحہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ خود میں بھی بھونچکا رہ گیا، میں نے دیکھا ٹائیگر کا ہاتھ ہوا میں ہی لہرا کر ایک جگہ رک گیا تھا۔

یوں جیسے کسی نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔

ٹائیگر کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ اس نے اپنے ہاتھ کو نیچے لانے کی کوشش کی، مگر بے سود، اب وحشت کی جگہ خوف نے اس کے چہرے پر ڈیرہ جما لیا تھا۔

اس کے معاون ساتھی بھی اس صورت حال سے کافی بوکھلائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

پھر بھی دلبر نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر بولا۔

"کیا ہوا سر جی.....؟ کیا آپ کے ہاتھ کی کوئی رگ کھسک گئی ہے؟"

"نہیں دلبر..... ٹائیگر بمشکل بولا۔ یوں لگ رہا ہے جیسے..... جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔"

"بھوت..... دلبر کے منہ سے نکلا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھوت ہیں یہاں۔"

عین اسی وقت کمرے میں ایک خوفناک آواز گونجی یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی سانپ یا اژدھا پھنکارا ہو۔

اور پھر واقعی ایک بہت بڑا سانپ وہاں سے نمودار ہوا، وہ نہ جانے کس جانب سے نکلا تھا۔ اسی وقت ٹائیگر کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کا ہاتھ نیچے آرہا۔

"بھاگو.....!" کسی نے زوردار آواز میں نعرہ لگایا اور سب کے سب الٹے قدموں وہاں سے باہر کی طرف دوڑ پڑے۔

ان بدحواسوں میں ٹائیگر بھی شامل تھا۔ چند ہی لمحوں میں میدان خالی تھا، اور میں کسی معذور شخص کی طرح رسیوں کا محتاج ہو کر اپنی جگہ پر ہی جما ہوا تھا۔

دفعتاً سانپ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک جانی پہچانی شخصیت نے لے لی، جسے میں ہزاروں میں اس حلیے کی وجہ سے پہچان سکتا تھا۔

سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کے لبادے میں جان لیوا کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

ہاں یہ جان لیوا ہی تھا، جس کا چہرہ آج بھی چھپا ہوا تھا۔

"جان لیوا" میرے منہ سے نکلا۔ "تم.....؟"

"ہاں..... اس کے لہجے میں عجیب سی نرمی تھی۔ تمہیں مشکل میں دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں پلک جھپکتے ہی میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں آیا ہوں۔"

"ہوں..... میں کچھ سوچ کر بولا۔ کیا تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

"ضروری نہیں ہے۔ وہ لاپروائی سے بولا تھا۔ اور نہ میں حق جتانا چاہتا ہوں..... میں صرف تمہارے لئے وہ راستہ صاف کرنا چاہتا ہوں کہ جس پر چل کر تم مجھ تک پہنچو گے۔"

"کیا تم وادی طلسم کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں.....! میں وہیں تمہارا منتظر ہوں۔" جان لیوا نے کہا۔ اور ہو سکتا تھا کہ اگر میں اس وقت یہاں نہ آتا تو تم شاید وادی طلسم پہنچنے کے قابل نہ رہتے۔"

"میں تمہارا احسان ماننے کو تیار ہوں۔ میں آہستہ سے بولا۔ اور جب وہ وقت آئے گا کہ جب میں وہاں آکر تم سے اپنا انتقام لوں گا، تو تمہیں کچھ رعایت

ضرور ملے گی۔"

یہ سن کر جان لیوا نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا۔

"کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ تم نے انتہائی بے وقوفی کی بات کی ہے۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں تم سے دوستی کر چکا ہوں۔"

"تم مجھے اسی وقت مار ڈالو..... لیکن میں یہ دوستی قبول نہیں کروں گا۔" میرا جواب تھا۔

"تمہارے قبول کرنے یا نہ کرنے سے میری دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ لاپروائی سے بولا۔ "اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوستی کر کے فائدہ اٹھاؤ۔"

"میں تم سے کسی فائدے کا خواہش مند نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

جان لیوا فوری طور پر کچھ نہیں بولا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کی آواز گونجی۔

"یہ بات تم غلط کہہ رہے ہو اور میں اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"یہی کہ مجھ سے تم کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ وہ بولا۔ میں ایک ایسے راز سے واقف ہوں، جس کی اصلیت تم پر ظاہر ہو جائے تو تم حیران بھی ہو گے اور پریشان بھی۔"

"کیسا راز.....؟"

"رہنے دو ابھی۔ راز کو راز ہی رہنے دو۔ اگر وہ کھل گیا تو مزہ خراب ہو جائے گا۔ بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ تم جو بھی کھیل کھیلتے ہو، اس میں میرا کافی ہاتھ شامل ہوتا ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"اور میں سمجھانا بھی نہیں چاہتا۔ اب میں جا رہا ہوں وادی طلسم میری منتظر ہے اور تمہاری بھی۔ لو میں تو چلا۔"

"جان لیوا..... میری بات سنو!"

"ہاں بولو..... مگر ٹھہرو..... اپنے پیچھے دیکھو ذرا۔"

میں بے ساختہ گھوم کر دیکھا، لیکن وہاں تو خالی دروازہ تھا۔ اب میں دوبارہ جان لیوا کی طرف متوجہ ہوا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ گویا جاتے جاتے بھی اس نے مجھے بے وقوف بنا دیا تھا۔

عجیب دشمن تھا وہ۔ میں ہمہ وقت اس سے بے اعتنائی برت رہا تھا اور وہ مجھے اپنا دوست ثابت کرنے پر مصر تھا۔

میں نے بے خیالی میں اپنے ہاتھوں اور پیروں کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

رسیاں ٹوٹ چکی تھیں اور اب میں آزاد تھا۔

☆.....☆.....☆

قاسم ماموں کا گھر..... جہاں میری کئی یادوں کا بسیرا تھا۔ ان میں کچھ یادیں اچھی تھیں اور کچھ انتہائی بری۔ یعنی خوشی اور غم دونوں کا ہی امتزاج تھا ان میں۔

ان میں ممانی کا بھی وجود شامل تھا، جنہوں نے مجھے کافی بے عزت کرتے ہوئے گھر سے نکالا تھا۔

لیکن یہ بات تھی پہلی ممانی کی..... وہ دوسری شادی کر چکے تھے، جو کہ نہایت سادگی سے ہوئی تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں سابقہ ممانی سے بہت محبت تھی۔

اب اس خوب صورت گھر کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا، کیونکہ ان کے یہاں 2 خوبصورت بیٹیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

مجھے ان کی تصویر بس رحیم بابا نے دکھائی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماموں اپنی فیملی کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض سے شہر سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

رحیم بابا کی زبانی معلوم ہوا کہ اب اس گھر کی رونقیں بحال ہو چکی تھیں اور نئی عورت نے قاسم ماموں کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی تھی، وہ کافی سلجھی ہوئی اور پرخلوص عورت تھیں۔

یہ سب کچھ سن کر میرے دل کو بہت طمانیت ملی تھی، کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس"

حادثے" کے بعد وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ اور کافی عرصے تک انہیں یک جا ہونے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

رحیم بابا نے میری خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب ہم اطمینان سے ان کے مخصوص کمرے میں بیٹھے تو میں نے جان لیوا کا ذکر چھیڑنے کے لئے اس موضوع کی ابتدا کی۔

"رحیم بابا..... میں آپ سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور بیٹا..... کہو.....!!"

"میں ایک بار پھر وہ چلہ دہرانا چاہتا ہوں۔ جس کا خری دن میرے لئے قیامت خیز ثابت ہوا تھا.....!!"

یہ سن کر رحیم بابا پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ جب وہ چپ ہی رہے تو میں بے چین ہو کر بولا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں.....؟ کیا اب ایسا ممکن نہیں ہے؟"

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا شکیل بیٹا.....!!" وہ اداس انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"تو پھر.....؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہیں ایک بار پھر سے پریشانیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا.....!!"

"مجھے اب کوئی فرق نہیں پڑتا رحیم بابا۔ میرے لہجے میں لاپروائی تھی۔ کیونکہ میں اب اس دور سے نکل چکا ہوں۔ اور اب میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر بھی نہیں جاؤں گا۔ آپ صرف دور رہ کر میری راہنمائی کیجئے گا۔ میں اب اتنا مضبوط ہو چکا ہوں کہ میری خود اپنی سوچ ہو گی۔"

"مضبوط..... کیا مطلب؟" وہ قدرے حیران تھے۔

یہ سن کر میں مسکرایا اور بولا۔

"میں آپ کو ایک تماشہ دکھانا چاہتا ہوں۔"

"کیسا تماشہ؟"

"کیا آپ لوہے کی ایک موٹی سی راڈ فراہم کر سکتے ہیں؟"

"ضرور....." وہ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

جلد ہی وہ ایک راڈ لے کر میرے سامنے موجود تھے، میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں تھاما اور پھر نہایت آسانی کے ساتھ کسی رنگ کی طرح گول دائرے کی شکل دینے کے بعد اسے رحیم بابا کے حوالے کر دیا۔

وہ لوہا میرے سامنے کسی نرم و ملائم پلاسٹک کی طرح ثابت ہوا تھا۔

رحیم بابا کی حیرت کا کیا پوچھنا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں جیل سے آزاد ہونے کے بعد سے لے کر ٹائیگر کی روداد سنا ڈالی۔ آخر میں جان لیوا سے ملاقات کا بھی ذکر کیا تھا۔

میرے خاموش ہونے پر رحیم بابا نے کہا۔

"تمہاری داستان واقعی اچھنبے پر مبنی ہے۔ اور جان لیوا کے بقول وادی طلسم کا وجود بھی پراسرار معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں رحیم بابا.....!!" میں نے سر ہلایا۔ وہ دو دفعہ اپنی اس بات کو دہرا چکا ہے۔ اور میں اسی بناء پر کافی الجھن کا شاکر ہوں۔ بھلا میں اس وادی کو کہاں ڈھونڈوں گا؟ کیا یہ وادی نقشے میں مل سکے گی؟"

"نہیں.....!!" وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔ "البتہ....."

وہ بولتے بولتے رک گئے، میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"البتہ کہا رحیم بابا؟"

"آں..... ہاں..... وہ گویا چونکے تھے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یا تو اس وادی کا واقعی کوئی وجود ہے، یا پھر جان لیوا نے اشاروں کنایوں میں اس جگہ کی نشان دہی کی ہے، ہو سکتا ہے کہ وادی طلسم کا اصل نام کچھ اور ہو۔"

"لیکن یہ بات مجھے کیسے معلوم ہو گی۔"

"ہاں..... یہ بات غور طلب ہے۔" وہ کسی سوچ

میں ڈوب گئے تھے۔

"ایک بات اور بھی ہے رحیم بابا.....!!"

"وہ کیا؟"

"میں اپنی اس بے پناہ طاقت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں.....!!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اس قدر مضبوط اور توانا کیسے ہوا؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ ابھی اسے راز ہی رہنے دو .....تو پھر.....؟"

"کیوں رحیم بابا.....؟"

"یہ بات میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا۔ جب تم وادی طلسم کا کھوج لگا لو گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

جواباً میں بھی مسکرایا اور بولا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کام زندگی بھر نہیں ہو سکے گا۔ اور آپ یہ راز مجھے قطعی نہیں بتائیں گے.....!!"

"میں ایک بات کہوں؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"جی..... ضرور.....!!"

"تم..... تم جان لیوا سے دوستی کر لو.....!!"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں بیٹا.....!!"

"کیا آپ بھول گئے ہیں کہ اس نے مجھ پر کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں؟" میرا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ "اس نے میرا خاندان تباہ کر دیا۔ میں اکیلا رہ گیا اور آپ مجھے اس سے دوستی کا مشورہ دے رہے ہیں....."

"مجھے سب کچھ یاد ہے۔ وہ سنجیدگی سے بولے۔ "لیکن کیا اس سے ٹکرانے سے اور اس کا مقابلہ کرنے سے وہ وقت لوٹ آئے گا۔ کیا جانے والے واپس آ جائیں گے.....؟"

"یہ تو ممکن نہیں ہے رحیم بابا.....!!"

"تو پھر.....؟؟" انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

کیا ملے گا تمہیں بدلہ لے کر۔"

"کم از کم دل میں جو نفرت کی آگ ابل رہی ہے۔ اسے تو قرار مل جائے گا۔"

"بدلہ لینے سے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے.....!!" وہ آہستہ سے بولے۔ کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اب واقعی تم سے مخلص ہے۔"

"آپ نے یہ بات کیسے محسوس کی؟"

"یہ بھی اس کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر یہ بات ہے تو اپنی اضافی طاقت کا استعمال مت کرو۔ انہوں نے کہا۔ کیونکہ تمہاری اس بے پناہ طاقت میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔"

یہ سن کر میں چونک اٹھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں شکیل بیٹا.....!!" وہ معنی خیز انداز میں بولے۔ "اس نے اپنی جانب سے تمہیں دوستی کا ایک نایاب تحفہ دیا ہے۔ جسے استعمال کرتے ہوئے تم کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہو.....!!"

یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔

"تو..... تو کیا وہ اماں جی کی طرح مجھ میں بھی حلول کر گیا ہے؟"

"نہیں..... لیکن اس نے اپنا بہت کچھ تمہارے وجود میں پیوست کر دیا ہے۔ خیر دیکھا جائے گا.....!!" میں نے کندھے اچکائے۔ میں پہلے وادی طلسم کا پتا لگانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"جلد ہی میں تمہیں اس سلسلے میں ضرور معلومات فراہم کروں گا۔"

"کون ہے وہ کہاں رہتا ہے؟"

"صبر سے کام لو شکیل..... ابھی تو خود مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ کافی عرصہ پہلے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا..... ایک بات مجھے بتائیں.....!!"

"کہو.....!!"

"آپ دوبارہ سے مجھے وظیفہ کرنے کی اجازت دیں گے؟"

"ابھی نہیں.....!!" وہ کچھ سوچ کر بولے۔ پہلے تم وادی طلسم کا پتا لگاؤ۔ اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"اوہ..... آپ نے بھی جان لیوا کی طرح پہلی شرط رکھ دی؟" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

جواباً رحیم بابا صرف مسکرا رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

اور پھر رات کے وقت میں جبران کی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہاں ایک پولیس اہلکار موجود تھا، جو مجھ سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ جبران تک پہنچنے میں مجھے دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

یہ بہت ہی خوبصورت سا ڈرائنگ روم تھا، جس میں میں جبران نے جس میں مجھ سے ملاقات کی تھی۔ سادہ لباس میں نہ جانے کیوں وہ مجھے کافی بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بڑے تپاک سے ملا تھ، اور چند منٹوں میں ہی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کی ٹرے میرے سامنے رکھی ہوئی تھی۔

"آپ نے یہ تکلف کیوں کیا جناب.....؟"

"ارے بھئی کوئی تکلف نہیں....." اس نے خود بھی چائے کے ساتھ بسکٹ اٹھا لئے۔ مجھے خود ہی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

"اچھا..... یہ کہہ کر میں نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ "میں ایک خاص سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

"ہاں..... ہاں..... بولو شکیل آقال..... کیا بات ہے۔"

"آپ کے ٹائیگر نے آج میری جان ہی لے لی تھی۔" میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ٹائیگر..... کیا مطلب؟" وہ حیران رہ گیا۔

"جی ہاں۔ میں ٹائیگر ہی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔ وہی جس کو میں نے بھرے مجمے میں تھپڑ مارا تھا۔

"اوہ..... اس نے کیا کیا تمہارے ساتھ۔" جبران آگے کی طرف جھک آیا۔

"جواباً میں نے جان لیوا کی آمد کو حذف کرتے ہوئے اسے پورے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

جبران کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمایاں تھے۔ اور میں نے اس حالت میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

میرے خاموش ہونے پر وہ بڑبڑایا۔

"اس نے یہ گھٹیا حرکت کیوں کی؟ میں ابھی اس سے جواب طلب کرتا ہوں۔"

"نہیں سر.....!!" میں جلدی سے بولا۔ "اگر ابھی آپ نے پوچھا۔ تو اس کے دل کی خار اور بھی بڑھ جائے گی۔ مجھے آپ کو بتانے کا صرف یہ مقصد تھا کہ اس سلسلے میں کوئی چال نہ کھیل جائے۔"

"کیا تم ان لوگوں کو پہچان سکو گے۔ جو اس کے ساتھی تھے؟" جبران نے پوچھا۔

"بالکل.....!!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ان سب کے چہرے میرے ذہن میں نقش ہو چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ٹائیگر کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم ابھی جاؤ اور آرام کرو۔ ابھی مجھے تم سے چند اور بھی کام لینے ہیں، لیکن اس سے قبل بستی والا معاملہ صاف ہو جائے۔ تاکہ ہم یک سوئی سے کسی اور معاملے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔"

"مجھے بھی ایک کام ہے آپ سے.....!!"

"بولو.....!!"

اب میں نے شامور کی تصویر کے ساتھ ساتھ شیطان کی خیالی تصویر بھی اس کے سامنے کر دی۔

شامور کی تصویر میں سدو سے لیتا ہوا آیا تھا۔ کیونکہ اس نے گھر جاتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا

تھا۔ اور شامور کی تصویر کیمرے سے نکال کر پرنٹ کروالی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"اس کا نام شامور ہے۔ اور دوسری تصویر شیطان کی ہے.....!!" میں نے بتایا۔ "آپ کو اس شخص کے بارے میں مجھے معلومات فراہم کر کے دینی ہیں۔"

"شیطان کے بارے میں؟"

"ارے نہیں.....!!" میں ہنس پڑا۔ "میں شامور کی بات کر رہا ہوں.....!!"

"اوہ اچھا..... میں سمجھ گیا۔ وہ سر ہلا کر بولا۔ تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ یہ آدمی اس وقت کہاں ہے۔"

"یہ بات تو مجھے معلوم ہے۔ میں سادگی سے بولا۔ "یہ مر چکا ہے.....!!"

"اوہ.....!!" تو پھر معلومات کا کیا کرو گے؟"

"بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں کھوج لگاؤں.....!!"

"اچھا ٹھیک ہے..... میں اس کا ریکارڈ نکلوانے کی کوشش کرتا ہوں.....!!"

"بہت شکریہ.....!!" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

☆.....☆.....☆

دو دن بعد ہی جبران کی کال آ گئی۔ میں اسے قاسم ماموں کے گھر کا فون نمبر دے آیا تھا اور اس وقت رحیم بابا کے ساتھ تو باتیں کرتے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔

میں نے عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو.....!! میں شکیل بول رہا ہوں.....!!"

"اور میں جبران ہوں.....!! دوسری طرف سے آواز آئی۔ تمہاری دی ہوئی تصویر کے مطابق وہ شخص شامور نہیں بلکہ سلطان ہے.....!!"

"اچھا.....!!"

"ہاں..... اور وہ کچھ عرصے پہلے نواب تیمور کے گھر میں ملازم کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ لیکن پھر ان کے گھر سے کچھ قیمتی سامان چرا کر بھاگ نکلا تھا۔ سنا ہے کہ نواب تیمور آج بھی اس کی تلاش میں ہیں.....!!"

"اوہ.....!! یہ تو کچھ بھی نہ ہوا.....!!" میں مایوسی کے عالم میں بولا۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟" جبران پوچھ بیٹھا۔

اب میں نے مختصراً اسے شامور کے کردار سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"تم کافی عقل مند ہو.....!! لیکن اس معاملے میں تمہاری عقل گھاس کھانے چلی گئی ہے۔ ارے جب بندہ ہی نہیں رہا تو پھر اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں بس اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا.....!!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی خیالی تصویر دیکھ کر تمہیں شامور کے متعلق تجسس ہوا تھا؟"

"شاید یہی بات ہو۔"

"اگر واقعی یہی بات ہے، تو پھر تیار ہو جاؤ.....!!"

"کس بات کے لئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں تمہیں اس سلسلے کا ایک کیس سونپنا چاہتا ہوں.....!! جبران کی آواز آئی۔ لیکن یہ کیس بستی والے معاملے سے ہٹ کر کافی کٹھن اور مشکل ثابت ہوگا۔"

"اوہ..... اچھا.....!!"

"ہاں.....!! کیا تم تیار ہو؟"

"جی..... تیار ہوں.....!!"

"فی الحال میں مختصر طور پر تمہیں اس کیس سے آگاہ کر رہا ہوں۔ جبران کی آواز آئی۔ ایک قدرے بوڑھا آدمی ہے۔ لیکن طاقت اور توانائی میں وہ جوانوں سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ اور تمہیں یہ کام کرنا ہے کہ اس کی کھوج نکالنی ہے۔"

''کھوج.....؟ میرے منہ سے نکلا۔ میں سمجھا نہیں.....!!''

''اس کے بارے میں شک ہے کہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ جبران نے بتایا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان کے پجاریوں کی فہرست میں شامل ہے۔''

''اوہ..... یہ بھی ہے..... میں نے دلچسپی لیتے ہوئے چونک کر کہا۔

''ہاں.....!!'' جبران کی آواز آئی۔ ''تمہیں اس تک رسائی حاصل کرنی ہے اور یہ کام کس طرح ہو گا۔ اس کا فیصلہ تم خود کرو گے.....!!''

''ٹھیک ہے.....!!''

''کیا تم تیار ہو.....؟''

''جی ہاں.....!!''

''گڈ.....!! اب میں تمہیں اس کا پتا بتا رہا ہوں.....!!'' یہ کہہ کر جبران نے مجھے ایک ایڈریس بتایا اور آخر میں بولا۔

''ابھی میں نے تمہیں اصل معاملے سے آگاہ نہیں کیا ہے۔ لیکن میں اس کے متعلق تمہیں اندھیرے میں ہی رکھوں گا۔ میں تمہاری صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لئے اس اہم راز سے پردہ اٹھانے کے بجائے اس بات پر اکتفا کر رہا ہوں کہ تم خود ہی اس کا اندازہ لگاؤ گے۔ کیونکہ اگر وہ معاملہ سامنے آ گیا، تو سارا معاملہ خود بہ خود ہی سامنے آ جائے گا۔''

''کیا آپ مجھے کوئی اشارہ بھی نہیں دیں گے؟''

''میں نے شروع میں بتایا تھا کہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں مصروف گردانا جاتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ثابت ہوئی تو اس راز سے خود بہ خود پردہ اٹھ جائے گا۔''

''اس شخص کا نام تو بتا دیں.....!!''

''اوہ ہاں..... وہ کنور کے نام سے مشہور ہے۔ کنور شہر یار نام ہے اس کا.....!!'' اب اتنا ہی کافی ہے۔ کوئی اور بات تمہارے ذہن میں آئے تو مجھ سے رابطہ رکھ سکتے ہو خدا حافظ.....!!''

یہ کہہ کر جبران نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ میں رسیور کو گھورتا ہی رہ گیا۔

اسی اثناء میں رحیم بابا وہاں آ پہنچے اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر بول اٹھے۔

''کیا ہوا شکیل.....!! خیریت تو ہے؟''

''جی.....!!'' میں نے چونک کر رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ''جی ہاں سب خیریت ہی ہے۔''

''مجھے تو کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ انہوں نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جبران صاحب نے مجھے ایک اور کیس سونپ دیا ہے۔ میں نے طویل سانس لے کر بتایا۔

''اوہ اچھا.....!!''

''جی ہاں.....!! میں اس کے متعلق سوچ رہا تھا.....!!''

''میرا خیال ہے کہ تم پولیس کے محکمے میں باقاعدہ طور پر شامل ہو جاؤ۔ وہ مسکرائے۔ یہ تمہارے لئے سنہری موقع ہے۔ کیونکہ تم اس وقت صرف شکیل آقا ہی نہیں ہو، بلکہ جان لیوا بھی ہو۔''

''جی کیا مطلب.....؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

رحیم بابا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا، ان کی یہ خاموشی مجھے کھلنے لگی، بے اختیار میں نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ خاموش کیوں ہیں رحیم بابا..... مجھے جواب دیں.....!!''

''میں یہ بات تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا.....!! انہوں نے ایک طویل سانس لی۔ لیکن اب میرے منہ سے نکل ہی گیا ہے تو سن لو۔ تمہارے وجود میں جو بے پناہ طاقت عود کر آئی ہے۔ یہ جان لیوا کا دیا ہوا تحفہ ہے اور یہ غیر انسانی قوت اسی کی مرہون منت ہے۔''

رحیم بابا کے یہ الفاظ میرے لئے کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔

(جاری ہے)

آخری نصیحت

عامر شہزاد-ننکانہ صاحب

رات کی تاریکی ہر سو مسلط تھی، نوجوان اٹھا اور ایک طرف کو چلنے لگا اور پھر وہ ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گیا، اور جب اس نے دیکھا تو جھونپڑی میں بابا جی کے سارے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی..... ناقابل یقین دل دہلاتی..... سبق آموز حقیقی کہانی

ہر انسان کی کامیابی کے پیچھے اللہ کی مہربانی کے بعد کسی نہ کسی کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ دنیا میں ہمیں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے ہماری زندگی بدل جاتی ہے۔ خزاں میں بہار اور تپتی ہوئی دھوپ میں چھاؤں میسر آ جاتی ہے۔ اسی طرح میری بے رونق زندگی میں جب میرا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیا تو ایک انسان نے میری قدم قدم پر مدد کی، اس نیک انسان کا احسان میں تاحیات بھلا نہ پاؤں گا۔

معزز قارئین! میں جو آپ بیتی آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ کوئی فرضی داستان یا قصہ کہانی نہیں بلکہ اس کی لکھی ایک ایک سطر جو بالکل حقیقت پر مبنی ہے ایک ایسی حقیقت جسے کم از کم میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ اس آپ بیتی کا آغاز سن 1979ء سے شروع ہوتا ہے۔

میرا نام اصغر ہے ایف اے کا طالب علم تھا ایک دن

دل کا دورہ پڑنے سے میرے والد محترم مقامی سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر کی عدم توجہ اور ابتدائی طبی امداد کی عدم دستیابی کی وجہ سے اس دنیا فانی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تکلیف کی شدت سے کوچ کر گئے۔

سات بہن بھائیوں میں میرا پہلا نمبر تھا والد کی وفات کے ساتھ ہی تمام رشتہ داروں نے ہم سے ایسے منہ موڑ لیا جیسے خدانخواستہ ہم سے مل کر وہ شاید کوئی کبیرہ گناہ نہ کر بیٹھیں۔ ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے مجھے تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور گھر کا چولہا جلانے کے لئے ایک رائس فیکٹری میں بطور مزدور ملازمت کرنا پڑی۔ میں سولہ سالہ گھنٹے کام کرتا سارا سارا دن بوریاں اٹھا کر ٹرکوں میں لاتا رہتا تب کہیں جا کر گھر کا انتظام چلتا کسی مخلص دوست نے مشورہ دیا کہ اوپن یونیورسٹی سے گھر بیٹھے بذریعہ فاصلاتی تعلیم داخلہ لے کر کام کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھوں میں نے اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے ایف اے میں داخلہ لے لیا۔

انہی دنوں فیکٹری میں میری ملاقات ایک نہایت معزز، خوش گفتار پرنور چہرے کے مالک بزرگ بابا سے ہوئی انہوں نے مجھے حوصلہ اور دعائیں دیں وہ اکثر فیکٹری میں گھومتے رہتے تھے مگر میری ملاقات آج پہلی بار ہوئی تھی وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولے۔

"اصغر بیٹا میں تمہیں روزانہ دیکھتا ہوں کہ تم بہت محنت کرتے ہو۔ بیٹے گھبرانا مت نماز پڑھا کرو اللہ تعالیٰ پر یقین کامل رکھو۔ انشاء اللہ ایک دن تم ضرور بڑے آدمی بنو گے اور تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی میں نے ان کا شکریہ ادا کیا وہ اکثر فیکٹری کی بیرونی دیوار کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ فیکٹری شہر سے دور دراز بیابان علاقے میں بنی ہوئی تھی اور قرب وجوار آبادی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

فیکٹری کے شمال کی طرف بزرگ بابا کی چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی جہاں وہ رات کو سونے ہی جاتے تھے بابا ہر وقت ذکر الٰہی اور دینی نعروں میں مشغول رہتے تھے ہر کوئی ان کی عزت کرتا اور اپنی بساط کے مطابق مدد بھی کر دیتا۔ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کوئی نہیں جانتا تھا مجھے ان پر بہت ترس آتا تھا اسی لیے میں نے ان کی مدد کرنے کا ارادہ کیا میں روزانہ ان کو کھانا لا کر دیتا اور ان کے کپڑے بھی خود دھو کر دیتا۔

اسی دوران مجھے بخار ہو گیا میں نے دو چھٹیاں کر لیں میں دیہاڑی دار ملازم تھا جس دن کام کرتا اسی دن کی مزدوری ملتی دوا کے لیے پیسے بھی نہ بچے تھے تو میرے لیے مزید چھٹیاں کرنا ناممکن ہو گیا لہٰذا مجبوراً فیکٹری جانا پڑا۔ رات کی ڈیوٹی تھی ابھی دو بوریاں ہی اٹھا پایا تھا کہ میری بس ہو گئی کمزوری اور بخار کی وجہ سے بیٹھ کر ہانپنے لگا اتفاق سے میرے دونوں ساتھی اس وقت میرے ساتھ نہ تھے تھوڑی ہی دیر بعد میرے کندھے پر کسی نے نرم سا ہاتھ رکھا، دیکھا تو بابا جی کھڑے تھے اتنی رات کو پہلی بار بابا جی کو فیکٹری میں دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ وہ نرم انداز سے بولے۔

"اصغر بیٹا میں جانتا ہوں کہ آج تم بخار میں تپ رہے ہو اور کام کرنے سے قاصر ہو اسی لیے میں تمہاری مدد کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ میرے سامنے بہت زیادہ بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جنہیں ہم نے مل کر تقریباً سات ٹرکوں میں لادنا تھا۔

بابا جی نے ان کی طرف دیکھا اور دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی اور آنکھوں کے اشاروں سے وہ ایک ایک بوری کو اٹھاتے اور ٹرکوں میں سلیقے سے رکھتے جاتے یہ منظر واقعی پراسرار اور حیران کن تھا۔ انہوں نے صرف اشاروں سے سارے ٹرک بوریوں سے بھر دیئے پھر کچھ مبارک آیات قرآنی پڑھ کر مجھے دم کیا تو میں جلد ہی تندرست اور ہشاش بشاش ہو گیا۔ بابا جی نے مجھے یہ بات کسی کو بتانے سے منع کر دیا اسی طرح جب بھی میں تنہا کام کرتا بابا جی آ کر میری مدد کر دیتے اسی وجہ سے میری زندگی سکون سے گزرنے لگی۔

دھیرے دھیرے میری تعلیم بڑھنے لگی اور میں نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔

ایک دن سیلری ٹائم پر نہ ملنے کی وجہ سے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ اور مجھے مجبوراً آدھی رات گھر واپس لوٹنا پڑا فیکٹری اور ہماری بستی کے راستے میں ایک قدیم اور ویران مندر موجود تھا۔ اس رات میں مندر کے قریب سے

گزر رہا تھا تو خلاف توقع مجھے اس کے اندر سے روشنی نظر آئی ذرا آگے جا کر غور سے دیکھا تو حیران و ششدر رہ گیا وہاں تو میلے کا سماں تھا لوگ ناچ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس علاقے میں تو ہندوؤں کی کوئی بستی نہیں ہے اور اس سے پہلے میں نے آج تک مندر میں ایسا کوئی نظارہ نہیں دیکھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ لوگ ہوا میں مندر کے ارد گرد گھومنے لگے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں برہنہ حالت میں گھوم رہے تھے۔ ان کے پاؤں زمین سے کافی اونچے اور لڑکیوں کے الٹے تھے الٹے پاؤں دیکھتے ہی خوف کی ایک خطرناک لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اسی دوران ان لڑکیوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور میں فوراً گھبراہٹ میں فیکٹری کی جانب بھاگنے لگا حالانکہ مجھے گھر کی جانب جانا چاہیے تھا میں اپنی تمام تر توانائیاں لگا کر بھاگ رہا تھا اور وہ لڑکیاں مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ اب تو ان کی شکلیں بھی ڈراؤنی ہو چکی تھیں وہ جانوروں کی طرح غرا رہی تھیں منہ سے آگ کے گولے نکال کر میری جانب پھینک رہی تھیں کہ اچانک ان کے اور میرے درمیان وہی بزرگ بابا حائل ہو گئے اور ان کا مقابلہ کرنے لگے اسی دوران میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں گر کے بے ہوش ہو گیا۔

میرے گھر والے میرے منہ پر پانی کے قطرے ڈال کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے دن نکل آیا تھا سورج کی کرنیں میری آنکھوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر سب نے سکھ کا سانس لیا ور بولے اصغر تمہیں کیا ہوا تھا، صبح نماز فجر کے وقت ہم اٹھے تو تم باہر دروازے پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے میں نے کمال مہارت سے بات کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اب میں جان چکا تھا کہ بابا جی کوئی عام انسان نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں اس دن سے میں نے ان کی خدمت میں اضافہ کر دیا۔

ایک بار رات کا کھانا میں ان کے لیے لے جانا بھول گیا یاد آتے ہی میں نے کھانا لیا اور ان کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ اب تو ان کی دعاؤں سے میں نے سائیکل بھی خرید لی تھی۔ جھونپڑی میں مدھم مگر واضح روشنی موجود تھی اندر کا منظر دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ دل دھک دھک کرنے لگا پسینے چھوٹنے لگے بابا جی کے جسم کے تمام اعضاء جھونپڑی میں بکھرے پڑے تھے اور ہر عضو سے ذکر الٰہی جاری تھا میں یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور کھانا وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ صبح جب میں ڈیوٹی پر گیا تو بزرگ بابا اپنی مقررہ جگہ پر ہی بیٹھے تھے میں نے ان کو ناشتہ دیا تو مجھے پریشان دیکھ کر بولے۔

"بیٹا ٹینشن نہ لو تم نے رات جو بھی دیکھا اس کا ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ کسی انجانی مشکل میں پھنس سکتے ہو۔ البتہ اگر تمہیں نماز عشاء کے بعد میرے پاس آنا ہو تو مجھے آواز دے کر پہلے بلا لیا کرو جھونپڑی میں اجازت کے بغیر ہرگز داخل نہ ہونا۔"

انہی دنوں میری والدہ بہت بیمار رہنے لگیں ساری جمع پونجی ان کے علاج پر خرچ ہو گئی اور ہم مقروض ہو گئے بابا جی نے میری پریشانی دیکھتے ہوئے مجھے نوٹوں سے بھرا ہوا پرس (بٹوا) دیا اور کہا۔ "اس کے اندر سے روپے نکالتے رہو۔ مگر کبھی اس کے اندر نہ جھانکنا خدا ہمیشہ تمہاری مدد فرمائے گا۔"

میں نے اس میں سے بے شمار روپے نکالے اور میں تمام ضروریات روپوں سے پوری کرتا رہا، ایک دن اچانک بزرگ بابا کہیں غائب ہو گئے سب نے بالعموم اور میں نے بالخصوص انہیں پورے علاقے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملے ان کے اچانک غائب ہونے سے جہاں سب حیران و پریشان ہوئے وہاں مجھے بھی بہت دکھ ہوا۔ اب تو وہ میری فیملی کا حصہ بن چکے تھے میں ان کی نصیحت کے مطابق اس سلسلے میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اکثر تنہائی میں ان کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا تھا۔

میں اس پرس سے روپے نکالتا رہا ایم اے تک تعلیم مکمل کی بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی شہر میں اچھا مکان خریدا پسند کی شادی کی۔ مقابلے کے امتحان کے ذریعے گریڈ 17 میں ملازمت حاصل کی غرضیکہ مجھے پروردگار نے اپنے فضل وکرم سے دنیا و جہاں کی تمام نعمتوں سے نوازا۔

یقیناً اس کے پیچھے بابا جی کی دعاؤں کا ہاتھ تھا۔ مجھے

یقین ہے کہ جو بھی بزرگوں اور فقیروں کی خدمت اور مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے تمام نعمتوں سے نوازتا ہے۔ لہٰذا سب کو چاہئے کہ وہ بڑھ چڑھ کر اس خاص نیکی کا حصہ بنے۔

کافی لمبے عرصے تک وہ پرس میرے پاس رہا میں اپنی تما ضروریات اس سے پوری کرتا رہا۔ میں نے بابا جی کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ نہ ملے میں ان کی جدائی میں تڑپتا رہا یہاں تک کہ رات دن دعائیں کرتا کہ کاش وہ مجھے خواب میں ہی مل جائیں۔ مگر میری خواہش پوری نہ ہوئی میں پرس کو سب سے چھپا کر اسٹور روم میں رکھتا تھا۔ تا کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے طفیل مجھے عمرہ کی سعادت بخشی میری غیر موجودگی میں جب میں عمرے پر گیا تھا تو میری بیوی نے اسٹور روم سے کچھ پرانا سامان کباڑیے کو فروخت کر دیا اسی میں پرس بھی ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا۔

واپسی پر جب مجھے معلوم ہوا کہ پرس گم ہو گیا ہے یعنی پرانے سامان میں چلا گیا ہے تو میں گھر والوں پر بہت غصہ ہوا کہ میری اجازت کے بغیر سامان کیوں فروخت کیا اس میں میری بہت ضروری اور اہم چیز تھی اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈوں کباڑیے سے پتہ کیا اسے بہت بڑی رقم کا لالچ دیا۔ مگر پرس کہیں سے نہ ملا مجھے پریشان اور اداس دیکھ کر گھر والے فکر مند ہوئے اور پوچھتے رہے کہ آخر سامان میں ایسی کونسی چیز تھی جس کے بارے میں ہمیں بتانا بھی مناسب نہ سمجھا اور حیرت ہے اتنی اہم چیز آپ نے اسٹور روم میں کیوں رکھی کم از کم سامان فروخت کرنے سے منع ہی کر دیا ہوتا۔

مگر میں مکمل خاموش رہا اور بات کو ٹال دیا، ایک رات بابا جی مجھے خواب میں نظر آئے مسکرا کر بولے۔ "اصغر بیٹا تمہارا پرس اب وہاں پہنچ گیا ہے جہاں کسی اور کو اس کی تم سے زیادہ ضرورت ہے اب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا بھر کی تمام نعمتوں سے نواز دیا ہے۔ لہٰذا اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصغر کیا تم میری ایک اور آخری خواہش پوری کرو گے؟" میں نے فوراً حامی بھر لی۔ تو وہ بولے۔

"بیٹا اگر تم مجھے خوش کرنا چاہتے ہو تو اس ملک میں موجود اولڈ ہاؤسز کی ہر ممکن مالی امداد کرو اور لوگوں کو بھی اس نیک کام کرنے کی ترغیب دو۔ کیونکہ اولڈ ہاؤسز میں وہ ماں باپ رہتے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے وقف کر دی۔ مختلف تہواروں میں بچوں کو نئے کپڑے وغیرہ دلا کر خود پرانے کپڑوں میں ہی خوش رہے بچوں کو بہترین تعلیم و تربیت دلانے کے لئے خود تپتی دھوپ میں جلتے رہے جب اولاد ان کی محنت و مشقت کے طفیل اپنی منزلوں پر پہنچ جاتی ہیں تو ان بوڑھے ماں باپ کو بوجھ سمجھ کر اولڈ ہاؤسز میں مرنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں اور پھر ان کی خیریت تک دریافت نہیں کرتے۔ اور وہ اپنی اولاد کا انتظار کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور ان کی اکثریت کی میتیں بھی انتظامیہ لاوارث قرار دے کر نا معلوم قبرستانوں میں دفن کر دیتی ہیں۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اذان فجر نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے صبح ہوتے ہی چند صاحب استطاعت لوگوں کی مدد سے خود ایک جگہ خرید کر ایک بڑے اولڈ ہاؤس کی بنیاد رکھی وقت گزرتا رہا اور میں کروڑ پتی بن گیا سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنا بزنس شروع کر دیا۔ اور اللہ نے مجھے بہت ترقی دی اب میرے بے شمار کاروبار ہیں، ہوٹلز، ٹرانسپورٹ، فیکٹریاں، ہاسٹلز اور دکانیں ہیں میں نا صرف اپنا اولڈ ہاؤس جس میں تمام جدید سہولیات موجود ہیں چلا رہا ہوں بلکہ دوسرے اولڈ ہاؤسز کی بھی مالی امداد کرتا ہوں اگر بابا جی میری ہزاروں خواہشوں کی تکمیل کے لے میری مدد کر سکتے ہیں تو میں ان کی ایک خواہش پوری کیوں نہیں کر سکتا؟ لیکن میں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ وہ معزز بزرگ آخر کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے؟ یہ معمہ کبھی حل نہ ہو سکا۔ آخری نصیحت کرنے کے بعد وہ مجھے کبھی خوابوں میں بھی نہیں ملے۔

بدصورت

عثمان غنی-پشاور

اچانک کمرے میں روشنی کا جھماکہ ہوا اور ایک روح نمودار ہوئی اس کی آنکھوں سے جیسے انگارے نکل رہے تھے کہ پھر اس کی کرخت آواز سنائی دی، پیارے بل میں تم سے اپنا انتقام لینے آئی ہوں اور یہ سنتے ہی.....

رات کے خوفناک اندھیرے میں جنم لینے والی دلوں پر دہشت طاری کرتی ڈراؤنی کہانی

پب میں بے شمار لڑکے اور لڑکیاں میوزک کے نام پر بے ہنگم طریقے سے بری طرح ناچ رہے تھے۔ کچھ لوگ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آجا رہے تھے، نائیٹ پب میں آج ڈسکو نائیٹ منائی جا رہی تھی۔ سارا، پب رنگین لائٹوں سے منور ہو رہا تھا۔

سامنے سے ایک لڑکی شراب کے نشے میں دھت، لڑکھڑاتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ لڑکی بے حد خوبصورت اور حسن میں اپنی مثال آپ تھی۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی بل سے ٹکرا گئی۔ بل جو پوری شدت سے ناچ رہا تھا، ایک دم سے وہ رک کر اپنے کندھے کو دیکھنے لگا۔ اس لڑکی کے گلے میں ایک خوبصورت سونے کی چین تھی، پہلے بل نے لڑکی کا جائزہ لیا، اور وہ اسے پہلی نظر میں اچھی لگی۔ لڑکی ہو تو تم جیسی! بل نے دل ہی دل میں کہا۔

برلن میں اس پب کے اندر جو بے ہنگم ناچ گانا ہو رہا تھا، وہ صرف اور صرف اس خوشی میں ہو رہا تھا، کہ روس کی فٹ بال ٹیم نے مخالف ٹیم کو بدترین شکست سے دوچار کیا تھا۔ سب بے حد خوش تھے۔ اور بل خود بھی ایک انرجیٹک اور خوبصورت لڑکا تھا۔ اسے خوبصورتی اٹریکٹ بھی کرتی تھی۔ اس لیے اس کی کمزوری خوبصورت لوگ تھے۔ اور یہ لڑکی جو بے حد خوبصورت تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ بل نے ہاتھ بڑھا کر اس کو سنبھال لیا۔

"باہر چلیں!" بل نے پوچھا۔، مگر پب کے اندر بے ہنگم میوزک کی ایسی تیز آواز تھی۔ کہ اس لڑکی نے کچھ بھی نہیں سنا۔

بل نے پی نہیں تھی۔ مگر وہ لڑکی پوری طرح نشے میں دھت تھی، اور اسی وجہ سے بے سدھ ہو رہی تھی۔

"باہر چلیں، یہاں بات نہیں ہو سکے گی۔" بل نے اس کے کندھے کو جھنجوڑ ڈالا۔ لڑکی نے خمار الود نظروں سے بل کو دیکھا، پھر اس کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو بل نے لڑکی کو سہارا دے کر پب سے باہر لے آیا۔ اور ایسا کرنے میں اسے کافی مشکل پیش آئی۔ کیونکہ لوگوں کا ناختم ہونے والا ہجوم تھا۔

باہر رات کی تاریکی نہ ہونے کے برابر تھی، کیونکہ رات کی تاریکی کو شہر کی روشنیوں نے دور بھگا دیا تھا۔

وہ لڑکی ابھی بھی بل کے سہارے کھڑی تھی۔

"تم کہاں سے آئی ہو؟" بل نے معلوم کرنا چاہا۔ کہ وہ کون ہے؟

"میں۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی اور بے ہوش ہو گئی، اور بل کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

"اوہ! ایک نئی مصیبت گلے پڑ گئی۔" بل نے اسے بانہوں میں اٹھایا۔ اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے گاڑی کا لاک دروازہ کھول دیا۔ اور اسے بیک سیٹ پر ڈال دیا۔ پھر اسکی پرس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کا آئی ڈی کارڈ اس نے بیگ میں سرچ کیا، پر میک اپ، اور پیسوں کے علاوہ بل کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا۔ اس لیے بل کو اس کا نام، اور رہائش کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

"میں اس حسین بلا کو کہاں لے جا سکتا ہوں۔" وہ سوچنے لگا۔ "بیٹھے بٹھائے نئی مصیبت گلے پڑ چکی ہے۔"

وہ کار میں بیٹھا، اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی، اور کار سٹارٹ ہو گئی۔ بیک سیٹ پر پڑی لڑکی کی آنکھیں جھٹکے سے کھل گئیں، مگر وہ بدستور اسی طرح پڑی رہی۔ اس کے خدوخال تبدیل ہونے لگے۔

اب کار، سڑک پر رواں دواں تھی۔ "واہ آج تو قدرت نے خود مجھے ایک خوبصورت موقع فراہم کر دیا ہے۔ کیوں نہ اس موقع سے خوب فائدہ اٹھالوں۔" بل دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اس نے بیک مرر میں لڑکی کو دیکھا، وہ اسی طرح سیٹ پر پڑی تھی۔

وہ بہت امیر تھا اور آج کل تنہا بھی تھا۔ اس کی بیوی نکی ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ اور بل اس کے بعد تنہا تھا، کئی لڑکیوں نے اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کو چاہتا نہ تھا۔ دراصل وہ اپنے بزنس کو پورا ٹائم دے رہا تھا۔ اس لیے وہ کسی لڑکی کے ساتھ اٹریکٹ نہ ہو سکا۔

اس کے پاس سب کچھ تھا۔ مگر پیار نہیں تھا، اور جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ تب اس کی زندگی میں پیار تھا۔ اس نے سب کچھ حاصل کرنے کے لیے پیار کی قربانی دے دی۔

☆.....☆.....☆

نکی ایک پینتیس سال کی عورت تھی مگر، وہ کئی شوہروں کو بھگتنے کے بعد، بلا آخر اس نے شادی کے نام سے توبہ کر لی۔ وہ ایک کامیاب بزنس وومن تھی، کارپوریٹ میں وہ ایک معتبر نام تھی۔ اس کے بزنس کی ساکھ بہت مضبوط تھی۔ اس کی پانچ کی پانچ شادیاں پے

در پے ناکام ہو چکی تھیں۔ وجہ اس کی بدصورتی تھی۔ اس نے اپنی بدصورت چہرے کو دولت سے بدلنے کی بہت کوشش کی، مگر ہر بار پلاسٹک سرجری کے بعد وہ مزید بری لگتی۔ پہلی شادی اس کی بیس سال کی عمر میں ہوئی، اس کا شوہر ایک امیر ترین شخصیت تھا، مگر امیری تو نکی کو بھی وراثت میں ملی تھی، اور اس آدمی نے صرف دولت کی وجہ سے اس کے ساتھ شادی کی۔ کہ اس کی دولت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ تبھی وہ، شادی کے بعد اسے وہ پیار نہ دے سکا۔ جو نکی کا حق تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتا۔ اور نکی کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ مگر نکی تب اتنی بدصورت تو نہیں تھی۔ وہ گندمی رنگ کی مالک تھی۔ اچانک وہ بال جھڑنا می بیماری کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بال جگہ، جگہ سے گنج پن کا شکار ہو گئے۔ اس نے اس بیماری کی روک تھام کے لیے خوب کوشش کی، مگر وہ پوری طرح سے گنجی ہو گئی۔ ایک تو بدصورت تھی۔ اوپر سے گنج پن نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ اس لیے مائیکل نے اس کو طلاق دے دی۔ وہ بہت روئی، مگر نا کام شادی کامیاب نہیں کرا سکی۔

دوسری شادی اس کی بہت جلد ہو گئی، اس کے گھریلو نوکر ایڈم سے!

ایڈم تو غریب تھا، مگر دل کا اچھا تھا۔ بس اس کی ایک بیماری تھی، اور وہ جب بات کرتا، تو اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ کر سامنے کھڑے شخص کو پاگل کر دیتے۔ اس لیے اس بار نکی نے ایڈم کی بیماری برداشت نہیں کی۔ اور اسے چھوڑ دیا۔ ایڈم کا خوبصورت وجود اس کی بیماری کے پس منظر میں گم کر دیا تھا۔ اور وہ تنہائی میں اس کی یہ بیماری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ شادی اس کے گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اس لیے نکی کے باپ نے ایڈم کا علاج شروع کر دیا۔ مگر بیماری کا پتہ لگتے ہی فوراً اپنی بیٹی کے فیصلے کو سراہا۔ اور ایڈم کو چلتا کر دیا۔ نکی اکلوتی اولاد تھی، اس کا باپ نکی کا گھر بسانا چاہتا تھا۔ اور زندگی میں سب کچھ نکی کے نام کر دیا تھا۔ وہ نکی کے بچے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ مگر اس کی بیٹی کی بدصورت چہرے کی وجہ سے اس زندگی، مشکلات کا شکار ہو گئی تھی۔ اس لیے دو شادیوں کے پے، در پے ناکامی کے بعد، نکی کے باپ نے اس کو بزنس میں مصروف کر لیا۔

ایک سال کے بعد جو بھی نکی کو دیکھتا، ایک بار دیکھنے کے بعد نگاہ چرا لیتا، اس کے چہرے کا گوشت جگہ جگہ سے لٹک گیا۔ اس کی ناک چپٹی ہو گئی، اور ہونٹ بھر بھرے، جیسے پھولے ہوئے غبارے! یہ سب ایک بیماری تھی، جس میں انسان وقت سے پہلے بوڑھا ہونے لگتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت عمر کا ہو چکا ہے۔ شروع شروع میں تو نکی نے پلاسٹک سرجریز کے سہارے بیماری کو قابو کیا، مگر وہ اس میں ناکام ہو گئی۔ اور یہ غم نکی کے باپ کی جان لینے پر تل گیا۔ وہ پیسہ پانی کی طرح بہانے لگا۔ مگر بیماری رکنے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی جھریاں نظر آنے لگیں۔

تب اپنی دولت اور جائیداد کو، بطور ہتھیار بنا کر اس نے پیپر میں اشتہار دیا۔

"جو میری بیٹی نکی سے شادی کرے گا اور شادی دو سال تک نبھائے گا، میں اپنی جائیداد اس کے نام کر دوں گا۔" نیچے نمبر اور ایڈریس لکھا تھا۔

اشتہار کے آنے کے بعد تو جیسے نکی کے لیے رشتوں کی لائن لگ گئیں، اس کے باپ نے ایک غریب لڑکے کو نکی کے لیے چن لیا۔ نکی بھی اپنی بیماری کا مقابلہ کر رہی تھی تو اس نے ہاں کر دی، مگر اسے پتہ تھا کہ اس کے بدصورت وجود نے اس کی یہ والی شادی بھی ناکام کر دینی ہے۔ کیونکہ وہ بھی تو کسی کی بیماری برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اور اسے چھوڑ دیا تھا۔

شادی دھوم دام سے ہوئی۔ اور شروع میں نکی اسپیل کے ساتھ خوش بھی بہت تھی۔ دونوں ہنی مون پر کئی ملکوں کی سیر پر بھی گئے۔ مگر شادی کے بعد اسپیل، گم صم اور پریشان رہنے لگا، اسے لگنے لگا، کہ نکی کے ساتھ رہتے ہوئے یہ بوڑھے پن کی بیماری کہیں اس میں نہ منتقل ہو جائے، اس لیے اسپیل نے نکی سے دور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اسپیل جو کچھ نکی اور اس کے باپ سے ہتھیا

سکتا تھا، ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ نکی کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تیسری شادی سے وہ خوش تھی، مگر یہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس شادی کی ناکامی نے نکی سے زیادہ اس کے باپ جوزف پر اثر ڈالا۔

اس بار نکی نے بزنس اور علاج میں خود کو مصروف کر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آئندہ اس کی زندگی مذاق بنے۔ اس لیے وہ دن رات محنت کرنے لگی۔ اور اس کا بزنس اتنا پھیلا کہ وہ خود حیران رہ گئی۔

اس کا باپ، نکی کی اولاد چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی شادی پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ مگر نکی اب اپنی زندگی کے ساتھ مذاق نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس بار اس کے باپ نے ٹھیک دو مہینے کے بعد ایک درمیانہ عمر مرد ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کاٹھ کا مالک تھا، اور اس کا چھوٹا قد جو تین فٹ اور گیارہ انچ کا تھا۔ مضحکہ خیزی کا سبب بنا تھا۔ چھوٹے قد کی وجہ سے وہ آدمی بدصورت لگتا تھا، اور اس لیے اسے معاشرے نے قبول نہیں کیا تھا۔ نکی کے باپ کا خیال تھا، کہ اس بار شادی کامیاب ہوگی۔ مگر تین شادیوں کے طلاق کے بعد نکی ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اور اس نے انکار بھی کر دیا تھا۔ اس بار جیسن نے اسے یقین دلایا کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔ تب بہت مشکلوں سے نکی اور ماٹھے قد کے مالک جیسن کی شادی ہوگئی۔ اور یہ شادی کافی لمبے عرصے تک چلی۔ مگر نکی کا باپ اپنی آخری خواہش لیے قبر میں چلا گیا۔ کیونکہ اس شادی سے نکی اور جیسن کی کوئی بھی اولاد پیدا نہ ہو سکی۔

اب نکی تیس سال کی اور جیسن بائیس سال کے تھے، مگر ان دونوں میں اب جھگڑے شروع ہو گئے۔ کیونکہ جیسن اس کے ساتھ بے وفائی کرنے لگ گیا تھا۔ اب جیسن کے پاس نکی کے باپ کے دیے ہوئے پیسے تھے۔ اور وہ کافی خوش تھا۔ وہ ڈرنک کرنے لگا تھا۔ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ آنے جانے لگا تھا۔ بقول نکی کے وہ اپنی اوقات بھول چکا تھا۔ نکی بدستور اپنا علاج کرانے میں مصروف تھی۔ مگر اس کو کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ دن بدن وہ کارپوریٹ مارکیٹ میں اپنی ساکھ مضبوط کر رہی تھی۔ اور ایک دن اس نے بھی عدالت کے تحت جیسن سے علیحدگی حاصل کر لی۔ اب وہ اکیلی تھی۔ اور زندگی سے خوش بھی تھی۔ وہ اب شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی عرصے تک وہ اکیلی رہی۔ کئی سال گزر گئے۔ اس بار وہ کوئی بچہ اڈاپٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ اور اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہی تھی۔ پانچ سال کا عرصہ اس نے اکیلے اور سخت محنت کرتے ہوئے گزارا۔

☆.....☆.....☆

بل یونی سے باہر نکلا، تو ازیبلا اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی۔ اور اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ ''بل تم یونی سے فارغ ہو گئے۔ اب تم جلدی سے کوئی بھی اچھا سا جاب ڈھونڈ لو، اور مجھ سے شادی کر لو۔''

''ہاں بالکل اب یہی تو زندگی میں کرنا ہے۔'' بل نے سائیکل کے ہینڈل کو پکڑا، اور اسے سائیکلوں کے بیچ میں سے نکالنے لگا۔ وہ سائیکل پر بیٹھ گیا۔ اور اس کے آگے ازیبلا بیٹھ گئی۔ اب وہ سائیکل چلا رہا تھا۔

''ازیبلا! کہاں چلنا ہے؟'' بل نے پوچھا۔

''خیر آج میں تمہیں تمہاری من پسند ڈش کھلاؤں گا۔''

''اوہ! تم مجھے بیچ کارنر لے چلو، وہاں آج خوب ہلا گلہ ہو رہا ہے۔'' ازیبلا نے کہا۔

''ابھی لے جاتا ہوں۔'' بل نے کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اور اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا۔ وہ اور ازیبلا ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مگر بل یونی میں پڑھ رہا تھا، اور پارٹ ٹائم جاب کر رہا تھا۔ اس لیے اس کا گزارہ ہو رہا تھا۔ مگر اب اسے جاب ڈھونڈنی تھی، اور زندگی میں کچھ نہ کچھ بن جانا تھا۔ بل ایک اکیلا نوجوان تھا، بہت سے دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح اس کے ماں باپ کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، کہ وہ کیسے اور کب اور کس بیس پر اس دنیا میں پیدا ہوا، اور وہ اپنے ماں باپ کی جائز اولاد تھا بھی یا نہیں؟ مگر اس کی ابتدائی پرورش یتیم خانے میں ہوئی، اور وہ اب خود کو یتیم ہی کہتا رہا تھا۔

اس کی سائیکل بیچ کارنر پر رک گئی۔ بل نے

سائیکل ایک طرف روکی، اور ازیبلا کے پاس آ گیا۔ ماحول میں اچھی رنگینی تھی۔ لوگ بیچ پر کھڑے، نعرے بازی کر رہے تھے۔ کچھ سمندر میں نہا رہے تھے۔ اور کچھ جھینگے کھا رہے تھے۔

ازیبلا بھی ایک طرف بیٹھ گئی، بل دوڑتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دونوں مستقبل کی باتیں کرنے لگے۔ اور ہنسی خوشی وہ لمحے گزارنے لگے۔

☆.....☆.....☆

نکی اس دن یتیم خانے گئی ہوئی تھی، مگر اس کو کوئی بھی چھوٹا نومولود بچہ نہ مل سکا۔ کیونکہ یتیم خانے کے سارے بچے بڑے تھے، اس لیے اسے واپس خالی ہاتھ جانا پڑا۔ واپس جانے کے بعد اس کے چہرے کے خدوخال بہت بدصورت ہو گئے تھے، اس لیے وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس لندن چلی گئی۔ اس بار لندن میں اس نے سرجری کے ساتھ، ساتھ دوسری مکمل چیک اپ بھی کرائی۔ اس نے اپنے سارے ٹیسٹ کرائے۔ اور اس کی رپورٹس نارمل آئی، وہ نارمل طریقے سے ماں بن سکتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ کوئی شادی کرتا تو وہ ماں کے رتبے پر فائز ہو سکتی تھی۔ چار شادیوں کی ناکامی کے بعد وہ کافی حد تک ڈر چکی تھی۔ اور ایک نیا تجربہ کرنے سے کترا رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر واٹسن نے اسے حوصلہ دیا۔ اور اسے کافی سمجھایا کے دنیا میں اب بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ تم کسی کو ڈھونڈ لو، اور ڈیل کر کے اس کے ساتھ شادی کر لو، جب تم ماں بن جاؤ، تو اگر وہ چاہے تو اس سے علیحدہ ہو جانا، اگر نہ چاہے تو ساتھ رہنا، ورنہ دوسری صورت میں تمہیں سوروگیسی ممی بننا ہو گا۔ سوروگیسی کا طریقہ نیا طریقہ تھا، اور یہ ان عورتوں کے لیے تھا، جو بانجھ تھیں۔ یا پھر ماں بننے کے عمل میں پیچیدگیوں کا شکار ہو چکی تھیں۔ مگر ڈاکٹر واٹسن اسے جو امید دے سکتا تھا، دے چکا تھا۔ اور اس نے اس بات پر سوچنا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر اسے سوروگیسی کے زریعے بے بی پیدا نہیں کرنا تھا، اسے نارمل بے بی چاہیے تھا۔ وہ واپس آ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ پینتیس سال کی تھی، اور بہت بڑے بزنس ایمپائر کی مالک تھی۔ اس کی کمپنی میں نئی بھرتیاں ہو رہی تھیں۔ اور ہیڈ ہونے کی وجہ سے وہ خود انٹرویوز لے رہی تھی۔ اور جب اس کی نظر انٹرویو، میں آئے ہوئے بل پر پڑی، تو اسے وہ کافی حد تک اچھا لگا۔ نکی کو زندگی میں کوئی تو اچھا لگا۔ اور وہ بھی پہلی دفعہ! اس سے پہلے جن چار مردوں سے اس کی شادی ہوئی تھی، وہ اس کی مجبوری تھی۔ ان شادیوں میں کوئی محبت نہیں تھی۔ اس لیے وہ کوئی پسند ناپسند کے معیار تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ بس ہو گئی تھی۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے بل کے کاغذات اچھے طریقے سے دیکھ لیے، تو اسے خوشگوار حیرت ہوئی، کیونکہ بل ایک یتیم تھا۔ اور اس کا کوئی خاندان نہیں تھا۔ اس نے بل سے سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔

وہ عمر میں پینتیس سال کی تھی۔ مگر لگتی ساٹھ سال کی تھی۔ اس لیے کہ اس کی بیماری ہی ایسی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سرجری کروائی تھی۔ مگر یہ سرجری اتنی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ بل چلا گیا۔ اور باقی سارے انٹرویوز بھی آرام سے ہو گئے۔ اس نے بل کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلا دن بل کی زندگی کا بہترین دن تھا، اسے خود کمپنی کی طرف سے جوائن کرنے کا لیٹر مل چکا تھا۔ اسے اتنی جلدی امید تو نہیں تھی۔ مگر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس لیے وہ ازیبلا کے پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ اور وہ آتے ہی اس کے گلے کا ہار بن گیا۔ اور اسے بانہوں میں اٹھا کر کہا۔

''ازیبلا مجھے جاب مل گئی۔ یہ دیکھو میرا جوائننگ لیٹر۔'' اس نے کاغذ ازیبلا کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ کل سے تمہیں جوتوں کی دکان پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ازیبلا خوشی سے اچھل پڑی۔

"ہاں بالکل! اب دیکھنا تم، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ہم دونوں ایک ہو جائینگے۔"

"مجھے تم پر یقین تھا ڈیئر!" ازیلا نے اس کے گلے لگتے ہی کہا۔

"اور مجھے خود پر! اب میں پیسے جمع کروں گا، تاکہ میں ایک اچھا گھر بنا سکوں۔ اور پھر تم اس گھر کو سجاؤ گی، سنوارو گی اور جب میں شام کو تھکا تھکا گھر لوٹ آؤں گا، تو تم میرے گلے لگو گی۔ اور پھر ہم اچھا سا ڈنر کرنے باہر چلیں گے۔

"ہاہا--ہاہا---تم بھی پورے پاگل ہو!" ازیلا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں تمہارے پیار میں پاگل ہو چکا ہوں۔" بل نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔

"ویسے ابھی تو انجوائے کرو! شادی کے بعد بچے اور پھر اس کو سنبھالنے کی مصیبتیں! تم مرد کیا جانو کہ ہم عورتیں گھر کیسے چلاتی ہیں۔"

"میں تمہارے بچے بہت پیار سے پالوں گا۔" بل ہنسا۔

"کیوں کیا وہ تمہارے بچے نہیں ہونگے۔" ازیلا برا مان گئی۔

"اوہ! وہ تو ہم دونوں کے بچے ہونگے۔ اور ہم دونوں ان کو بہت پیار سے پالیں گے۔ اور ان کی ہر خواہش کو پورا کرینگے۔" بل نے دونوں ہاتھوں سے ازیلا کا چہرہ پکڑا۔

"ہاں بالکل، اور ہماری زندگی بہت مثالی ہو گی۔"

اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگے۔

☆.....☆.....☆

آج بل کا آفس میں پہلا دن تھا۔ اور وہ اپنا دل کام میں لگانے کا پورا پورا کوشش کر رہا تھا، مگر اس کے پاس کچھ خاص کام تھا ہی نہیں، جس وجہ سے وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے کیبن میں بیٹھا ہوا کبھی اس طرف دیکھتا، تو کبھی اس طرف، اس کی تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔ اور وہ اس جاب سے بے حد خوش تھا اچانک اسے انٹر کام پر اس کی باس نے اپنے روم میں طلب کیا۔

وہ اٹھا اور اپنی لیڈی باس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اجازت لی، اور باس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بل! آج تمہارا پہلا دن کیسا ہوگا۔ یہ تم پر ہے کہ تم پہلے دن یہاں پوری طرح سے گزار پاؤ گے یا نہیں؟" نکی نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میم! میں سمجھا نہیں۔" اس نے سامنے بیٹھی ہوئی بدصورت چہرے والی باس کو دیکھا۔ اس پر دوسری نگاہ ڈالنا تک وہ نہیں چاہ رہا تھا۔

"بل! تم ایک نوجوان ہو، غریب ہو اور میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتی ہوں، اگر تم امیر بننا چاہو، تو بہت آسان طریقہ ہے۔"

"مگر، مجھے تو نوکری مل چکی ہے، اور میں اپنی اس جاب سے خوش ہوں۔" بل نے قدرے جتایا۔

"تمہیں یہ نوکری میں نے دی، تم ایک قابل لڑکے نہیں ہو، اور نہ تم اس پوسٹ کے اہل تھے۔"

"میں آپ کا مشکور ہوں، اور زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوگا۔" بل نے نکی سے کہا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ تم میری آدھی جائیداد، اور اس کمپنی کے مالک بن جاؤ، تو تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"

بل اسے حیرت سے دیکھنے لگا، اسے لگنے لگا کہ اس نے کہیں پی تو نہیں ہے۔

تم مجھے حیرانگی سے نہ دیکھو، میں سچ کہہ رہی ہوں، تم چاہتے ہو کہ تم امیر بنو، اور دولت مند کہلاؤ۔" نکی اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں جی دولت مند ہونا تو ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے، کہ وہ دولت مند ہو۔" بل نے کہا۔

"بالکل! مگر میں تم سے پوچھ رہی ہوں، میں نے تمہیں نوکری اس لیے دی، کیونکہ تم غربت میں پلے بڑھے ہو، اور تم کو اس نوکری کی ضرورت تھی۔ مگر تم اس

پوسٹ کے اہل نہیں تھے۔ میں نے تمہیں رکھا کیونکہ تم مجھے پسند آئے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں اپنی آدھی پراپرٹی تمہارے نام کر دوں گی۔ اور یہ کمپنی بھی!" نکی رکی۔ اور بل کو دیکھا۔ بل کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، اور ایک جا رہا تھا۔

بل نے نکی کے چہرے کو دیکھا، وہ اس دنیا کا سب سے عجیب چہرہ تھا، اور اسے لگا کہ یہ بڑھیا سٹھیا گئی ہے۔ تبھی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔

"اور تم انکار کرتے ہو تو، تم کو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونے ہونگے۔" نکی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

بل نے دونوں ہونٹ اپس میں جمائے۔ وہ بدستور اسی طرح خاموش تھا۔

"اور شادی سے پہلے میری کچھ شرائط بھی ہیں۔" نکی نے اس سے پوچھا، وہ دوٹوک ایسی بات کر رہی تھی، جیسے کہ کسی چیز کا سودا کر رہی ہو۔

"کیسی شرائط؟" بل کو اپنا منہ کھولنا ہی پڑا۔

"دراصل بل، تمہاری طرح میں بھی اکیلی ہوں، اور میرے مرنے کے بعد یہ سب کچھ ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں شادی کر لوں، اور اس جائیداد کا کوئی ایک وارث پیدا کر لوں۔ میں اور تم تب تک شادی کے بندھن میں بندھے رہیں گے، جب تک میں ماں نہیں بن جاتی۔" نکی نے اسے دیکھا۔

"مگر میم! مجھے نہیں لگتا کہ آپ ماں بن پائیں گی۔" بل نے جلدی سے کہا، اس بدصورت بڑھیا کو دیکھو اور اس کی خواہش کو دیکھو، بل دل میں گویا ہوا۔

"کیوں کہا، تم نے ایسا کہ میں ماں نہیں بن سکتی؟" نکی جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔

"میم! آپ کی ایج، زیادہ ہو گئی ہے۔" بل نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا کر کہا۔

"میری عمر صرف پینتیس سال ہے، اور یہ سب بکواس جو میں کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کر رہی ہوں۔"

"مگر آپ تو بہت زیادہ عمر کی لگتی---" بل

ڈاکٹروں، حکیموں اور ماہرین طب کی ہدایات سے لکھی گئی مفید کتاب

شوگر (ذیابطیس)

قیمت -/100 روپے

اس کتاب میں شوگر کیسے اور کیوں ہوتی ہے، شوگر صحت کے لئے سب سے سنگین خطرہ، ایکسپائر استعمال نہیں کرنی چاہئیں، بڑھتی عمر، شوگر کیا ہے، ٹائپ ون شوگر، ٹائپ ٹو شوگر، بلڈ پریشر کا خطرہ، ہائی بلڈ شوگر کے مریضوں کی سرجری خطرناک ہو سکتی ہے، شوگر کی پیچیدگیوں سے کیسے نمٹا جائے، احتیاطی تدابیر، شوگر اور ڈپریشن کا تعلق، افسردہ اداس مائیں اور بچے، نارمل بلڈ شوگر کیا ہے، جانچ کب کروائیں، شوگر بڑھنے کے اسباب اور تدارک، موٹے افراد کا خوف، سگریٹ نوشی، وجوہات، شوگر سے محفوظ رہنے والی خواتین، انفیکشن، بچوں پر ماؤں کا اثر، پیشاب کی نالی میں انفیکشن، ذیابطیس کے مریضوں کے لئے خطرناک بیماریاں، ڈپریشن، شوگر کی علامات اور اس سے بچاؤ کے طریقے، دیسی و ڈاکٹری نسخے پڑھئے اس کتاب میں۔

حکیم غلام مصطفےٰ

دعا بک کارنر نئی سڑک نمبر 5 امین پور بازار فیصل آباد

بات کرنے والا تھا۔ کہ نکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''لگتی ہوں، مگر ہوں نہیں بل، یہ ایک قسم کی بیماری ہے، جو لاکھوں میں سے کسی ایک انسان کو لگتی ہے، اس میں انسان وقت سے پہلے بوڑھا اور اس کا چہرہ بدصورت ہو جاتا ہے۔ میں اس بیماری کا شکار ہوں، میری صرف ظاہری حالت ایسی ہے، اندر سے میری عمر اس جوان عورت کی سی ہے، جس کے اندر جذبات کا ٹھاٹھے مارتا سمندر ہوتا ہے۔''

''او کے میم میں اس بارے میں کل تک سوچ کر جواب دوں گا۔'' بل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔ نکی نے بھی اسے روکا نہیں جانے دیا۔ اور وہ اپنے روم کے بجائے بلڈنگ سے نکلتا چلا گیا۔ اور اب وہ آفس سے باہر تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ وہ سیدھا چلتا گیا۔ اور اب وہ سڑک کنارے سست قدموں سے جا رہا تھا۔ وہ نجانے کتنی دیر چلتا رہا اسے کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ وہ کافی دیر تک اور بہت دور تک آ گیا تھا۔ مگر اس کے دل اور دماغ میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ وہ دل سے بے بس تھا، کتنے عرصے سے ازیبلا کو چاہتا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا بھی تھی، کہ وہ امیر بن سکے۔ اب قسمت اسے ایک موقع دے رہی تھی۔ تو وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

وہ بہت جلد اور کم عرصے میں امیر و کبیر بن سکتا تھا، مگر اس کی قیمت بہت بڑی تھی، وہ اپنی محبت کو کھو سکتا تھا، مگر کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔'' وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن وہ سج دھج کر تیار ہوا، اس نے پہلے ازیبلا سے بات کرنے کا سوچا۔ پہلے وہ کافی گھبرا گیا۔ مگر پھر مطمئن ہو گیا۔ ازیبلا سے وہ یہ بات چھپا تو نہیں سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے سمجھائے گا، اور وہ سمجھ جائے گی۔

وہ آفس گیا۔ اس نے ذہنی طور پر اس فیصلے کے لیے خود کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا، مگر نکی نے اسے نہیں بلایا۔ اس نے معلوم کیا تو اسے بتایا گیا، کہ آج میم آف پر ہے،

اسے شدید مایوسی ہوئی، اسے لگنے لگا، کہ شائد وہ بدصورت عورت نشے میں دھت ہو کر بکواس کر رہی تھی۔ اس کا سارا دن بے سکونی میں گزرا۔ چھٹی ہو گئی تو واپس آ گیا۔

اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی، اور شرٹ اتار پھینکا۔ بنا شرٹ کے وہ ایسے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ غصے میں ایسا ہی کرتا تھا۔

اچانک روم کا دروازہ کھلا، اور ازیبلا اندر داخل ہو گئی۔ وہ اس کے اوپر گر گئی۔ اور اسے بے تحاشا چومنے لگی۔ بل ہڑبڑا یا اور اس نے منہ موڑ کر دیکھا۔

''او تم ہو، میں سمجھا کہ کون ہے؟ جو ایسی حرکت کر رہا ہے۔''

''بل! تم کل سے رابطہ نہیں کر رہے ہو؟ کوئی پریشانی ہے کیا۔''

''ہاں میں کچھ پریشان تھا۔'' اس نے ازیبلا کو خود سے دور کیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا پریشانی تھی۔''

''کل تم میرے آفس آجاؤ، میں نے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' بل اٹھ کر دوبارہ شرٹ پہننے لگا۔

''کوئی بہت مسئلے والی بات تو نہیں!''

''تم سے کل میں وہاں بات کروں گا۔ آؤ باہر چلے، اس نے ازیبلا سے پوچھا۔

باہر سے تو ابھی میں آئی ہوں۔ اور پھر سے جانے کی بات کر رہے ہو، بل کیا بات ہے؟'' ازیبلا نے اسے اپنی طرف گھمایا۔

''ازیبلا کچھ نہیں، تم کل میرے آفس آؤ۔ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

''اچھا باہر چلتے ہیں۔'' ازیبلا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ عجیب ہونے والا ہے۔ وہ دونوں اب روم سے باہر جا رہے تھے۔ اور کافی دیر پیدل چلنے کے بعد، وہ ایک کافی شاپ کے

اندر چلے گئے۔ ویٹر انکے لیے دو کافی کے مگ لے آیا، ازیبلا نے اپنا مگ اٹھایا۔ اور اس کی طرف دیکھا۔

''تم کچھ پریشان ہو، بتاؤ گے نہیں۔'' ان کا عرصے کا ساتھ تھا۔ ازیبلا اسے دیکھ کر سمجھ جاتی تھی کہ وہ کچھ پریشان ہے۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ میں کل تمہیں بتاؤں گا، جب تم میرے آفس آؤ گی۔'' بل نے ٹیبل سے اپنا مگ اٹھایا۔

''ہوں! ٹھیک ہے۔'' ازیبلا نے سپ لیتے ہوئے کیا۔

دونوں ایک دوسرے کو کافی دیر تک دیکھتے رہے۔

☆.....☆.....☆

آج جب بل آفس آیا، تو نکی آ چکی تھی۔ بل کو حیرت ہوئی۔ اور وہ انتظار کرنے لگا، کہ میم اسے ضرور آج بلائے گی۔ دوسری طرف، اس نے ونڈو کے شیشے سے باہر دیکھا۔ تو باہر سڑک پر بے شمار گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ وہ ازیبلا کا بھی منتظر تھا۔ وہ اکیلا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ کل ازیبلا اگر اسے الزام دے تو وہ جواب تو دے سکے۔

اس لیے جب تک ازیبلا نہیں آئی، تب تک وہ بے چین ہی رہا۔

اچانک انٹر کام بجا۔ اس کے خیالات کی رو، واپس آ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ نیچے کاؤنٹر گرل کی کال تھی۔

''سر آپ سے کوئی لڑکی ملنے آئی ہے۔'' اس کے کانوں میں ریسپشن کی آواز آئی۔

''جی اسے اوپر بھیجیے گا۔ وہ میری جاننے والی ہے۔'' بل نے ہدایت دی۔

اب وہ ازیبلا کا منتظر تھا۔ اس نے وہیل چیئر گھمائی، اور وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نکی اپنے روم سے نکلی، اور کسی کام سے باہر جانے لگی۔ ازیبلا لفٹ سے باہر نکلی۔ اور سیدھا چلتی ہوئی نکی کے بالکل سامنے آ گئی۔ نکی پر اس کی نگاہیں ٹھہر گئیں، وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی، اور ازیبلا بھی اسے دیکھنے لگی۔ ''اتنا بھی کوئی بدصورت ہو سکتا ہے۔'' ازیبلا نکی کو دیکھ کر بولی اور اس پر دوسری نگاہ غلط تک نہ ڈالی۔ اسے نظر انداز کر کے سیدھا بل کے کیبن میں گھس گئی۔

''اوہ! یہ لڑکی کون ہے؟'' نکی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اور حیرت کا جھٹکا تب لگا وہ لڑکی جب بل کے روم میں داخل ہو گئی۔ نکی مڑی اور چل کر بل کے کمرے کے دروازے کے باہر رک گئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ لڑکی کون ہے؟

ازیبلا جب اندر گئی، تو بل کی پشت تھی، اور وہ دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

واؤ بل مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ یہ تم ہو، اور تمہیں کتنا شاندار روم ملا ہے۔'' ازیبلا چلتی ہوئی بل کے کندھے تک جھک کر کہا

بل نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اور خود اٹھ کر اس کو اپنی کرسی پر بیٹھایا۔

ازیبلا! تم نہیں جانتی میں جس مسئلے میں گرفتار ہوں، تم سے وہی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔

ازیبلا اسے دیکھنے لگی۔

''بل تمہیں پتہ ہے، ابھی باہر میں نے ایک بہت ہی بدصورت عورت کو دیکھا۔ سچ مانو تو میرا ایک نگاہ دیکھنے کے بعد، دوبارہ اسے دیکھنے کو جی نہ کیا۔ پتہ نہیں اس کے گھر والے اسے کیسے برداشت کرتے ہونگے۔'' ازیبلا نے تمسخر سے کہا۔

بل اسے دیکھنے لگا۔ اور خاموش ہو گیا۔

''تم بل کوئی مسئلے کی بات کر رہے تھے۔'' اس نے سوچوں میں گم بل کے آگے ہاتھ لہرایا۔

''ہاں، تم اس عورت کی بات کر رہی ہو، وہ اس گروپ آف کمپنی کی مالکن ہے۔'' بل نے اسے بتایا۔

''اچھا، اتنی بدصورت اور اڈھیڑ عمر۔ مجھے تو سچ

مانو، کوئی چڑیل لگی۔ کیا واقعی ایسا ہے۔" ازیلا نے ہنستے ہوئے کہا۔

بل نے اس کو دونوں شانوں سے تھاما، اور اسے نکی کے بارے میں بتانے لگا۔

"کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو، وہ پاگل ہو چکی ہے، اس کی عمر تو دیکھو، اور خواہش، وہ تمہیں صرف، سبز باغ دکھا رہی ہے۔" سب کچھ سننے کے بعد ازیلا غصے سے بول پڑی۔

"وہ واقعی سچ کہہ رہی ہے۔ اور اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔"

"مگر وہ ساتھی تم نہیں ہو، تم اگر اس کا ساتھ دو گے، تو مجھے چھوڑنا ہوگا۔ اور تم اس کی بکواس سننے کے بعد بھی اس کے آفس میں بیٹھے ہو، اگر کوئی اور ہوتا تو اس کے چہرے پر تھوک کر کب کا جا چکا ہوتا۔"

"ازیلا میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، مگر نکی سے شادی کر کے میں سب کچھ پا لوں گا، اور پھر جب اس کا بچہ پیدا ہو جائے گا۔ تو میں اس کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لوں گا۔ اور ہم بہت خوش رہیں گے۔"

"مجھے تمہاری دوسری بیوی نہیں بننا، اور اگر تم فیصلہ لے ہی چکے ہو، تو مجھے یہاں بلانے کی ضرورت کیا تھی؟ تم جو کچھ کرنا چاہو، کرو، مگر اس کے بعد میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔" ازیلا اٹھ کر جانے لگی۔ نکی نے اپنے کانوں سے سب کچھ سنا اور وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

"ازیلا، صرف دو ہی سال کی تو بات ہے۔" بل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ جسے ازیلا نے جھٹک کر چھڑا لیا۔ اور غصے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نکی اپنے روم میں چلی گئی، اور بل نے پریشانی سے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔ نکی کچھ سوچنے لگی۔ اس نے یہ فیصلہ بل پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ ازیلا کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نکی نے بل کو اپنے روم میں بلایا۔

"جی! میم آپ نے یاد کیا۔"

"ہاں بل، تم نے کیا سوچا، شادی کے بارے میں؟" نکی نے انجان بن کر پوچھا۔

"میں شادی کے لیے تیار ہوں۔" بل نے اعتماد سے کہا۔

"تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی ہے؟" اس سوال پر نکی نے اب فیصلہ کرنا تھا، کہ بل اگر جھوٹ بولے گا تو وہ اسے ریجیکٹ کر دے گی۔ کیونکہ اسے سب پتہ چل چکا تھا۔

"ہاں! اس کا نام ازیلا ہے، میں اسے آپ سے ملوانے کے لئے بلایا تھا۔ مگر وہ میرا یہ فیصلہ سن کر ناراض ہو گئی۔ اور چلی گئی۔" بل نے کہا۔

"تم نے سچ کہا، اور میں نے اس بات پر سوچا بھی، تمہاری ایک گرل فرینڈ بھی ہے، جو ہماری شادی سے دکھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی گرل فرینڈ سے شادی کر لو، میں تمہیں نوکری سے نہیں نکال رہی ہوں۔"

"نہیں میم! میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں، یہ میرا اپنا فیصلہ بھی ہے۔" بل نے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ کر کہا۔

"مگر تمہاری وہ گرل فرینڈ!" نکی نے کہنا چاہا۔

"وہ ابھی ناراض ہے مگر بعد میں میرے فیصلے سے بہت خوش ہوگی۔" بل نے یقین سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم آج ہی شادی کر لیتے ہیں، اور میں اپنی آدھی پراپرٹی اور یہ کمپنی تمہارے نام کر رہی ہوں، مگر تم تب تک شادی نبھاؤ گے۔ جب تک میں ماں نہیں بن جاتی۔ اور اگر اس سے پہلے تم نے شادی یا مجھے چھوڑنے کی کوشش کی۔ تو سب کچھ دوبارہ میرے نام ہو جائے گا۔"

"میں شادی نبھاؤں گا۔ اور جب تم ماں بن جاؤ گی۔ تب کوئی فیصلہ لوں گا۔"

"چلوں اٹھو، سارے آفس والوں کا منہ میٹھا کریں۔" نکی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

یہ فیصلہ بل کا اپنا تھا۔ نکی کا اس پر کوئی زور نہیں تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر آسانی سے سب کچھ اپنے نام کرانا چاہا تھا۔ نکی تو اس کو نوکری سے بھی نہیں نکال رہی تھی۔ مگر بل کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔ اسے دولت کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگلے دن دونوں نے میڈیا کے سامنے شادی کر لی۔ یہ خبر جب نیوز میں ازیلا نے سنی، تو غصے سے وہ ٹی، وی بند کر کے باہر نکل گئی۔

چند ماہ بعد!

نکی امید سے ہو گئی۔ اور اس کے وجود کے اندر ایک نئی زندگی نے جنم لیا، اس عرصے میں بل نے ازیلا سے رابطے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ازیلا اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بل کو زندگی میں ہر قسم کا عیش و آرام مل چکا تھا۔ مگر اس کی محبت اس سے چھن گئی تھی۔ اور وہ اس کی ذمہ دار نکی کو سمجھنے لگا۔

ماں بنتے ہی نکی اس سے علیحدگی لینے والی تھی۔

وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ نکی کی ڈلیوری میں، بس چند دن رہ گئے، وہ انتہائی حد تک، اپنی کیئر کر رہی تھی۔

مگر ایک دن پھر وہ ہو گیا جس کی اسے توقع تک نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے اسے تھوڑا، تھوڑا، سا چلنے پھرنے کی ہدایت دے رکھی تھی۔ وہ اکثر کمرے میں تھوڑی سی واک کر لیا کرتی تھی۔ اس دن بل بھی گھر پر تھا۔ اور نکی نیچے جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے بل سے کہا۔ کہ اسے نیچے لے جائے۔ بل نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔ پہلی سیڑھی، پر قدم رکھتے ہی نکی نے بل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسری تیسری سیڑھی تک خیر رہی، چھوتی پر قدم رکھتے ہی بل نے پوری قوت سے نکی کو دھکا دے دیا۔ وہ سیڑھیوں پر لڑھکڑاتی ہوئی فٹ بال کی طرح نیچے جانے لگی۔

آء۔۔آء۔ نکی کی چیخ کی گونج سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

"اگر تم بچہ پیدا کرو گی، تو آدھی جائیداد اس کے نام کر دیتی۔ مجھے تمہارا سب کچھ چاہیے۔" بل نے نخوت سے کہا۔

نکی لہو رنگ ہو گئی۔ اس کی چیخیں، پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ اور جب وہ سنگی فرش پر پہنچی۔ تو وہ اپنا پیٹ پکڑ کر درد سے بلبلا رہی تھی۔ وہ غیر یقینی سے بل کو دیکھنے لگی۔

"میں اس جائیداد میں حصہ دار نہیں چاہتا۔ تم جیسی بدصورت عورت کو اتنے عرصے برداشت کیا۔ اس سب پر اصولاً میرا حق بنتا ہے۔" بل اس کے سر پر کھڑے ہو کر چیخا۔ بل نے نکی کے سر پر زوردار لات ماری، اس کا سر زور سے گرل کے نیچے بنے دیوار سے ٹکرایا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

نکی کے مرنے کے بعد، سب کچھ بل کے نام منتقل ہو گیا۔ بل نے سب کو یہی بتایا کہ سیڑھیوں پر پھسلن کی وجہ سے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

نکی کے مرنے کے بعد وہ ازیلا سے ملنے گیا تھا، مگر اس کے شوہر ڈیم سے سامنا ہو گیا۔ تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ نکی کے مرنے کے بعد اور اس کی نظر میں ازیلا کی بے وفائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے خود کو بزنس میں دن رات مصروف کر لیا۔ اور لڑکیوں سے دور ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

بل نے گاڑی اپنے بنگلے کے سامنے روکی، اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے پچھلے سیٹ کا دروازہ کھولا، اور اس لڑکی کو گاڑی سے باہر نکالا۔ یہ پب میں اسے ملی تھی۔ اور ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس نے بے ہوش حسینہ کو بانہوں میں اٹھایا۔ اور اپنے گھر کے اندر لے گیا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔

تب حسینہ نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ بل نے اسے بیڈ پر ڈال دیا۔ اور اس پر جھک کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''تم بہت زیادہ خوبصورت ہو۔ میری سوچ سے بھی زیادہ۔'' بل نے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے۔

لڑکی کے چہرے میں دھیرے، دھیرے تبدیلی ہونے لگی۔ اور اس کا چہرہ نکی کے چہرے میں ڈھل گیا۔

''میں کوئی خوبصورت نہیں بے حد بدصورت ہوں۔'' نکی نے بل کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اسے اٹھا کر اپنے سامنے کیا۔

''نکی تم۔۔۔ تم تو مر چکی تھی۔''

''ہاں۔ اور مجھے تم نے مارا تھا۔'' نکی نے کہا۔ اب وہ لڑکی پوری طرح نکی کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔

''مگر تم یہاں کیسے؟ اور ابھی تو یہاں کوئی اور تھی؟ تم اس کے وجود میں ڈھل گئی۔ تم ایک روح ہو ناں!''

ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ نکی کا قہقہہ بہت بھیانک تھا۔

''میں تم سے اپنا انتقام لینے آئی ہوں۔'' وہ چیخی۔

بل نے بیڈ سے چھلانگ لگا دی، اور باہر کی طرف بھاگنا چاہا، مگر نکی کا ہاتھ ربڑ کی طرح لمبا ہو گیا۔ اور بل کو گردن سے پکڑ کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ وہ کسی فٹ بال کی مانند اچھلا۔

بل کی چیخ ارتعاش کی طرح کمرے میں پھیلنے لگی۔

''یہ سب کچھ اب ٹرسٹ کو جائے گا، تم ان سب کے حق دار نہیں ہو۔'' کمرے کی الماری کھل گئی، اور کاغذ، اُڑ کر باہر آنے لگے۔ ہوا میں پین اڑتا ہوا آیا۔ اور بل کے رائیٹنگ میں وصیت لکھنے لگا۔

''تم خودکشی کر رہے ہو۔ ہاہاہا۔۔۔'' نکی استہزائیہ ہنسی۔

کمرے میں رسی اُڑ کر آئی۔ اور بل کے گلے میں بندھنے لگی۔

''نکی تم مجھے چھوڑ دو۔'' بل کے پسینے چھوٹ گئے۔

''تم نے مجھے موت دی ناں! میں تمہیں وہی لوٹا رہی ہوں۔ ہاہاہا۔۔۔

اس نے فین سے رسی باندھ دی، اور بل کو رسی کے ذریعے گردن سے لٹکا دیا۔ بل کی آنکھیں باہر ابلی ہوئی تھی۔

نیچے وصیت پڑی تھی۔

میں بل بہ ہوش و حواس یہ وصیت تحریر کر رہا ہوں، کہ نکی کو میں نے جائیداد کی خاطر مار ڈالا تھا۔ مگر جس سے میں محبت کرتا تھا۔ میری محبوبہ نے میرے ساتھ بے وفائی کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں اس غم کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور خودکشی کر رہا ہوں۔ اس لیے میرے مرنے کے بعد میرا سب کچھ ٹرسٹ کو چلا جائے۔

اس کے آگے تاریخ، وقت درج تھا۔

کئی دنوں کے بعد لوگوں کو پتہ چلا، بل کی لاش سڑ چکی تھی۔ کیونکہ گھر کے باہر نکی نے بڑا سا تالا ڈال دیا تھا۔ نوکر تالے کی وجہ سے گھر میں کئی دنوں تک داخل نہ ہو سکے۔

ازبلا نے جب یہ نیوز چینل پر دیکھی تو اس کے ساتھ ڈیم بیٹھا ہوا تھا۔

''ڈارلنگ لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اتنے امیر ہو کے خودکشیاں کر رہے ہیں۔''

''ہاں امیر سنکی ہوتے ہیں۔ اتنے مال کے باوجود ان کو سکون کی نیند نصیب ہی نہیں ہوتی۔'' ڈیم نے ہلکا سا تبصرہ کر کے چینل تبدیل کر دیا۔ ازبلا کو کوئی دکھ نہیں تھا۔ اسے لگنے لگا، کہ بل کو صرف دولت سے محبت تھی۔ اگر اس سے پیار کرتا، تو کچھ تو اس کے نام چھوڑ جاتا۔ سب کچھ تو ٹرسٹ کو دے دیا۔

''ہونہہ! اب جہنم میں بل اور نکی ایک ساتھ ہوں گے۔'' ازبلا نے سوچا۔ اور مسکرا دی۔ وہ جیسی بھی تھی، پر اپنی زندگی میں ڈیم کے ساتھ خوش تھی۔

خونی آپ بیتی

رشک نور۔ فیصل آباد

ہر طرف درخت ہی درخت تھے ہر شے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، آسمان پر کالے بادل ڈیرہ جمائے ہوئے تھے، چاند بھی بادل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا کہ اتنے میں.....

سبق آموز کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے دل و دماغ کو مہمیز کرتی حقیقی کہانی

آصفہ، صائمہ، عمران اور کامران اپنی گاڑی میں بیٹھے تھے، رات کے ڈیڑھ کے قریب ٹھنڈی ہوا اور سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ''بھوک لگی ہے مجھے سنو۔'' صائمہ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔'' عمران نے بھی صائمہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

عمران گاڑی موڑتے ہوئے بولا۔ ''چلو انہیں کھلا دیتے ہیں ورنہ یہ ہمارا دماغ کھا جائیں گی۔'' اس بات پر کامران کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ تو آصفہ اور صائمہ ان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگیں تو کامران ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا سوری۔ غصہ تو نہیں کرو۔'' عمران نے بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گی۔؟'' صائمہ اپنے سنہری بالوں کو سیٹ (SET) کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو

چکن رول کھاؤں گی۔"

"سنو یار" آصفہ لپ اسٹک لگاتے ہوئے بولی۔ "میں تو سینڈوچز کھاؤں گی۔"

کچھ ہی دیر میں یہ لوگ ہوٹل میں تھے اپنا اپنا آرڈر دے چکے تھے اب کھانے کا انتظار تھا اور پھر چند منٹ میں ان کا آرڈر آ گیا۔ تو چاروں کھانے میں مصروف ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد صائمہ بولی۔ "تم لوگ کھانا کھاؤ میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔"

آصفہ، صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ok جلدی آنا۔"

"یار ہم نے کھا بھی لیا لیکن صائمہ ابھی تک نہیں آئی۔" عمران پریشانی میں بولا۔

کامران اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

تو عمران مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں دیکھ کر آؤ۔ تمہاری یہ ہمیشہ لیٹ کرتی ہے۔" اتنے میں صائمہ کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں وہ دوڑتی ہوئی آئی اور کامران کے گلے آ لگی۔

"کیا ہوا؟" صائمہ تم رو کیوں رہی ہو۔" آصفہ، صائمہ کی طرف پریشانی کی حالت میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"و.....وہ.....ہ.....وہ.....آ.....آ" صائمہ واش روم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ درست جملہ بھی ادا نہ کر پا رہی تھی۔

"واش روم میں کیا ہے۔" کامران صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ صائمہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی، اور قطعی بات کرنے کی حالت میں نہ تھی۔

واش روم میں تو کوئی نہیں ہے۔" صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کامران بولا۔ "تم لوگ صائمہ کو گاڑی کی طرف لے کر چلو میں بل ادا کر کے آتا ہوں۔"

صائمہ گھبراتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے، میں بول رہی ہوں نا وہ عورت وہ عورت مجھے اپنی آنکھیں نکال کر دے رہی تھی۔"

"میں خود چیک کر کے آیا تھا واش روم میں کوئی نہیں تھا۔" صائمہ کی بات کو غلط ٹھہراتے ہوئے کامران بولا۔

آصفہ بولی۔ "صائمہ تم کو شاید کوئی وہم ہوا ہو تم فکر نہیں کرو ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔"

☆.....☆.....☆

ہر طرف درخت ہی درخت تھے، ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی، اندھیرا اس قدر تھا کہ کچھ بھی نظر آنا مشکل تھا، آسمان پر کالے بادل ڈیرا جمائے ہوئے تھے چاند بھی بادل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا، بادل ہٹتے تو چاند کی روشنی زمین پر آتی۔ جس سے آگے جانے کا راستہ نظر آتا۔ اس پراسرار ماحول میں بلی کی گرج اور بھی خوفناک منظر پیش کرتی تھی۔

"یہ میں کہاں ہوں یا اللہ یہ کونسی جگہ ہے۔" صائمہ اردگرد دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ اور ہماری گاڑی، کامران، عمران، اور آصفہ کہاں ہیں۔ پھر اس نے اونچی آواز میں اپنے ساتھیوں کے نام پکارے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا بی بی جی، آپ فکر کیوں کر رہی ہیں میں ہوں ناں آپ کی خدمت کرنے کے لیے۔" ایک عجیب آواز آئی تو صائمہ نے دہل کر اس طرف دیکھنے لگی۔ وہ حواس باختہ تھی، خوف نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک مرتبہ پھر صائمہ نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا تو وائٹ کپڑوں میں ملبوس ایک عورت جس کے سفید بال اس کے چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ عورت صائمہ کی طرف بڑھنے لگی۔

تو صائمہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "کون ہو تم؟" مگر بدستور وہ عورت خاموشی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"میں پوچھ رہی ہوں کیوں تنگ کر رہی ہو مجھے، کون ہو تم۔" صائمہ چیختے ہوئے بولی۔ "اور میرے دوست کہاں ہیں؟"

"وہ سب تو وہیں ہیں، بس تم میرے پاس ہو۔"

عورت اپنے چہرے سے بال پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

اس عورت کا چہرہ دیکھتے ہی صائمہ کے بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس عورت کا آدھا چہرہ جلا ہوا تھا، آنکھیں اس قدر سرخ تھیں جیسے جسم کا سارا خون آنکھوں میں اتر آیا ہو۔

"آپ مجھ سے ڈر کیوں رہی ہیں بی بی جی، میں نے تو ساری عمر آپ کی خدمت کی ہے، یہ میری طرف سے تحفہ لیں آپ۔" عورت نے اپنی آنکھیں نکال کر صائمہ کی طرف بڑھا دیں۔" صائمہ اس کی ہتھیلی پر اس کی آنکھیں دیکھ کر بری طرح لرز گئی۔ اس کے جسم پر کپکپی سوار ہوگئی۔

اور پھر چشم زدن میں صائمہ وہاں سے بھاگنے لگی تو عورت صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے بولی۔ "بی بی جی کیوں بھاگ رہی ہو واپس تو میرے پاس ہی آؤ گی۔" عورت نے یہ کہتے ہوئے پھر بلند قہقہہ لگایا۔

صائمہ مسلسل بھاگتے ہوئے تھک چکی تھی۔" میں اب مزید بھاگ نہیں سکتی۔" صائمہ زیر لب بڑبڑائی۔ "بس سوئیٹ ہارٹ اور نہیں بھاگو گی۔" صائمہ کو اپنے پیچھے سے اسی عورت کی آواز سنائی دی۔

آواز سنتے ہی صائمہ نے پھر سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلسل بھاگتے بھاگتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ اس وقت آسمان بھی صاف ہو گیا تھا چاند کی روشنی سے اب سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا صائمہ بغور اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھ رہی تھی وہ اسی جگہ پر تھی جہاں سے اس نے بھاگنا شروع کیا تھا۔

"بھاگ لیا مری جان اور کتنا بھاگو گی۔" صائمہ کے پیچھے موجود وہ عورت بولی۔

"مجھے تنگ نہ کرو، تم کون ہو؟ بتا دو تم کون ہو؟ اور میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو پلیز!" صائمہ نے روتے ہوئے اس عورت سے پوچھا۔

"رکو بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں۔" وہ عورت صائمہ کے سامنے اپنی انگلی نچاتی ہوئی بولی۔ اس نے اپنی کمر سے ایک بیلٹ کھولا جو اس نے کمر کے ساتھ باندھی ہوئی تھی اور پھر اچانک بیلٹ کی مدد سے زور زور سے صائمہ کو مارنے لگی۔

صائمہ درد کی شدت سے چیخ رہی تھی۔ "Please مجھے چھوڑ دو جانے دو، رحم کھاؤ مجھ پر۔"

"تجھ پر رحم کھاؤں۔" عورت نے حقارت کی نظر سے صائمہ کو دیکھا اور قہقہہ لگانے لگی۔

☆.....☆.....☆

"صائمہ میری جان تم کیوں چلا رہی ہو اٹھو کیا ہوا تم کو جلدی اٹھو۔" کامران نے صائمہ کو نیند سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے جھٹ اپنی آنکھیں کھولیں۔

"تم لوگ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے تم لوگ مجھے مارو نہیں۔" صائمہ بدحواسی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔ کامران نے صائمہ کو جھنجھوڑا۔

"کیا اول فول بولے جا رہی ہو، لگتا ہے کوئی برا خواب دیکھا ہے تم نے؟"

پھر صائمہ نے اپنے اردگرد دیکھا، آصفہ، عمران، کامران سب اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

نہ وہ جنگل تھا نہ ہی وہ عورت، صائمہ اپنی گاڑی میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ "تو یہ خواب تھا۔" صائمہ نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

عمران نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ خواب ہی تھا۔" کہ اتنے میں صائمہ کو اپنے بازو میں کچھ درد محسوس ہوا۔ تو اس نے بازوں دیکھے تو وہ حیرت بھری نظروں سے بازوں کو دیکھنے لگی، اس عورت نے صائمہ کو بیلٹ سے مارا تھا وہاں بیلٹ کے زخموں کے نشان اس کے بازوؤں پر واضح نظر آ رہے تھے۔

اگر وہ خواب تھا تو میرے بازو پر یہ نشان کیسے آئے، خواب میں وہ عورت مجھے مار رہی تھی اور یہ نشان بھی اس کے بیلٹ سے مارنے کے ہیں وہ عورت اپنی آنکھیں نکال کر مجھے دے رہی تھی۔" صائمہ بازو کے نشان دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ میری باتوں کا یقین

کرو کوئی ہے جو مجھے پریشان کر کے مارنا چاہتی ہے۔"

آصفہ بولی۔ "میں ایک بابا کو جانتی ہوں وہ اس سلسلے میں ہماری ضرور مدد کر سکتے ہیں۔"

کامران، آصفہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چلو وہاں چلتے ہیں۔" اور پھر وہ چاروں کچھ دیر میں بابا کے آستانے پر موجود تھے۔ تھوڑی انتظار کے بعد بابا نے چاروں کو کمرے میں بلایا، کمرے کی اندر جگہ جگہ انسانی کھوپڑیاں اور سرخ رنگ موجود تھے۔

ہرا چوغہ زیب تن کیے وہ بابا آگ کے سامنے بیٹھے کچھ منتر پڑھ رہے تھے۔

"بچو! آؤ بیٹھو....." بابا آگ میں کچھ ڈالتے ہوئے بولے۔ جیسے وہ آگ میں سفوف ڈالتے تو آگ مزید بھڑک اٹھتی تھی۔ بابا نے بغور ان چاروں کو دیکھا اور بولے۔ "گھبراؤ نہیں، غلطی اپنوں کی ہے ویسے وہ عورت اپنی جگہ بے قصور ہے۔ کھرا اور کھوٹا میرے سامنے عیاں ہو گیا ہے اور میں نے اس عورت کو اپنے عمل سے قید کر دیا ہے، ویسے بھی وہ اپنی خونی آپ بیتی سے تم لوگوں کو آگاہ کرے گی۔"

"پر بابا جی ابھی تو ہم نے آپ کو اپنا مسئلہ سنایا نہیں تو آپ کو سب کیسے پتا چلا۔" اس بار کامران بولا۔

کامران کی بات سن کر بابا مسکرائے اور پھر گویا ہوئے۔ "بچو! جو بھی میرے آستانے پر آتا ہے تو اس کے مسائل میرے سامنے آجاتے ہیں اور میں ان کے دل میں پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہوں تم لوگ آرام سے بیٹھو اور پھر کچھ بھی نظر آئے اسے تحمل سے دیکھنا۔ جو بھی حقیقت ہے وہ سامنے آجائے گی اور وہ عورت صائمہ کو کیوں تنگ کر رہی ہے، وہ بھی سامنے آجائے گا۔"

"کسی قسم کا ڈر خوف محسوس نہ کرنا۔ اچھا اب میں اپنا عمل شروع کرتا ہوں۔ تم لوگ خاموشی سے بیٹھے رہو۔"

اور پھر بابا جی نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک آستانے کے ایک کونے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم..... بابا جی آپ نے مجھے بلایا میں حاضر ہوں میرے لئے کیا حکم ہے۔"

نسوانی آواز سن کر بابا جی گویا ہوئے۔ "تم اپنے اصلی خدوخال میں آؤ..... تاکہ پتہ چلے تم کون ہو اور بتاؤ کہ تم کیوں صائمہ کو تنگ کر رہی ہو۔ تاکہ یہ سچ جان جائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اور ویسے بھی مجرم کوئی اور ہو اور سزا کسی اور کو ملے یہ اچھی بات نہیں۔ اصل مجرم کو اس کے کرتوتوں کی سزا ملنی چاہیے۔" یہ بول کر بابا جی خاموش ہو گئے تو نسوانی آواز پھر سنائی دی۔

"جی بابا جی آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ آپ کے حکم کے مطابق میں اصل حقیقت اور ظلم کی روداد، ان بچوں کو سناتی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی آستانے کے کونے میں دھواں اٹھنا شروع ہوا۔ پھر چند منٹ بعد دھوئیں نے ایک انسانی خدوخال اختیار کر لیا، تو اب اس جگہ ایک عورت مجسم کھڑی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی صائمہ کے منہ سے نکلا۔ "رضیہ تم۔"

"ہاں..... بی بی جی میں بدنصیب رضیہ ہوں آپ لوگوں کی خدمتگار۔"

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ کی دونوں آنکھوں میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی، آپ تکلیف سے دوچار تھیں، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر جلد از جلد آنکھوں کا انتظام نہ ہوا تو آپ کی دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں گی اور پھر زخم کینسر میں تبدیل ہو جائے گا۔ آپ ہسپتال میں تھیں۔

آپ کے بابا آپ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھے، آنکھوں کا انتظام ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کون شخص ہو گا جو پوری زندگی کے لئے خود اندھیرے میں چلا جائے یعنی وہ خود اندھا ہو جائے اور کسی اور کی زندگی کو روشن کر دے۔

اور پھر ایک رات میری بیٹی زینت غائب ہو گئی۔ میں تڑپتی رہی روتی رہی مگر زینت کا کوئی سراغ نہ ملا، زینت کی وجہ سے آپ کے بابا بھی بہت پریشان تھے، ایک روز انہوں نے کہا۔ "رضیہ کہیں ایسا تو نہیں کہ زینت کسی اور کے

ساتھ....." اور انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

صاحب کی بات سن کر میں جھٹ بولی۔ "صاحب جی ایسا ممکن نہیں، میری زینت ایسی نہیں..... مجھے تو لگتا ہے کہ کسی ظالم نے اسے اغوا کر لیا ہے۔"

یہ سن کر صاحب بولے۔ "رضیہ میں بھی دعا کرتا ہوں تم بھی دعا کرو کہ زینت کی کوئی خبر مل جائے۔"

بہر حال میں بہت پریشان تھی اور مجھ سے کہیں زیادہ پریشان آپ کے بابا لگتے تھے۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک روز صاحب جی سے ملنے ان کے تین دوست آئے تو صاحب نے مجھ سے کہا کہ "رضیہ چار کپ چائے بنا دو۔"

صاحب کی بات سن کر میں چائے بنانے چلی گئی۔ اور جب پلٹی تو اچانک میرے قدم دروازے پر جم سے گئے۔ کیونکہ باتیں ہی ایسی تھیں۔

اندر کمرے سے صاحب کی بات سنائی دی صاحب کہہ رہے تھے۔ "میں تم تینوں کا بہت شکر گزار ہوں کیونکہ تم نے میری بہت مدد کی۔ صائمہ صحت یاب ہو رہی ہے۔ زینت کی آنکھیں صائمہ میں لگنے کے بعد اب صائمہ کی زندگی کا خطرہ ٹل گیا۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے زینت کو نیچے تہہ خانے میں دفن کر دیا۔"

اور یہ سننا تھا کہ اچانک چائے کی ٹرے میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ اس کے بعد تو قیامت مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ صاحب سمیت ان تینوں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ اور میرے منہ پر فوراً رومال باندھا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے نیچے تہہ خانے میں لے گئے اور آناً فاناً مجھے موت کے گھاٹ اتار کر تہہ خانے میں دفن کر دیا اور تہہ خانے سے چلے گئے۔

اور جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو زینت کی روح میرے پاس آئی..... اور پھر ہم دونوں کی روحیں ایک دوسرے سے لپٹ کر سسک پڑیں۔ اور پھر میں نے عہد کیا کہ تمہارے باپ دلاور اور تمہاری زندگی کو اجیرن کر دوں گی۔ میں دلاور کو عبرت کا نشان بنا دوں گی اور ساتھ میں تمہیں بھی۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں میں میری زینت کی آنکھیں ہیں جو کہ تمہاری زندگی کو روشن کر رہی ہیں اور ایک ماں کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی بچی۔" اور رضیہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ بابا جی گویا ہوئے۔

"بچو! تم لوگوں کے سامنے اصل حقیقت عیاں ہو گئی۔ اور تم لوگوں نے یہ جان لیا کہ صائمہ کا باپ کس قدر ظالم شخص ہے۔ جس نے اپنی اولاد کے لئے دو زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو رضیہ میرا تم سے کہنا ہے کہ اصل کام صائمہ کے باپ کا ہے۔ اس میں صائمہ بالکل بے قصور ہے۔

اور یہ بھی اچھی بات ہے کہ زینت کی آنکھیں کسی کے کام آ رہی ہیں۔ اور میرے خیال میں دلاور کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔ رضیہ تم میری بات مان لو..... اور اس عمل سے خدا بھی خوش ہو گا۔"

بابا جی کی بات سن کر رضیہ بولی۔ "ٹھیک ہے بابا جی میں آپ کی بات قبول کرتی ہوں لیکن دلاور کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔"

یہ سن کر صائمہ بولی۔ "رضیہ آنٹی آپ بے فکر رہیں میں اپنے باپ کو خود سزا دلواؤں گی۔ کیونکہ ایک ظالم کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔ جو غلطی میرے باپ نے کی ان کو اس کی سزا ملے گی۔"

اور پھر صائمہ کے کہنے پر پولیس نے تہہ خانے سے ان دونوں کی لاشیں نکال لیں اور ساتھ میں ٹیپ رکارڈر بھی پولیس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ جس میں دلاور خان کے خلاف سارے ثبوت تھے۔ پولیس نے دلاور کو گرفتار کر لیا۔ صائمہ نے ٹیپ رکارڈ بھی پولیس کو فراہم کیا تھا جس میں تینوں دوستوں کی باتیں بھی ریکارڈ تھیں۔

صائمہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ پرہمت لہجے میں بولی۔ "میں اپنے بابا کی بہت عزت کرتی ہوں۔ لیکن سزا ایک مجرم کو دلوائی ہے۔"

دلاور کو پھانسی کی سزا ہوئی اور اس کے تینوں دوستوں کو عمر قید کی سزا۔

ویران مکان

فرح انیس-کراچی

وہ بھی کیا کرتا غربت نے اسے یہاں شہر آنے پر مجبور کیا تھا گائوں میں ایسا کوئی مناسب کام تھا نہیں جس سے وہ اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کرتا والد کم عمری میں ہی فوت ہوگئے تھے وہی گھر کا بڑا تھا.....

خونچکاں بھونچکاں اور دل پر سکتہ طاری کرتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب خوفناک کہانی

دور تک جاتی سنسان سڑک اور گہرا ہوتا اندھیرا، حارث کی پریشانی میں اضافہ کررہا تھا، ایک تو اوپر سے اجنبی شہر کوئی جان پہچان کا بھی نہیں تھا، وہ پریشان نظروں سے اپنے اطراف میں دیکھ رہا تھا، بس سے اترنے کے بعد اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کے وہ کس طرف جائے اسے لگ رہا تھا اس نے یہاں آنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے پر وہ بھی کیا کرتا غربت نے اسے یہاں شہر آنے پر مجبور کیا تھا گاؤں میں ایسا کوئی مناسب کام تھا نہیں جس سے وہ اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کرتا والد کم عمری میں ہی فوت ہوگئے تھے وہی گھر کا بڑا تھا۔

ماں نے سمجھایا تھا اسے شہر آنے سے پہلے مگر اس کے سر پر تو شہر آکر نوکری کا بھوت سوار تھا وہ بھی کیا کرتا گھر کے حالات سے پریشان ہوگیا تھا۔

چل بیٹا اللہ مالک ہے حارث جب یہاں آ ہی گیا ہے تو اللہ کوئی اسباب بھی مہیا کر ہی دے گا وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتے ہوئے بیگ اٹھائے انجان راستے کی جانب گامزن تھا بڑھتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اسے ٹھیک نظر نہیں آرہا تھا کے وہ کس طرف جارہا ہے، چلتے چلتے اس کا پیر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ منہ کے بل گرا تھا اس نے غور کیا تو وہ کوئی قبر تھی اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

وہ جلدی سے گھبرا کر کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا وہ اس وقت کسی قبرستان میں کھڑا تھا وہ گھبرا کر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا چاند کی ہلکی روشنی میں اب وہ بہت غور سے دیکھ بھال کر چل رہا تھا وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا تا کہ وہ قبرستان کی حدود سے باہر نکل آئے۔

بات سنو بیٹا اپنی پشت پر کسی مردانہ آواز پر وہ خوفزدہ سا ہوگیا اور پلٹے بغیر تیز تیز دوڑنے لگا بھاگتے بھاگتے وہ قبرستان کی حدود سے باہر نکل آیا۔

ارے بیٹا سنو تو وہ آدمی اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا ڈرو نہیں میں ادھر کا رہنے والا ہوں وہ عمر رسیدہ آدمی تھا اور حارث کی آنکھوں میں چھائے ڈر کو دیکھ کر اسے تسلی دینے لگا میں یہاں سے گزر رہا تھا کے میری نظر تم پر پڑی اس شہر میں نئے معلوم ہورہے ہو

جی میں گاؤں سے آیا ہوں نوکری کی تلاش میں حارث ذرا مطمئن ہوتے ہوئے بولا اچھا اس کی بات پر وہ بوڑھا اثبات میں سر ہلانے لگا میں یہاں کسی کو نہیں جانتا اور مجھے رہائش کا بھی نہیں پتا حارث کچھ جھجکتے ہوئے بولا رہائش کی تم فکر نہ کرو یہاں قریب ہی پاس

میرا گھر ہے وہاں تم رہ سکتے ہو بوڑھے کی پیشکش پر حارث کی خوشی دیدنی تھی۔

کرایہ کیا ہوگا حارث ہچکچاتے ہوئے بولا کرائے کی فکر نہیں کرو جب تک دل چاہے رہنا میں اور میری بیوی ہی ہوتے ہیں گھر میں ہمارا اکیلا پن بھی دور ہوجائیگا اور تمہارا رہائش کا مسلہ بھی حل ہوجائے گا بوڑھے کی بات پر وہ ممنونیت سے ان کی جانب دیکھنے لگا اسے یقین نہیں آرہا تھا اتنی جلدی اس کے لیئے اتنی آسانی ہوجائے گی

باتیں کرتے کرتے وہ ایک گھر کی جانب آکر رک گئے گھر کافی پرانی خستہ حالت کا لگ رہا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اسے اندر لے آئے، گھر میں داخل ہوتے ہی عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہورہا تھا اتنی گرمی میں بھی گھر کا ماحول عجیب سی ٹھنڈک لیئے ہوئے تھا، بڑا سا صحن تھا جہاں پر ایک تخت بچھا ہوا تھا صحن کے ایک جانب چھوٹا سا باورچی خانہ تھا اور دوسری جانب چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جہاں پلنگ پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آرہی تھی۔

صحن میں لگے نیم کے درخت پر بیٹھی کالی سیاہ بلی بری طرح سے حارث کو گھور رہی تھی اس کی گھورتی نظروں سے حارث کو وحشت کا احساس ہورہا تھا۔

صحن میں بنی سیڑھیوں کی جانب وہ بوڑھا حارث کو لے کر بڑھا جو اوپر کی جانب جارہی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ ان کے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا سیڑھی کے اختتام پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا کمرے کے بالکل برابر چھوٹا سا باورچی خانہ بنایا ہوا تھا یہ ہے تمہارا کمرہ وہ بوڑھا اسے کمرے میں لے جاتے ہوئے بولا

اب تم آرام کرو میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔

نہیں نہیں میں بس سونا چاہونگا بہت تھکن ہے حارث بولا چلو جیسے تمہاری مرضی صبح ملاقات ہوگی وہ شب بخیر کہتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا

حارث کمرے کا نئے سرے سے جائزہ لینے لگا کمرے میں قالین بچھا تھا کونے میں سنگل بیڈ رکھا ہوا تھا اور بیڈ کے بالکل سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھی۔

حارث ایک طرف بیگ رکھ کر کپڑے نکال کر نہانے چلا گیا نہا کر آیا تو خود کو کافی فریش محسوس کررہا تھا وہ سونے کے لیئے لیٹنے سے پہلے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد وہ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کرنے لگا وہ کھڑکی سیڑھی کی جانب کھلتی تھی۔

اس کمرے میں دوسری کھڑکی بھی تھی جو روڈ کی

جانب کھلتی تھی حارث اس کھڑکی میں سے دیکھنے لگا تو وہاں سے نظر آتے قبرستان میں اس کی نظر پڑی تو اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کردی اور بیڈ پر آ کر لیٹ گیا تھکاوٹ تھی اس لیئے لیٹتے ہی سوگیا۔

صبح آنکھ اس کی دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی وہ جلدی سے بیڈ سے اترا تو وہ بوڑھا اسے کھڑکی سے کمرے میں جھانکتا نظر آیا بیٹے کھولو اس نے دروازہ کھولا تو وہ ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے لیئے کھڑا تھا وہ جھینپ سا گیا ناشتہ کر کے نیچے آجانا بیٹا۔ بوڑھے کی بات پر وہ سر اثبات میں ہلانے لگا اور ناشتہ کرنے کے بعد وہ نیچے چلا آیا۔

جہاں صحن میں وہ کل والی عورت تخت پر براجمان تھی اور پاس ہی اس کے وہ بوڑھا بیٹھا تھا۔

آجا بیٹا تخت پر بیٹھی بوڑھی عورت اس کی جگہ اپنے پاس بناتے ہوئے بولی۔ میرا نام سعیدہ ہے اور میرا نام شعیب ہے وہ بوڑھا بولا اپنے بارے میں بتاو بوڑھی عورت بولی۔

میرا نام حارث ہے میں گاؤں سے شہر نوکری کے سلسلے میں آیا ہوں۔

اچھی بات ہے تم یہاں آرام سے رہنا کھانے پینے کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت شکریہ آنٹی اس اجنبی شہر میں آپ لوگوں کی مدد کا میں بہت مشکور ہوں وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ اچھا میں چلتا ہوں نوکری کی تلاش میں دعا کریئے گا کوئی معقول نوکری مل جائے اور پھر تھوڑے دن کی تگ ودود کے بعد اسے ایک آفس میں کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔

میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں نہ ایسا سوچنا بھی مت کہ تم مجھے تنگ کرتی ہو تمہارا میرا ساتھ تو زندگی بھر کا ہی نہیں مرنے کے بعد بھی جڑا رہے گا۔ شعیب محبت سے بیوی کا ہاتھ پکڑ کے بولے۔ رات کے وقت وہ کسی کام سے باہر جانے کے لیئے سیڑھیاں اتر کر صحن میں آیا تو شعیب صاحب کا جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا جو وہ اپنی بیوی سے بول رہے تھے وہ خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھ گیا

کہاں جارہے ہو بیٹا شعیب صاحب بولے۔

جی بازار جارہا ہوں کچھ کام ہے۔ وقت دیکھو بیٹا اتنی رات کو جاگے حالات بھی شہر کے ٹھیک نہیں ایسا کرنا کل چلے جانا ابھی تو میں دروازہ کھولنے کی بھی اجازت نہیں دونگا ان کے قطعیت سے بولنے پر وہ چپ چاپ اوپر کی جانب واپس بڑھ گیا۔

اچھی مصیبت ہے رات کے نو بج رہے ہیں کونسی آدھی رات ہوگئی جو میں جا بھی نہیں سکتا مغرب کے بعد کہیں جانہیں ڈاکو نہ آجائے ایسا لگ رہا ہے ڈاکو تو تاک میں بیٹھے ہیں ان کے گھر کی وہ جلتا بھنتا بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

اسے یہاں ویسے تو کوئی پریشانی نہیں تھی مگر ان دونوں میاں بیوی کی آنے جانے کی روک ٹوک سے وہ اکثر گھبرا جاتا تھا بستر پر پڑے پڑے وہ بیزار ہوگیا تو اٹھ کر روڈ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر کھڑا ہوگیا کافی سنسان علاقہ تھا آبادی بھی زیادہ نہیں تھی بیچارے میاں بیوی بھی غلط نہیں اکیلے ہوتے ہیں ان کا ڈرنا کچھ غلط بھی نہیں وہ سوچنے لگا۔

قبرستان کے باہر سے گزرتی دو لڑکیاں جو کھڑکی میں کھڑے حارث کو ہی دیکھ رہی تھیں ہاتھ ہلانے لگیں ان کی اس حرکت پر وہ گھبرا گیا اتنی رات کو یہ دونوں یہاں کیا کررہی ہیں اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کردی کمرے کا دروازہ کھول کر وہ نیچے جھانکنے لگا صحن میں اب کوئی بھی نہیں تھا وہ دبے قدموں سیڑھی اتر کر نیچے آگیا اور آہستگی سے دروازے کی جانب بڑھنے لگا پلٹ کر یقین دہانی کے لیئے دیکھنے لگا دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں سوگئے تھے ابھی وہ دروازہ کھولنے ہی والا تھا کے اچانک سے صحن میں لگے نیم کے درخت پر بیٹھی بلی غراتی ہوئی حارث پر حملہ کرگئی، حارث اس اچانک حملے کے لیئے تیار نہ تھا وہ ایک دم سٹپٹا سا گیا وہ کالی سیاہ بلی حارث کو بری طرح سے گھور کر دیکھ رہی تھی حارث گھبرا کر اوپر کی جانب بھاگا تو پیچھے سے

نسوانی قہقہے کی آواز پر وہ بدحواس ہوگیا جیسے اس کے ارادے کو ناکام بنانے پر کوئی ہنس رہا ہو

وہ دروازہ بند کر کے بری طرح ہانپنے لگا اسے خوف محسوس ہورہا تھا رات بھر جاگتے گزری فجر کے وقت جا کر اس کی آنکھ لگی۔

دوسرے دن آفس سے واپسی پر گھر آتے ہوئے اپنے پیچھے آتی نسوانی آواز پر وہ پلٹ کر دیکھنے لگا کیسے ہیں آپ وہی دو لڑکیاں تھیں رات حارث نے جن کو کھڑکی سے دیکھا تھا ہم نے آپ کو ہاتھ ہلایا تھا مگر آپ نے تو ایسے ڈر کے کھڑکی بند کی جیسے ہاتھ نہ ہلایا ہو گولی ماری ہو دوسری والی شرارت سے بولی انکی بات پر وہ جھینپ گیا میرا نام آئمہ ہے اور یہ میری دوست سحرش ہے ہم یہیں آگے رہتے ہیں۔ وہ شوخ سی لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔

اب اکثر آفس سے آتے جاتے اس کی ان دونوں سے ملاقات ہوجاتی تھی جس وقت حارث آفس سے آتا تھا وہ کوچنگ سے پڑھ کے آرہی ہوتی تھیں بقول ان دونوں کے۔

حارث کو شوخ وچنچل سی آئمہ اچھی لگنے لگی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے قریب بھی آگئے تھے وہ اب گھر کی طرف سے بھی مطمئن تھا پابندی سے وہ منی آرڈر بھیجتا تھا گھر میں سب ہی اس کی نوکری سے خوش تھے کیونکہ گھر کے حالات اب بہتر ہونے لگے تھے۔

ایک شام آئمہ نے اس سے رات ملنے کی فرمائش کی تم میرے مالک مکان کو نہیں جانتی شام کے بعد وہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیتے اور میری چوکیداری کے لیئے بلی بھی وہاں موجود ہے وہ بلی والا واقعہ سنانے لگا جس کو سن کر ساتھ کھڑی سحرش زور سے ہنس دی اس کے ہنسنے پر وہ منہ بنانے لگا اچھا میں کوشش کرونگا وہ ملنے کی حامی بھرتے ہوئے گھر چلا آیا اور رات جب شعیب انکل کھانا لیکر اوپر آئے تو وہ سوتا بن گیا کچھ دیر بعد وہ نیچے جھانک کر صحن میں دیکھنے لگا کے کوئی ہے تو نہیں اور اطمینان کرتا ہوا وہ نیچے چلا آیا وہ دونوں میاں بیوی

سکھی فارمولہ

بیوی: دیکھو نا ہمارے پڑوسی نے 50 انچ کا LED خریدا ہے۔ آپ بھی خرید لائیں نا؟؟

شوہر: ارے ڈارلنگ جس کے پاس تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو وہ کیوں کر فالتو کا وقت TV دیکھنے میں برباد کرے گا؟؟

بیوی: اوہ..... آپ بھی نہ۔ ابھی آپ کے لئے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔

(طارق عمر دراز۔ نواب شاہ)

سونے اپنے کمرے میں جا چکے تھے اس نے صحن میں لگے درخت کی جانب پلٹ کر دیکھا تو وہاں بلی بھی موجود نہیں تھی سکھ کا سانس لیتے ہوئے وہ دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر چلا آیا

جہاں آئمہ اس کا انتظار کررہی تھی سحرش نہیں آئی سحرش کو اس کے ساتھ نہ پا کر وہ بولا۔ نہیں وہ بول رہی تھی میں کباب میں ہڈی بن کر کیا کرونگی تم جاؤ وہ شرارت سے آنکھ مار کر بولی اس کی بات پر وہ ہنس کر غور سے اسے دیکھنے لگا جو واقعی میں بہت حسین تھی۔

آؤ پارک میں چلتے ہیں آئمہ اس کو سامنے بنے قبرستان کی طرف لے آئی اتنی رات میں قبرستان جاتے ہوئے وہ ڈر رہا تھا۔ ڈرو نہیں اس قبرستان کے بعد ہے پارک وہ اس کے ساتھ پارک چلا آیا

وہ پہلی بار اس پارک میں آیا تھا آئمہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگی کے وہ اور سحرش دونوں سہیلیاں ہیں اور دوسرے شہر سے پڑھائی کی غرض سے یہاں آئی ہیں باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا حارث کی نگاہ اپنی رسٹ واچ پر پڑی جو دو بجا رہی تھی اف اتنی دیر ہوگئی وہ گھبرا کے کھڑا ہوگیا ہاں چلو سحرش بھی پریشان ہورہی ہوگی آئمہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی

دونوں باتیں کرتے پارک سے باہر نکل آئے قبرستان میں کھڑا گورکن گھورتی نظروں سے حارث کو

دیکھنے لگا اس کی نظروں سے خائف ہوتا حارث آئمہ کو خدا حافظ کہتا گھر آ گیا

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ درخت پر بیٹھی بلی پر پڑی جو اس کو ہی گھور رہی تھی۔

آ گئے تم منع بھی کیا ہے اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا ٹھیک نہیں پر تم سنتے نہیں ہو

اف آنٹی جاگ رہی ہیں وہ سر پکڑ کے رہ گیا چلو اب آ گئے ہو تو کھانا کھالو تم نے رات کھایا بھی نہیں تھا تخت پر رکھا ہوا ہے میں نے کھانا باورچی خانے سے سعیدہ آنٹی کی آواز پر حارث جی بھر کر شرمندہ ہوتے ہوئے تخت پر رکھی کھانے کی ٹرے کی جانب بڑھ گیا اور وہیں بیٹھ کے کھانے لگا اسے بھوک بھی بہت زیادہ لگ رہی تھی کھانے کے بعد وہ باورچی خانے کی جانب بڑھ گیا سوری آنٹی اب آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا اور کھانا بہت ہی مزے کا تھا، الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا وہ خوفزدہ نظروں سے آنٹی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بیڈ پر سو رہی تھیں یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ وہ گھبرا کر اوپر چلا آیا۔

دوسرے دن چھٹی تھی وہ بھی نیچے چلا آیا انکل آنٹی صحن میں تخت پر بیٹھے تھے وہ ان کے پاس چلا آیا۔

آپ دونوں کی شادی کو کتنے سال ہو گئے وہ ان سے پوچھنے لگا۔ پچاس سال ہو گئے میں بیاہ کر اس ہی گھر میں آئی تھی اولاد کے لیئے بڑی دعائیں کیا کرتی تھی میں پر ہوئی نہیں وہ ماضی کو سوچتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں

میرے تو یہیں بچے ہیں وہ درخت کے پاس بیٹھیں بلیوں کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ آپ کو بلیاں بہت پسند ہیں کیا وہ سوال کرنے لگا ہاں وہ مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئیں تو وہ درخت کے پاس بیٹھیں آرام کرتی بلیوں کی جانب دیکھنے لگا ان میں سے ایک بلی کی آنکھوں میں حارث کو دیکھتے ہوئے عجیب سی چمک تھی کے وہ جھرجھری لے کر رہ گیا

تمہارے انکل کو بہت بولا تھا میں نے دوسری شادی کر لو اولاد کے لیئے پر نہیں مانے سعیدہ آنٹی بولی۔

آپ سے محبت کرتے ہونگے ناں۔ ایسی ویسی سعیدہ آنٹی پوپلے منہ سے دوپٹہ منہ پر رکھ کے ہنسنے لگیں لیلی مجنوں کی محبت مشہور تھی ہماری وہ بتانے لگیں۔ آنٹی یہ علاقہ اتنا سنسان کیوں ہے۔

یہ علاقہ شروع سے ہی سنسان ہے یہاں آبادی زیادہ ہے ہی نہیں اس کی بات کے جواب میں وہ بولیں وہ چپ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی تو نیچے سے آتی باتوں کی آواز پر وہ حیران ہوا کے نیچے کون ہے وہ آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر نیچے جھانکنے لگا تو صحن میں شادی کا سماں تھا پورا صحن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا عورتیں زرق برق لباس پہنیں نظر آ رہی تھیں مرد بھی نئے لباس زیب تن کیئے ہوئے تھے۔ حارث نے غور کیا تو تخت پر ایک لڑکی دلہن بنی بیٹھی نظر آئی اور اس کے گرد لڑکیاں تیار ہوئی بیٹھی تھیں۔

کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوں پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی ایک طرف کھانے کی دیگیں رکھی ہوئی تھی ۔وہ پریشانی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

حارث بیٹا آجا

نیچے کھڑے شعیب انکل کی اس پر نظر پڑی تو آواز دے کر اسے بلانے لگے وہ نیچے آ گیا۔ بیٹا یہ ہماری پڑوس کی بچی ہے اس کی شادی ہے تمہاری آنٹی نے بولا تھا رخصتی ہمارے گھر سے ہوگی بچپن سے یہ بچی ہمارے گھر آتی جاتی ہے تو محبت ہو گئی انکل کی بات پر وہ آنٹی کی طرف دیکھنے لگا جو ہر کام میں آگے آگے تھی کھانا بچھا تو وہ بھی بیٹھ گیا اتنا لذیذ کھانا تھا کے وہ کھائے چلے جا رہا تھا کھانے کے بعد بھی محفل جمی ہوئی تھی اسے اب نیند آنے لگی تھی دوسرے دن آفس بھی تھا وہ سونے کے لیئے اوپر آ گیا۔

اسے لگا اس کے پیچھے پیچھے کوئی آیا ہے اس نے دو تین بار چونک کر اپنے اردگرد بھی دیکھا مگر کوئی نہ تھا

گلاب کی تیز خوشبوں اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ جو بستر پر دراز تھا گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا نقرئی قہقہے اسکی سماعتوں سے ٹکرائے کون ہے اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا وہ خوفزدہ سا اپنے اطراف میں دیکھنے لگا مگر کوئی نہ تھا پوری رات اسے لگا کوئی نسوانی ہاتھ اس کا سر سہلاتا رہا فجر کے وقت تک یہیں سب ہوتا رہا۔

آفس میں بھی سارا دن وہ کسلمندی سے کام کرتا رہا نیند نہ بھرنے کی وجہ سے اس سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ شام واپسی میں گھر کی طرف آتے ہوئے آئمہ نظر آ گئی اس کو دیکھتے ہی اس کی دن بھر کی تھکن دور ہو گئی تھی وہ تھوڑی دیر پارک میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا پتا ہے کل میرے مالک مکان کے گھر میں پڑوس کی لڑکی کی شادی تھی دلہن بنی لڑکی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کے ایک دن تم بھی ایسے ہی دلہن بنی بیٹھی ہو گی حارث بولا۔

کاش آئمہ دھیرے سے بولی

کیا مطلب وہ ناسمجھی سے بولا۔ کاش ایسا ہو میں تمہاری دلہن بنی ایسے بیٹھی رہوں آئمہ بولی ایسا ضرور ہو گا آئمہ۔ حارث بولا میں پرسوں گاؤں جا رہا ہوں اور جاتے ہی ماں سے تمہاری بارے میں بات کرونگا۔

کیا سچ میں تم مجھ سے شادی کرو گے آئمہ خوش ہوتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

ہاں میں وعدہ کرتا ہوں میں تم سے شادی کرونگا وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔

گھر آ کر وہ تیاری میں لگ گیا بیگ وغیرہ پیک کرنے لگا کیونکہ پرسوں وہ گاؤں جا رہا تھا وہ مستقبل مستقبل کے سنہرے سپنے بن رہا تھا۔ کیسا لگے گا آئمہ میرے ساتھ گاؤں جائے گی، پورے گاؤں میں آئمہ جیسا حسین کوئی نہیں ہو گا اور واقعی میں آئمہ بیحد حسین تھی ایسا حسن حارث نے نہیں دیکھا تھا۔

آج رات بھی آئمہ نے اسے پارک ملاقات کے لیئے بلایا تھا پارک سے واپسی میں قبرستان والے راستے سے آتے ہوئے اس کا پیر کسی پتھر سے اٹکا تھا اور وہ دھڑام سے کسی قبر پر جا کر گرا تھا اس نے جلدی سے

سالگرہ

بیوی: آپ میری سالگرہ کا دن کیسے بھول گئے؟

شوہر: بھلا تمہاری سالگرہ کا دن کوئی کیسے یاد رکھے۔ تمہیں دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ تمہاری عمر بڑھ رہی ہے!!!

بیوی: (آنسو پونچھتی ہوئی) بچی۔ آپ کے لئے کھیر لے کر آتی ہوں۔

(عامر.....ٹنڈو آدم)

موبائل کی ٹارچ جلائی تھی۔ موبائل کی روشنی سیدھی قبر کی تختی پر پڑی تھی حارث کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا قبر کی تختی پر لکھا نام شعیب خان وہ بمشکل کھڑا ہوا اس ہی قبر کے برابر والی قبر کی تختی پر سعیدہ شعیب لکھا تھا حارث کو لگ رہا تھا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔

کیا ہو گیا۔ گورگن کی آواز پر وہ اچھل گیا وہ یہ وہ قبر کو دیکھتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ ہاں یہ دونوں میاں بیوی تھے وہ سامنے والے گھر میں رہتے تھے وہ، گورگن اس گھر کی جانب اشارہ کرنے لگا جہاں حارث رہ رہا تھا۔

آج سے پانچ سال پہلے آدھی رات میں ان کے گھر ڈاکوں گھس آئے تھے ڈاکوں نے دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا تھا۔

بیٹا دھیان رکھو حالات ٹھیک نہیں حارث کو بے ساختہ ان کے جملے یاد آ گئے۔ اتنا ڈرے ہوئے کیوں ہو گورگن اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کے بولا۔ نہیں کچھ نہیں وہ تھوک نگلتا ہوا بولا اور تیزی سے گھر کی جانب دوڑا مجھے ابھی یہاں سے نکلنا ہو گا وہ خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں داخل ہوا وہ تیزی سے اوپر چلا آیا اور سامان سمیٹنے لگا کے کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک پر وہ اچھل سا گیا

کھڑکی سے دیکھا تو سیڑھی پر آئمہ کھڑی ہوئی

تھی تم یہاں کیسے وہ اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے بولا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اس کی بات پر وہ سر ہلاتا جلدی جلدی چیزیں اٹھانے لگا کہ اس کے دماغ میں جھماکہ ہوا تم کو کیسے پتا میں جارہا ہوں وہ پاس کھڑی آئمہ سے پوچھنے لگا۔

آئمہ تم کہیں نہیں جاؤ گی تم اس طرح اپنے قبیلے کی نافرمانی نہیں کرسکتی پیچھے سے سحرش بولی وہ حیران پریشان سا سب دیکھ رہا تھا۔

حارث صاحب آئمہ نے آپ کو حقیقت بتانے سے منع کیا تھا مگر میرے خیال سے آپ کو حقیقت سے واقف کردینا چاہیئے آئمہ کے لاکھ روکنے کے باوجود سحرش بتانے لگی کے ان کا تعلق جنوں کے قبیلے سے ہیں۔

اور صحن میں لگے نیم کے درخت پر وہ عرصہ دراز سے اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ رہتی چلی آرہی ہیں وہ جو بلیوں کے روپ میں آپ نے دیکھا تھا وہ ہم ہی تھے پہلے ہی دن جب آپ نے اس گھر میں قدم رکھا تھا تب ہی آپ آئمہ کو اچھے لگنے لگے تھے۔

میں نے اسے بہت روکا اگر یہ آپ کے ساتھ جائے گی تو ہمارے قبیلے کے بڑے اس کو تو مار ہی دینگے ساتھ آپکی جان کو بھی خطرہ ہے۔

سعیدہ آنٹی جب بیاہ کر آئی تھیں یہاں ان کو تب ہی ہماری موجودگی کا پتا چل گیا تھا ان کی کوئی اولاد نہیں تھی ہم ہی ان کی بیٹیوں کی طرح ہیں پر وہ دونوں بھی کب کے مرچکے ہیں یہ گھر خالی ویران کھنڈر ہے ادھر کوئی زندہ انسان نہیں۔

اس رات جو آپ نے شادی دیکھی تھی وہ ہمارے قبیلے کی لڑکی کی تھی۔

حارث کو لگ رہا تھا کسی بھی وقت اس کا دل بند ہوجائے گا اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

حارث تم کہیں نہیں جاؤ گے بیٹا تم تو ہمارے بیٹے کی طرح ہو شعیب انکل سیڑھی چڑھ کر اس کی طرف آنے لگے خوفزدہ ہوکر اس نے دروازہ بند کردیا۔

اللہ میری مدد کریں میں کہاں جنوں اور روحوں میں پھنس گیا ہوں وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اپنے لئے مدد مانگنے لگا۔ پوری رات وقفے وقفے سے دروازے پر ہونے والی دستک اور سعیدہ آنٹی کی سسکتی ہوئی آواز اس کو جانے نہ دینا، میں نہیں جانے دونگی میرا کوئی بچہ نہیں یہ میرا بچہ ہے کی آواز اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی اور ساتھ میں نسوانی بین کرتی ہوئی آواز جو آئمہ کی تھی حارث تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا تم ایسے کیسے جاسکتے ہو

وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے دروازے سے پشت لگائے بیٹھا رہا فجر کے وقت آوازوں کا سلسلہ رکا اس نے دروازہ کھول کر نیچے جھانکا جہاں اب خاموشی تھی۔

وہ بیگ اٹھائے اندھا دھند سیڑھیاں اترتا ہوا دروازہ کھول کر باہر کی جانب بھاگا۔ وہ بری طرح سے بس بھاگ رہا تھا اور باہر روڈ کی جانب آکر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے تشکر کے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کے وہ بچ کر آگیا، سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہورہے تھے کہ وہ چھ ماہ تک روحوں اور جنوں کے درمیان رہا تھا۔

آج اس بات کو دس سال بیت گئے اور پچھلے آٹھ سال سے وہ یہاں شہر میں اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہے۔

آج کسی کام سے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس علاقے سے گزرا تو اتفاق سے اس گھر کے پاس سے اس کا گزر ہوا، گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی آج بھی وہ گھر ایسا ہی ویران پڑا تھا۔

حارث کی نگاہ بے اختیار اس کمرے کی کھڑکی کی جانب اٹھی جہاں اس نے چھ ماہ قیام کیا تھا مگر وہاں کے منظر نے اسے دہشت میں مبتلا کردیا تھا۔ آئمہ کھڑکی میں کھڑی مسکراتے ہوئے اس کو ہاتھ ہلا رہی تھی۔

خوفناک منظر

فیصل مشتاق-عارف والا

عامل کے عمل پڑھتے ہی سامنے دھواں اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں نے شعلے کی شکل اختیار کرلی، شعلوں کے درمیان چڑیل کی فلک شگاف چیخیں قرب و جوار کو لرزانے لگیں اور پھر.....

دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین دہشت ناک کہانی

یہ کہانی میرے دوست کی حقیقی زندگی کی کہانی ہے جسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ کیسے اس کی زندگی عذاب بنی اور پھر میں نے کیسے اس کی مدد کی۔ یہ کہانی میں اس کی زبانی لکھ رہا ہوں۔

ہماری چھوٹی سی فیملی میں ابو، امی اور ہم دو بھائی شامل ہیں چونکہ ابو سرکاری ملازم تھے۔ اس لئے ابو کا تبادلہ قریب کے ہی ایک شہر میں ہوگیا۔ ہم سب پہلے دادی کے گھر رہتے تھے۔ ابو کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تو ہم سب نے ابو کے ساتھ جاکر دوسرے شہر میں الگ گھر میں رہنے پر اصرار کیا۔ میں اس وقت بارہویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرا بھائی آٹھویں میں زیر تعلیم تھا۔

ہم نے نئے شہر آکر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ نئے اسکول میں پہلے پہل ہمیں مشکلات ہوئی،

کچھ خاص دوست نہیں بنے، نئے نئے ماحول سے ہم مانوس نہ ہو پائے مگر پھر بھی مجبوری میں اسی اسکول میں ہی پڑھنا پڑا۔ جیسے ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ ضرب المثل ہم پر بالکل درست آئی۔ ابو کے ایک قریبی دوست نے انہیں شہر کے مکان کے بارے میں رائے دی ہمیں بھی جلد ہی مکان چاہئے تھا تو ابو نے دوست کے مشورے پر عمل کر کے مکان لینے کی حامی بھر لی۔ مگر وہ مکان خاصا بوسیدہ اور پرانے وقتوں کا بنا تھا۔ مجبوری میں ہمیں اسی مکان میں رہنا پڑا۔ تو ابو نے فوراً مکان لینے کی حامی بھر لی، کرایہ بھی معقول تھا اور پھر جلدی میں کوئی بھی دوسرا مکان ہاتھ نہ آ رہا تھا۔

چناں چہ ہم سب مکان میں شفٹ ہو گئے۔ مکان کے دروازے خالص موٹی لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ لکڑی کے دروازے پر باہر کی طرف بہت عجیب قسم کی انگور کی بیل جو اوپر تلے پورے دروازے کو گھیرے ہوئے تھی۔

مکان پرانا مگر مضبوط ضرور تھا۔ مکان پرانی سی گلی کے آخری کونے میں تھا۔ بازار کافی دور تھا، ہمارے اوس پڑوس بھی کوئی مکان نہ تھا۔ گلی تنگ اور خوفزدہ تھی۔ دھوپ کا تو جیسے گلی سے کوئی ناطہ ہی نہ تھا۔ ہمیں سامان لینے دور بازار بھی بائیک پر جانا پڑتا۔

آہستہ آہستہ ہمارا دل لگنے لگا۔ امی سارا دن گھر کا کام کرتی۔ ابا بھی ڈیوٹی کر کے شام کو گھر لوٹتے۔

ہمیں یہاں آئے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ مگر اس ہفتے میں کئی ناقابل یقین تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جسے ہم نظر انداز کر دیتے، کبھی کچن سے برتن خود بخود گر جاتے، کبھی اسٹیل کے گلاس آپس میں یوں بجتے کہ ان کی آواز کانوں کو چیر دینے والی ہوتی۔ کبھی کبھار تھالی میں چمچ کودنے کی آواز آتی، جیسے کوئی بچہ کئی دنوں سے بھوکا تھالی میں پڑنے والے کھانے کا منتظر ہو۔ دروازہ بھی زور زور سے بجتا۔ ہمیں لگتا کوئی فقیر ہے مگر جب دروازہ کھولتے تو ماسوائے گلی کے کالے گھپ اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا۔

یہ کوئی غیر معمولی تبدیلیاں نہیں تھیں۔ اکثر میرا چھوٹا بھائی ڈر سا جاتا اور رونے لگتا پھر میں اسے بمشکل چپ کرواتا۔

پورے گھر میں ایک جگہ ایسی تھی جو مجھے سب سے عجیب لگی تھی۔ ''گھر کی سیڑھیاں۔'' گھر کی سیڑھیاں بھی بہت پرانی بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی اینٹیں بہت سخت اور مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی کے درمیان بہت فاصلہ تھا کہ اگر کوئی سیڑھی اترے تو پھلانگنا پڑے ان سیڑھیوں میں ایک انجانا خوف اور وحشت تھی۔

ان سیڑھیوں کے عکس میں بالکل نیچے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ جس پر جالوں سے بھرا ہوا پتھر کا مضبوط تالا لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت نایاب قسم کا تالا ہو۔ چونکہ سیڑھیاں زیادہ تھیں اور ان کے نیچے دروازہ تھا تو ہمیں کبھی محسوس نہ ہوا کہ نیچے کوئی دروازہ بھی ہے۔ مگر امی کو جب معلوم ہوا تو وہ خوفزدہ ہو گئیں۔ چونکہ اس چھوٹے کمرے کا دروازہ بہت بوسیدہ تھا۔ دروازے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے اندر بہت اندھیرا ہوگا۔ پورا دروازہ مکڑی کے جالوں سے بھرا ہوا تھا۔ امی نے تالا دیکھا تو تجسس ہوا۔ مجھ سے تو تالا نہ ٹوٹا میں قریبی دکان سے ایک مکینک کو لے آیا اس نے اپنے قیمتی اوزاروں سے تالا توڑا۔ دروازہ یکدم نہیں کھلا بلکہ دھیرے دھیرے کھلنے کی آواز آئی جیسے دروازہ اپنی برسوں کی تھکان نکال رہا ہو۔ جوں ہی دروازہ کھلا ایک خوفناک چیختی ہوئی آواز باہر کو آئی۔ آواز اس قدر خوفناک تھی۔ امی کو لگا جیسے ان کا دل باہر آ جائے۔ سانسوں کی رفتار تیز ہونے لگی۔ مکینک خوف کی زد میں آ کر بنا معاوضہ لئے دم دبا کر فو چکر ہو گیا۔ امی نے اندر جھانکا تو اچانک ان کے پیروں کے درمیان سے ایک بہت بڑی بلی نکل کر گیٹ کی جانب بھاگی۔ کالے رنگ کی وہ بلی جس کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی مانند دہک رہی تھیں۔ امی کو ایسے دیکھتی رہی جیسے ابھی ان کو جھپٹ کر ان کی بوٹی بوٹی کر دے گی، پھر وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔ امی پوری

طرح خوف کی زد میں آ چکی تھی۔ فوراً آیت الکرسی پڑھی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے کے اندر گھس گئی۔ آگے بڑھی تو دیکھا ہر طرف کالا گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ کمرے میں رہن سہن کا کچھ پرانا سامان موجود تھا۔ جس پر مٹی کی تہیں براجمان تھیں۔ جگہ جگہ پر جالے اپنا منہ دکھا رہے تھے۔ کمرے میں گرمی کی شدت اتنی تھی کہ وہاں سے باہر نکلنا ہی نجات تھا۔ شام کو ابو آئے تو امی نے سارا قصہ سنایا۔ ابو نے غور کیا اور بالآخر دوبارہ اس کمرے کو تالا لگانے کا حکم میرے ذمے لگا دیا۔ امی بہت خوفزدہ ہو چکی تھی۔ وہ دوبارہ اس کمرے میں جانے کی ہمت نہ کر پائی۔ میں دن بھر کام میں مگن رہا۔ ابو شام کو آئے تو مجھ سے پوچھا میں نے ابو کی ڈانٹ سے بچنے کے لئے کہہ دیا میں نے تالا لگا دیا ہے رات کو اچانک ذہن میں آیا کہ ابو نے صبح جاتے ہوئے دیکھ لیا کہ تالا نہیں ہے تو میری اچھی خاصی عزت افزائی ہوگی۔ رات بھی کافی ہو چکی تھی۔ تقریباً 12 بجے کا وقت تھا۔ مگر مجھے ابو کی ڈانٹ قطعی نہیں سننی تھی۔ چنانچہ میں چارپائی سے اترا اور جوتا پہن کر تیز تیز قدموں سے تالا اٹھائے اس بوسیدہ کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں نے تالا لگانے کے لئے دونوں دروازوں کو پکڑا اچانک ذہن میں خیال آیا کیوں نہ ایک بار کمرے میں تھوڑا سا جھانک لوں۔ میں نے تھوڑی سی گہری نظر ماری مگر کچھ نظر نہ آیا۔ بالآخر میں نے بجائے دروازے کو بند کر کے پورے وثوق سے دونوں دروازوں کو پوری طرح کھول دیا۔ دروازہ چھوٹا تھا۔ مجھے جھک کر اندر جانا پڑا۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے بہت سکون محسوس ہوا۔ سامنے ایک خوبصورت بیڈ تھا۔ بیڈ کے کنارے قیمتی فانوس اور ارد گرد رنگ برنگے پھول اپنی خوب صورتی اور مہک کا ثبوت دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پہلی رات کی دلہن کے لئے کمرہ سجایا گیا ہو۔

پورے کمرے سے بہت مسحور کن سانسوں کو مہکا دینے والی خوشبو آ رہی تھی۔ پورا کمرہ روشنیوں سے جگمگ کر رہا تھا۔ حالانکہ وہاں کوئی لائٹ موجود نہیں تھی۔ مجھے حیرانی سے زیادہ خوشی ہو رہی تھی۔ ایسا خوب صورت کمرہ تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھولوں سے سجے بیڈ کے عین اوپر کی دیوار پر ایک حسین دلہن کی بہت بڑی تصویر لگی تھی۔ دلہن بہت خوب صورت اور پرکشش تھی۔ ایسے دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ اس کے علاوہ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے چند سیکنڈ کے لئے احساس ہوا جیسے اس لڑکی کی پلکیں جھپک رہی ہوں۔ دلکش مسکراہٹ اور من موہنے مکھڑے والی دلہن کو دیکھ کر میں تو مجنوں بن چکا تھا۔ مجھے بہت اچھا محسوس ہوا۔ میری حیرانگی خوشی نے چھپا دی۔ کمرے کی دلکش سجاوٹ اور خوشبو نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ میں وہاں کتنی دیر رہا۔ مجھے اندازہ تب ہوا جب صبح فجر کی اذان میرے کانوں میں پڑی۔ نیند سے بوجھل ہو رہا تھا تو فوراً سو گیا۔

کالج سے واپس آیا تو امی سے کہا کہ میرے امتحان نزدیک ہیں۔ مجھے الگ کمرہ چاہئے جہاں میں باآسانی پڑھ سکوں کیونکہ میں رات گئے تک پڑھوں گا آپ لوگ مجھے فضول میں پریشان مت کیجئے گا۔

امتحان تو واقعی سر پر تھے۔ میں ساتھ والے کمرے میں پڑھنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پڑھتا رہا، تھکا تو ستانے لیٹ گیا جوں ہی آنکھیں بند ہوئیں وہی کمرا میری آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگا۔ اچانک آنکھیں کھولیں تو دوبارہ اسی کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا۔

یہ بھی رات 12 بجے کا وقت تھا جب میں دوبارہ اس کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں وہی دلکش خوشبو آ رہی تھی۔ کمرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دلہن کی پینٹنگ بھی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ تاروں کی مانند چمک رہی تھی۔ یکدم کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ کچھ سیکنڈ میں بے ساختہ کھڑا رہا۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ میں نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر زبان حلق میں ہی قید ہو گئی۔ میں

خاموشی سے ساکت کھڑا رہا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ یہ میرے لئے شدید خوف کا لمحہ تھا۔ یکدم آنکھوں میں پڑنے والی تیز روشنی نے آنکھوں سے پانی نکال دیا۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوبرو حسینہ جو کہ حسن کا پورا پیکر لگ رہی ہے۔ میرے بالکل سامنے کھڑی ہے۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ میں مسلسل اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بال گھنے اور کالے تھے۔ آنکھوں میں عجب سی چمک تھی اور چہرے میں اتنی کشش تھی کہ میں پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی شکل وصورت تصویر والی دلہن سے بہت مل رہی تھی۔ میں نے اچانک دیوار پر وہی تصویر دیکھنا چاہی میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں وہاں کوئی تصویر موجود نہ تھی۔

وہ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میرے بہت قریب کھڑا ہو کر اس نے کانوں میں سرگوشی کی۔

"گھبراؤ مت آرام کرو۔"

وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔

"تم..... تم کون ہو.....؟ اتنی خوب صورت.....؟ کون.....؟"

وہ دانت پھیلا کر ہنسی۔ اس کے ہونٹ پنکھڑی کے گلاب کی مانند تھے اور دانت ہیرے سے بھی زیدہ سفید، چمکدار۔

وہ مڑی تو اس کی حسین کالی زلفیں کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی کمر کو چھو رہی تھیں۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میرا نام مہک افروز ہے اور میں تمہیں چاہتی ہوں جب تم پہلی بار اس کمرے میں آئے تھے۔ مجھے تب ہی تم سے محبت ہوگئی تھی۔

مگر تم..... تم..... تو مجھے نظر نہیں آئی۔

وہ اٹھی اور قریب آ گئی۔

اپنے معصومانہ اور پیارے چہرے سے مجھے دیکھنے لگی۔ مخملی ملائم ہاتھوں سے میرے سر پر انگلی رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"دماغ پر زور مت ڈالا کرو۔ میں تمہاری دیوانی ہوں بس یہ جان لو۔"

مجھے سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میں اس حسن کے پیکر کا عاشق بن گیا۔ میں نے بھی اس سے محبت کی حامی بھر لی۔ تنہارات کے تنہا لمحوں میں اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ مہک افروز نے مجھ سے کہا وہ روز رات 12 بجے کے بعد اس سے ملاقات کرے گی۔

"میں تمہاری بھلائی چاہتی ہوں۔ 12 بجے کے بعد سب سو جائیں گے تم مجھ سے ملنے آؤ گے کسی کو معلوم نہ ہوگا۔"

میں نے مہک افروز کی بات پر عمل کرتے ہوئے روز 12 بجے کے بعد اس سے ملنا شروع کر دیا۔

جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوتا وہ میری منتظر کھڑی ہوتی۔ میں گھنٹوں اس سے محبت بھری باتیں کرتا۔ پیار کا رشتہ جنم لے چکا تھا۔ مجھے تقریباً ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ مہک افروز سے روز ملاقات کرتے دل بے قرار رہتا تھا۔ دل چاہتا تھا اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنالوں۔

"میں تمہاری پیاسی ہوں۔"

وہ سرگوشی کرنے لگی۔ میں نے اسے خود سے الگ کیا۔ "مطلب..... کیا کہہ رہی ہو.....؟" میں حیرانی سے گویا ہوا۔

"جاناں تمہاری محبت کی۔" میں مسکرایا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ "تم جانتے ہو میں کون ہوں.....؟"

"ہاں جانتا ہوں....." میں مسکراتے ہوئے بولا۔

ہاہاہا..... وہ زوردار ہنسی ہنسی اگر تم جان جاؤ تو بھاگ جاؤ۔"

کیا مطلب..... ہاں سچ کہہ رہی ہوں میں..... میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ "اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو تمہیں کیا لگا میں کوئی ڈائن ہوں..... کتنے ڈرپوک ہو تم.....

اف....."

میں بھی ہنس دیا۔

"سنو..... میں انسان نہیں ہوں..... اب وہ سیریس ہوگئی میں یکدم بیڈ سے اٹھا۔ "ہاں میں انسان نہیں ہوں..... پری ہوں....."

مہک افروز تم بہت مذاق کرنے لگی ہو۔ مجھے خوفزدہ مت کیا کرو۔ جانتا ہوں پریاں خوب صورتی کا پیکر ہوتی ہیں اور تم واقعی کسی پری سے کم نہیں ہو۔

میں روز مہک افروز سے ملتا اور ہم گھنٹوں پیار بری باتیں کرتے، میں اس کے عشق اور حسن میں اس قدر گرفتار ہوگیا تھا کہ سنبھلنے کا ہوش ہی نہ رہا۔

کئی دن بیت گئے۔ ہم روز ملتے اور عشق ومحبت میں پاگل ہوگئے۔ ایک دن مہک افروز نے مجھ سے کہا وہ میری دلہن بننے کی خواہشمند ہے۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھ تھامے۔

"بس اتنی سی بات..... میں تمہارا ہی ہوں....."

میں نے قدرے پیار سے کہا۔

جانتی ہوں..... وہ مسکرائی۔ "مگر..... مگر مجھے تم سے کل ہی شادی کرنی ہے۔ وہ کسی ضدی بچے کی طرح ضد کرنے لگی۔"

"کل..... اتنی جلدی....." ہاں..... کل..... وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "کل تمہیں 12 بجے نہیں آنا۔"

"تو..... تو میں کب آؤں..... میں نے سوالیہ نظروں سے مہک کو دیکھا۔

12:59 منٹ پر تم ٹھیک یہاں آ جانا، یاد رہے ایک بھی منٹ آگے پیچھے مت ہونے دینا ورنہ ورنہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے دور ہو جاؤں گی..... اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"مہک..... تم ایسا کیوں کہتی ہو۔ بچھڑنے کی باتیں مت کیا کرو۔ تم تو میرا جہاں ہو..... میں ضرور آؤں گا۔

یاد رہے..... "تمہیں کل دلہے کے لباس میں آنا ہے۔"

میں مسکرایا۔ "ہاں میں بھی دلہا بن کر آؤں گا، اپنی پیاری دلہن کو لینے۔"

مگر ہاں..... وہ مجھے کچھ اور بھی چاہئے مہک اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"کیا مہک، ہچکچاؤ مت، بتاؤ کیا چاہئے میں دنیا کی ہر چیز تمہارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔"

"مجھے کالی سیاہ بلی چاہئے۔" اچانک وہ بھاری سی آواز میں بولی۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی مانند دہک رہی تھیں۔

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر تک یونہی دیکھتا رہا مگر پلک جھپکتے ہی اس کا چہرہ نارمل ہوگیا۔

تم..... تم کالی بلی کا کیا کرو گی؟ میں سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا۔

"مطلب نہیں لا کر دو گے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے تم پر تو جان بھی قربان ہے۔"

صبح کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمکا، آج میرا دل بھی سورج کی کرنوں کی مانند چمک رہا تھا۔ بے صبری سے رات کے ان پہروں کا انتظار کر رہا تھا جن پہروں میں وہ میری ہونے والی تھی۔ بہت مشکل سے میں نے ایک کالی بلی حاصل کی جسے دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ مگر پھر پنجرے میں بند کر دی۔

12:58 ہوئے تو میں دلہے کی طرح تیار ہو کر کمرے کی جانب چل دیا۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ پنجرے میں بیٹھی بلی میرے ہاتھ سے نکلی اور تیزی سے کمرے میں بھاگنے لگی کچھ ہی لمحوں میں وہ کہیں غائب ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد خوفناک قسم کی آواز آئی۔ جیسے اس بلی کو کسی نے چیر پھاڑ ڈالا ہو۔

تھوڑی دیر مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ اچانک روشنیاں تیز ہونے لگیں۔ کمرے کی حالت پہلے سے بہت مختلف تھی۔ بیڈ کی جگہ پر خوب صورت لمبے پردے لگے تھے۔ میں آگے بڑھا تو ان پردوں کو ہٹایا۔ جونہی

پردے ہٹے وہاں ایک اور دروازہ تھا۔ اسے کھولتے ہی میں آگے بڑھا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ سامنے ایک بہت بڑا اور عالیشان محل تھا۔ جس کے دائیں بائیں گھاس اور رنگ برنگے پھول اپنی خوب صورتی کا ثبوت دے رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکیاں میرے استقبال کے لئے پھولوں کی ٹوکریوں میں سرخ گلاب کی پتیاں لئے کھڑی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر پھول نچھاور کئے۔ چند قدم آگے بڑھا تو کوئی بہت ضعیف بڑھیا شکل موڑے کھڑی تھی۔ اس کے بالوں کی رسائی کمر تک تھی۔ مگر بال بالکل سفید اور بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ پل بعد وہ میری طرف مڑی تو اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ خوف میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ میرے آس پاس خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ بڑھیا کے نوکیلے دانتوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہاتھوں کے ناخن اس قدر لمبے تھے جیسے کسی کو قتل کرنے کے لئے رکھے ہوں۔ اس کی شکل انتہائی خوفناک تھی۔ بڑھیا کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں اور چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کئی ہزاروں سال سے جی رہی ہو۔ مجھے اس کی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر مزید خوف آنے لگا۔ وہ چڑیل نما بڑھیا دلہن کے لال جوڑے میں تھی۔ الٹے پاؤں سے وہ میری طرف آنے لگی۔

میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔ خوف اور وحشت کے عالم میں میرے تن بدن میں کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ ڈر اور خوف کے اس عالم میں میرے منہ سے کوئی الفاظ نہ نکلا۔

اس کے گلے سے خوفناک آواز نکلی۔

"ارسلان۔ اپنی شادی کے دن اتنا خوف اچھا نہیں ہوتا۔ شادی کا دن تو خوشیوں کا دن ہوتا ہے اب جلدی چلو وقت ہوا چلتا ہے۔ دل نے زبان کا ساتھ دیا بمشکل میرے گلے سے آواز نکلی۔

"کون۔ کون ہو تم.....؟"

وہ چڑیل نما بڑھیا خوفناک ہنسی ہنسی، خون اس کے منہ سے بہہ رہا تھا اس کے ساتھ ہی تمام موجود لوگ بھی خوفناک شکلوں میں بدل گئے۔ محل کسی پرانے کھنڈر کی طرح ہوگیا، سیاہ اندھیرا چھانے لگا۔

یہ سب کیا ہے..... کون ہے.....؟؟

میرے دل کی دھڑکن کی آواز سننے میں کانوں کو کوئی دقت نہ ہو رہی تھی۔ دل اچھل اچھل کر باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں تمہاری محبوبہ..... مہک افروز ہوں.....

آس پاس کے تمام لوگ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ان لوگوں کے سر ان کے ہاتھوں میں تھے اور تن سے جدا تھے۔ منہ سے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ یہ منظر میرے لئے خوفناک ترین تھا۔

آیئے پنڈت جی..... جلدی کیجئے وہ بڑھیا زور سے چلائی۔

آج اماوس کی کالی رات ہے۔ اگر میری شادی اس سے نہ ہوئی اور اس نوجوان لڑکے کو میں نے حاصل نہ کیا تو میری خوب صورتی اور جوانی ختم ہوجائے گی۔ میں خوف سے ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آرہا تھا۔

پنڈت کے ماتھے پر سرخ اور کالے رنگ کے لمبے لمبے ٹیکے لگے تھے۔ پنڈت کے آگے ایک خوفناک قسم کی کھوپڑی رکھی تھی۔ جس کی آنکھوں سے خون پھوٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور زبان کالی سیاہ تھی۔ وہ بالکل کسی دیو کی مانند لگ رہا تھا۔ اتنا بھیانک منظر میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔

خوف سے میری آنکھیں بھرنے لگیں۔ اچانک میرے جسم میں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔

میرے بازوؤں پر دو اژدھے کسی رسی کی طرح باندھ رہے تھے۔ ان کا خوفناک چہرہ دیکھ کر میں چکرا گیا۔ اژدھوں نے میرا پورا جسم جکڑ لیا اب میرے جسم پر ہر طرف کالے ناگ اور اژدھے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے لگا کہ میری موت قریب ہے۔ میں ہار مان گیا تھا۔

دہشت اور خوف سے بھرا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا تو میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کردیا۔ بار بار آیت الکرسی پڑھنے لگا تو وہ اژدھے مجھ سے دور ہوتے گئے۔ چڑیل اور پنڈت چیختی آوازوں کے ساتھ فوراً غائب ہوگئے۔ میں فوراً بھاگا۔ گرتا بھاگتا بالآخر میں دروازے سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی وہ دروازہ پوری مضبوطی سے بند ہوگیا۔

صبح فجر کی اذان ہوئی تو نماز پڑھنے مسجد میں گیا۔ قدموں میں کوئی طاقت نہ رہی۔ قدم لڑھکتے اور کپکپاتے رہے تھے، صبح اماں، ابا کو سارا قصہ سنایا۔ ابا نے مجھے تھپڑ رسید کیا تو امی نے مزید مار سے بچالیا۔

"مارئیے مت، مارنے سے کیا ہوگا..... مصیبت ٹل جائے گی، اس نے سب کے گلے مصیبت باندھ دی ہے۔ جلدی سے کسی عامل کو بلوایئے۔ میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ کہیں وہ خوفناک سایہ میرے بچوں کی جان نہ لے لے۔ جلدی کیجیے۔ امی رونے لگی۔

کالے سیاہ لباس میں ملبوس گلے میں کئی ہار اور تسبیحات پہنے ہوئے "حق ہو" "حق ہو" کے نعرے کے ساتھ عامل بابا گھر میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں ایک جھاڑو تھا، جس سے وہ گھر کا کونا کونا چیک کررہے تھے۔ عالم بابا میرے روبرو ہوئے تو میں نے ساری حقیقت لفظ بہ لفظ بتادی۔

بابا نے کہا ان کو خاص چلا کرنا ہوگا جس کی مدد سے وہ اس چڑیل کو قابو کرسکیں گے۔ اور ٹھیک 12 بجے اس کمرے میں داخل ہوگے۔ پورا دن گزر گیا ہم بابا جی کے انتظار میں تھے۔ بالآخر 11 بجے کے قریب بابا جی گھر آگئے۔ انہوں نے کچھ دیر تک اپنا خاص کلام پڑھا اور کہا۔

"صرف میں اندر جاؤں گا۔ تم لوگوں کو کسی خوف کی ضرورت نہیں اب میں اس بدبخت ڈائن کا خاتمہ کرکے ہی واپس لوٹوں گا۔ تم سب بس آیت الکرسی کا ورد جاری رکھنا۔"

وہ تنبیہ کرکے گئے۔

ہم سب نے ہاں میں سر ہلادیا اور پھر بابا جی کمرے میں داخل ہوگئے۔

تم جو کوئی بھی ہو..... حاضر ہوجاؤ..... اب تمہارا بچنا ناممکن ہے۔

تو مجھے قید کرے گا..... ہاہاہاہا..... چیختی ہوئی آواز کمرے کے چاروں کونوں سے آئی۔

کمرہ سیاہ پڑگیا۔ عالم بابا نے اپنا کلام پڑھنا شروع کردیا۔ کمرے میں آگ لگنے لگی۔

اپنے کلام سے عالم بابا نے آگ بجھادی۔ اس کے بعد زمین میں ایک بڑا چیرا آیا اور بابا پھسلے اور پیروں کے نیچے سے پھٹی زمین کے اندر دھنس گئے۔ بابا جی کی چیخوں کی آواز ہمیں باہر سنائی دے رہی تھی اور ہم آنکھیں بند کئے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر آیت الکرسی کا ورد کرتے رہے۔

تن سے جدا سروں والی ڈائنوں نے بابا جی کا بہت برا حال کیا۔ انہیں ایک کونے سے دوسرے پھر ہر کونے میں گھسیٹ گھسیٹ کر تکلیف دی گئی۔ بابا جی کا آدھا جسم جل چکا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اگر اندر کچھ اور وقت رہتے ہوئے عالم بابا اپنا پاک کلام نہ پڑھتے تو شاید وہ بدبخت ڈائن بابا جی کی جان لے لیتیں۔

تکلیف زدہ جسم کے ساتھ بابا جی بھاگ کر باہر آئے اور سر اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ بہت طاقتور چڑیل ہے وہ تم سب کا برا حال کرے گی۔ بہت برا۔ لڑکے تم نے اس سے مل کر اچھا نہیں کیا۔ وہ شیطان ہے شیطان۔

عالم بابا بلند آواز میں ہاتھ بلند کرکے بولتے گئے اور تیزی سے دروازے سے نکل کر بھاگ گئے۔

امی کے رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ ابو مجھ پر شدید برہم ہو رہے تھے۔ چھوٹا بھائی خوف کے مارے بے ہوش ہوچکا تھا۔ سب ڈر اور خوف کے لمحے میں تھے۔

ابو نے ہم سب کے گلے میں تعویذ ڈال دیئے اور ہم سب نے فیصلہ کرلیا صبح کی پہلی کرن نکلتے ہی ہم گھر چھوڑ دیں گے۔

صبح ہوتے ہی ہم نے سارا سامان پیک کرلیا۔ سب گھر سے باہر نکل گئے۔ میں بھی دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ یکدم میرے پاؤں سے کسی نے مجھے شدید قوت کے ساتھ کھینچا میں گھسیٹتا ہوا اسی کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔

''میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی..... کبھی نہیں تم نے مجھے اپنا خون نہ پلا کر بہت بڑی غلطی کردی۔ تمہارا خون میری جوانی کا راز تھا۔ تم نے مجھے بوڑھا کردیا۔ خوفناک صورت لئے وہ بڑھیا میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اچانک ابو، امی نے آکر زور زور سے قرآں پاک کی سورتیں پڑھنی شروع کردیں۔ پاک کلام اور گلے کا تعویذ اثر کرگیا۔ اور وہ چڑیل فوراً غائب ہوگئی۔ امی۔ ابو کے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے تھے۔ خوف سے وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بوجھل قدموں کے ساتھ ہمت کرتے ہوئے ہم سب وہاں سے باہر نکل آئے۔ یوں ہی ہم نکلے خوفناک چیختی ہوئی آوازیں آنے لگیں۔ ایسی آوازیں جیسے کوئی اپنے قریبی کے مرنے پر نوحہ کناں ہو۔

دوسرے شہر میں آکر میری حالت کچھ ٹھیک نہ رہی۔ دن رات مجھے کبھی مہک افروز کا چہرہ اپنے پاس بلاتا تو کبھی اس خوفناک چڑیل کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے آتا تو میری بند آنکھیں بھی کھل جاتیں۔ دن رات وہ چڑیل مجھے خوار کرنے لگی۔ مجھے اس سے عشق کرنے کی غلطی کی سزا مل گئی۔ میرا چہرہ بدنما ہوگیا، بال بڑھ گئے لوگ مجھے پاگل کہنے لگے۔ میری حالت بدتر سے بدتر ہوگئی۔ میرا دماغ سن ہوچکا تھا۔ صرف اور صرف چڑیل کی آواز کانوں میں آتی۔ میں گلیوں، بازاروں میں دوڑتا لوگوں سے خوفزدہ ہوتا۔ میری زندگی اجیرن بن چکی تھی اور شاید آنے والی زندگی بھی اسی عذاب کے سنگ گزرتی۔ اگر میرا دوست شمعون میری مدد نہ کرتا تو.....

ارسلان سے پہلی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے ذکر کرتا تھا کہ اس کے گھر میں ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ جس کے عشق نے اسے مجنوں بنادیا مگر میں مذاق سمجھ کر ٹال دیتا مگر دھیرے دھیرے مجھ پر حقیقت تب واضح ہوئی جب ارسلان کے ابا نے سب بتایا۔ میرے ابو احرام فلکیات اور علم جادو کے ماہر تھے۔ جنوں، بھوتوں کو قید کرنا ان کے لئے آسان تھا۔ مگر اس مرتبہ ارسلان کو ٹھیک کرنے کے لئے ان کو جس خوفناک اور بھیانک مناظر کا سامنا کرنا پڑا، شاید پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ابا کو چلے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہم تینوں رات قبرستان میں پہنچ چکے تھے۔ ارسلان تیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ ابا نے مجھے ارسلان کو ایک جگہ پر لے جا کر چھپنے کا کہا۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ قبرستان میں عمر رسیدہ درخت جسے دیکھ کر ہی خوف آتا اس کے نیچے بیٹھ کر ابا چلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور ارد گرد حصار تھا۔ حصار کے بیچوں بیچ تین کھوپڑیاں اور ایک بھیانک گڑیا رکھی تھی۔ ان کے ساتھ ہی کچھ روشن دیئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایسا منظر آیا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں سکتہ میں آگیا۔ تینوں کھوپڑیاں فضا میں بلند ہوگئیں اور زوردار قہقہے کی آواز آئی۔ کھوپڑیوں کی آنکھوں سے سرخ رنگ کی روشنی نکلنے لگی۔ میں پسینے سے شرابور ہوچکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کھوپڑیوں کے نیچے دھڑ بھی آنے لگے، ان سب کے ہاتھ میں تیز دھار تلوار دیکھ کر میں دنگ رہ گیا وہ تینوں اب ابا کی گردن پر تلوار رکھے ہوئے تھے۔ ابا نے مجھے سختی سے منع کیا تھا، میں جو منظر بھی دیکھوں اسے دیکھ کر چیخ تک نہیں نکالوں گا۔ مگر یہ منظر دیکھنا میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان تینوں مردوں نے ابا کو اوپر اٹھالیا۔ ابا فضا میں معلق ہوگئے۔ مگر منتر جاری رکھا، اچانک ہر طرف جانوروں اور انسانوں سے ملی جلی آوازوں کے قہقہے بلند ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر میں قبرستان ایک پراسرار قبرستان بن چکا تھا۔ خوف کے

سائے ہر طرف منڈلا رہے تھے۔ میں گویا رونے لگا۔ ان تینوں مردوں نے ابا کو کوئی نقصان نہ پہنچایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین میں دھنس گئے۔ اچانک جھٹ سے بڑی گڑیا اوپر اس رفتار سے اٹھی گویا آسمان سے ٹکرا کر واپس آئی ہو، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک خوفناک بڑھیا بن گئی۔

بڑھیا کے ناخن لمبے اور پاؤں الٹے تھے اس کے جسم کی بدبو مجھے اتنے فٹ کی دوری پر آرہی تھی۔ جھریوں زدہ چہرے کے آگے سفید بال لٹک رہے تھے۔ وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔

''اچھا کیا تو حاضر ہوگئی..... اب اس لڑکے کی جان چھوڑ دے اسے ایک عام زندگی گزارنی ہے۔''

کبھی نہیں..... کبھی نہیں..... اس نے میرے ارمانوں کا خون کیا۔ مجھے اپنا خون نہ پلا کر ہمیشہ کے لئے بوڑھا کردیا..... میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔

بڑھیا کی آواز میں ایسا جوش تھا کہ آواز قبرستان کے چاروں کونوں سے ٹکرا کر آرہی تھی۔

''اور تو اسے بچانے آیا ہے۔ جا یہاں سے ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

اس نے اپنا ہاتھ نکال کر ابا کی طرف بڑھایا۔ اس کا ہاتھ لمبا ہوتا گیا ابا کی گردن کو اس زور سے پکڑا تھا گویا ان کی زبان حلق میں اٹک گئی ہو۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور میں نے ابا کی بات نہ مان کر غلطی کردی۔

''ابا جی..... ابا جی..... چھوڑ! انہیں۔''

میری آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس بڑھیا نے حقارت اور غصے سے بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے ابا کو نیچے اتار کر میری طرف بازو بڑھایا اور مجھے شدید قوت کے ساتھ پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا۔ میری ٹانگیں اور وجود لٹک رہا تھا۔ سانس بند ہونے کو تھا۔ چھوڑ دے اس بچے کو اور ارسلان کو اور ابا کو جو ہوش میں آچکا تھا۔ بھاگتا ہوا آیا، اس نے ارسلان کو بھی ہوا میں لٹکا دیا تھا۔ ابا نے اپنا منتر تیزی سے پڑھنا شروع کردیا دیکھتے ہی دیکھتے ابا کے پاس کانچ کی ایک بڑی شیشی آگئی۔

آہ..... نہیں..... یہ شیشی دور کردو اسے..... چھوڑ دو دونوں کی جان ورنہ قید کردوں گا۔ جانتی نہیں تم، میں بہت طاقتور عامل ہوں۔

چڑیل کو غضب کا غصہ آچکا تھا..... اس نے فوراً ہم دونوں کو زمین پر پٹخا۔

ابا نے اونچی آواز میں منتر پڑھا اور چڑیل چیخنے لگی۔

''نہیں.....'' اس کی چیخ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ابا نے ہر طرف آگ لگادی۔ چڑیل کے چاروں طرف آگ تھی۔ ابا کے منتر کی آواز سے وہ بے ہوش ہوگئی اور یوں لگا جیسے آگ نے اسے جلا دیا ہو اس کی راکھ اڑ کر شیشی میں خود بخود آگئی اور ہمیشہ کے لئے قید ہوگئی۔

ابا نے خوشی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ہم تینوں واپس گھر کو لوٹ آئے۔ آج کتنا عرصہ بیت گیا ارسلان ایک نارمل زندگی گزار رہا ہے۔ ارسلان آج بھی میرا شکریہ ادا کرتا ہے۔ میں نے ابا کے ذریعے اس کی مدد کر کے اس کی زندگی کو نارمل بنادیا۔ ابا کی وہ شیشی آج بھی ان کے خاص کمرے میں ہے۔ ہر سال اماوس کی رات کو اس شیشی میں سے زور زور سے چیخنے کی آواز آتی ہے۔

میرے ذہن میں پرانا منظر گردش کرتا ہے جب ابا نے چڑیل کو آگ میں بھسم کردیا تھا۔ مگر پھر بھی اس شیشی میں سے آوازیں.....

کیا وہ چڑیل پھر سے.....؟

یہ سوال اکثر میرے وہم و گمان پر طاری رہتا ہے مگر پھر میں خیالوں کو جھٹک دیتا ہوں۔

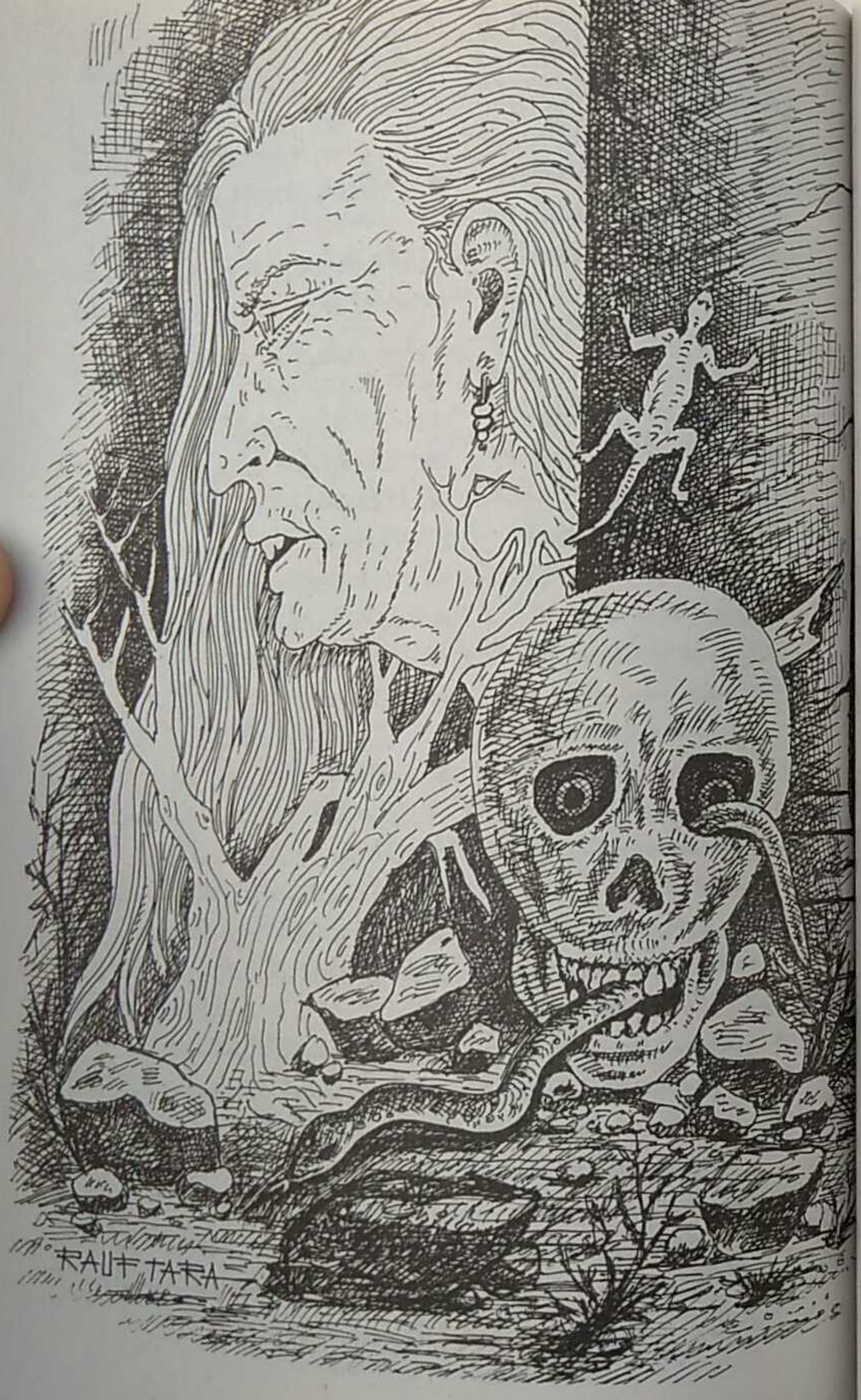

عفریت

قسط نمبر 4

ملک این اے کاوش-سلانوالی سرگودھا

خوف و ہراس کی وادی میں تھلکہ مچاتی اور جسم و جاں کو لرزہ براندام کرتی دھشت ناک، وحشت ناک، ھولناک اور خوفناک، ناقابل فراموش دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی لرزیدہ لرزیدہ کھانی جو کہ پڑھنے والوں کو ڈر کے شکنجے میں جکڑلے گی۔

ایک خونی عفریت کی دل دہلاتی اور کرب واذیت سے دوچار کرتی.....دلخراش کہانی

اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کے حکم پر لبیک کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب میں اس کی حراست میں ہوں۔ہاتھ پیر مارنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔میں بری طرح سے اس کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔آصف میلو کا لہجہ بے شک الفت بھرا تھا لیکن اس کی آواز میں ایک عجیب سا خوفزدہ کردینے والا تاثر تھا۔میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے براجمان ہوچکا تھا۔میری سوالیہ نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔میں پیہم سوچے جارہا تھا کہ پتہ نہیں یہ آصف میلو اب میرے ساتھ کیا کرے گا۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری عفان؟''

آصف میلو نے متواتر اسی الفت بھرے انداز میں پوچھا۔مجھے کافی حیرت ہورہی تھی کہ رات کو شانتری کو میرے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دینے اور پھر روکنے والا انسان اب مجھ سے ایسے کیسے بات کررہا تھا۔یہ بات تو مترشح تھی کہ اس کا شمار بھی میرے دشمنوں کی لسٹ میں ہی تھا۔آخر کو وہ بھی شانتری کا حمایتی تھا۔

''مجھے گھٹن کا احساس ہورہا ہے۔''میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں یہاں کسی خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔تم سے کچھ گفتگو کرنی تھی۔'' آصف میلو نے میری بات کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا۔

آصف میلو کے لہجے میں وہی ایک عجیب سا تاثر نمایاں تھا۔میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اسے حیرت سے تکنے لگا اور سوچنے لگا کہ کہیں یہ مجھ سے شانتری کا بدلہ لینے کا ارادہ تو نہیں کیے ہوئے۔میں جانتا تھا کہ اب تک کے تمام واقعات میں شانتری ایک نہایت ہی خبیث اور بدکردار چڑیل ثابت ہوئی تھی۔وہ بہت ہی مکار تھی اس نے اپنی مکاری کا جال ضرور آصف میلو پر پھینک کر اسے بھی متاثر کرلیا ہوگا۔چند لمحے کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر آصف میلو گویا ہوا:

''اب بہت سی باتوں سے گریز کرنا ممکن نہیں ہے۔اگر تمہیں یاد ہے تو پچھلی رات میں تمہارے پاس تمہارے کمرے میں آیا تھا۔''

اتنی بات کہہ کر آصف میلو خاموش ہوگیا۔جو بات میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چبھے جارہی تھی اس نے اس کی تصحیح کردی تھی۔میں نے اس کی بات کا جواب دینا بہتر نہ سمجھا تو ایک بار پھر وہ گویا ہوا۔

''وہ وقت آگیا ہے عفان جب میں اپنے اور تمہارے درمیان ایک رابطہ قائم کرنے پر از حد مجبور ہوگیا ہوں۔میرا تم سے ایک واسطہ ہے۔اس کی کوئی بھی

شکل سمجھ لو۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایسے ہی تعاون کرو جیسے میں تم سے کر رہا ہوں۔ میں جو بھی کام کرنا چاہتا ہوں بڑے آرام وسکون سے کرلیا کرتا ہوں۔ یہی نہیں مجھے اس کام کو کرنے میں کسی دقت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اگر میں چاہوں تو تم بھی وہی کرو جو میں کہوں۔

لیکن میں تمہیں کٹھ پتلی غلام کی طرح انگلیوں پر نچانا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے راستے میں نہ آؤ تاکہ ہم دونوں کی راہیں ہموار رہیں۔ تمہیں میرے ساتھ متواتر اور بھرپور تعاون کرنا ہے۔ تم شانزیب انوسہ کو کسی کے لیے چھوڑ دو۔ ان کی فکر کرنا اور ان کی حمایت کرنا چھوڑ دو۔ ان کے لیے خود کو بلاوجہ مصیبتوں میں مبتلا کرنا چھوڑ دو۔ تمہارا ان کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس شہر کا نہیں اس ملک کا سب سے امیر ترین انسان بنادوں۔ اس کے بدلے میں میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تمہاری سات پشتوں کی اگلی سات پشتیں دونوں ہاتھوں سے دھڑا دھڑ بھی لٹاتی رہیں تو بھی کوئی تمہارے جیسا امیر نہیں بن پائے گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"آپ نے جو کچھ کہنا تھا شاید آصف میلو صاحب کہہ لیا۔" میں نے آصف میلو کو مخاطب کیا۔

اس شخص کے پاس اس کمرے میں داخل ہونے سے قبل میں جتنا خوفزدہ تھا اب اس سے کئی گنا زیادہ بہادر بن چکا تھا۔ اس کی باتوں نے میرے پست حوصلوں میں جان بھر دی تھی۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اس کی جان لے لوں۔

"میں مانتا ہوں کہ آپ کے پاس بہت سارا علم ہے۔ آپ کے پاس بہت کچھ کرنے کی شکتی بھی ہے لیکن شاید آپ میرے مزاج کو سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

آصف میلو صاحب میں سوائے اس مالک کے کسی سے نہ ڈرتا ہوں نہ مانگتا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں تہی دست ہو گیا لیکن میں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہیں کیا تھا۔ میں آپ کے اعتراف اور انداز سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ پچھلی رات بقول آپ کے آپ میرے کمرے میں آئے۔ میں نے اس وقت بھی آپ کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن آواز ضرور سنی تھی۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو اور مجھے ذرہ مزید وضاحت سے بات بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میری بات ہمہ تن گوش ہو کر سننا عفان۔" آصف میلو نے متواتر نرم لہجے میں کہا۔

"میں سن رہا ہوں آپ بولیے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم شانتری سے شادی کرلو۔" اس نے متواتر اسی لہجے میں کہا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس نے منوں وزنی ہتھوڑا میرے سر پر دے مارا ہو۔

میں حیرت کا مجسمہ بنا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جے میں کچھ اچھا انسان گردانے لگا تھا۔ وہ بھی انہیں میں سے ہی ایک مورکھ نکلا تھا۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچ گئی کہ آخر اسے جواب دوں تو کیا دوں۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اس کی تکہ بوٹی ایک کر کے رکھ دوں۔ کتنی ہی دیر تک میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا۔ آصف میلو کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جبکہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ آصف میلو نے میرے ساتھ ایک بھونڈا مذاق کیا ہے۔ شاید وہ مجھے آزما رہا ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سوالیہ نگاہیں میرے دماغ میں سوراخ کر کے جھانک رہی ہوں اور میرے دل و دماغ میں ابھرتے سوالوں کو پڑھنے کی سعی کر رہی ہوں۔

وہ اپنے الفاظ پر میرا ردعمل پڑھنے کی متواتر سعی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا اور میرے چہرے کو تکتا رہا۔ شاید اسے امید واثق تھی کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دوں گا لیکن جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ ایک بار پھر گویا ہوا۔

"مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے عفان۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یاد رکھنا ایک بار شانتری سے شادی کرلو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہیں زندگی میں کتنی

بڑی تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ تم نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا ہوگا اتنا کچھ تمہارے قدموں میں ڈھیر لگا دوں گا۔ مال و دولت کا عام ہونا تو ایک قدرتی بات ہے۔ انسان تھوڑی سی جدوجہد سے اتنی دولت کما سکتا ہے کہ اس کی ساتوں پشتیں بیٹھ کر کھاتی رہیں تو ختم نہ ہو۔

اگر شانتری تمہارے قبضے میں آجائے تو تم اتنے شکتی شالی بن جاؤ گے کہ تمہارے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ مدمقابل کے لیے حکم بن جائے گا جسے ٹالنا کسی کے بس میں بھی نہ ہوگا۔"

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں آصف میلو صاحب؟" میں نے کہا تو آصف میلو نے مشکوک آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس کے لہجے میں چنداں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔

"آصف میلو صاحب آپ شانتری کو کیسے جانتے ہیں؟" میں نے آصف میلو کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو اس کے بارے میں کیا معلوم ہے۔ اور یہ کس نے کہا ہے کہ میں اس سے شادی کرلوں تو....."

میں نے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں آصف میلو کی پیشانی پر عیاں ہوتی سلوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا سوال سن کر کچھ مضطرب سا ہو گیا تھا۔ شاید وہ کوئی نیا جواب بننے کی تگ و دو میں تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ آصف میلو کی نگاہیں ایک بار تو جھک گئیں۔ کتنی ہی دیر تک وہ چپ سادھے براجمان رہا اور میں اسے متواتر تکتا رہا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟" جب وہ کافی دیر تک نہ بولا تو میں نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

"مجھے تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" آصف میلو نے ناگواری سے جواب دیا۔

"میرا کام ہے تمہیں سمجھانا۔ تاکہ تم آنے والے حالات سے باخبر ہو جاؤ۔ آنے والا ہر دن تمہارے لیے مشکل نہ بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ بھلے وقت میں تم بھلا فیصلہ کر کے اپنے بھوش کے لیے کوئی بہتر لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ شانتری سے شادی کر کے میرا بھوش بہتر ہو جائے گا؟" میں نے سوالیہ مگر حیران کن آنکھوں سے آصف میلو کو دیکھ کر پوچھا۔

جواباً اس نے مجھے عجیب انداز سے گھورا۔ اس کے دیکھنے کا انداز تھوڑا عجیب اور پراسرار ضرور تھا۔ لیکن میں اب ان گیدڑ بھبکیوں کا عادی ہو گیا تھا۔ اتنا تو میں جان ہی چکا تھا کہ کچھ غائبانہ طاقتیں میری بھی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ میں خود کو اس قابل نہیں گردانتا کہ میں بہت پارسا ہوں لیکن شاید میری کوئی نیکی ایسی تھی کہ جس کی وجہ سے میں ان خبیث ارواح کے چنگل سے بچا ہوا تھا۔

"تم حد سے زیادہ عقل مند ہو عفان۔" آصف میلو نے میری بات سن کر تعریفانہ لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے آصف میلو کو بغور دیکھا۔ جس نے میری بات سن کر ایک بار پھر مجھے گھورا۔

"تم حد سے زیادہ ضدی انسان ہو لیکن میری بات ہمہ تن گوش ہو کر سن لو کہ بے جا ضد بھی انسان کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔" آصف میلو نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"بہرحال میں تمہیں کسی بات کے لیے بھی آمادہ کرنے پر زیادہ زور نہیں دینا چاہتا۔ ہاں البتہ تمہیں ایک ایڈریس دے رہا ہوں۔ وہاں جاؤ جا کر ایک بار شامین اور اس کے اہل خانہ سے مل لو۔ ممکن ہے ان سے ملاقات کے بعد تمہارے انکار کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔"

اتنا کہہ کر آصف میلو نے میری طرف ایک وزنگ کارڈ بڑھایا جسے نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تھام لیا۔ دل تو نہیں کر رہا تھا لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وزنگ کارڈ پر لکھے ایڈریس پر جا کر ان لوگوں سے بھی کر دیکھ لوں۔ میں اس مسئلے کو ہر ممکن حل کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی بھی طور ان خبیث آتماؤں سے جان چھڑوا کر اپنی نئی زندگی بیتانے کا

خواہش مند تھا۔جس میں کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔ایک بھرپور اور خوش زندگی۔جس میں ماضی کی تلخیاں شامل نہ ہوں۔

میں جلد ہی آصف میلو سے اجازت لے کر اور بنائی ہوئی پینٹنگز کی پیمنٹ وصول کر کے وہاں سے نکلا۔میں فی الحال کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔میں نے وہ کارڈ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ شانزیب صاحب بھی گھر موجود تھے۔میں سیدھا ان کے روم کی طرف چل دیا۔

دروازہ کھٹکھٹایا تو شانزیب کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"کون ہے؟" انہوں نے چنداں تلخ لہجے میں پوچھا۔

"میں ہوں۔" میں نے جواباً دھیمے لہجے میں کہا۔مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میں نے انہیں ڈسٹرب ہی کیا ہے۔

"میں ہوں عفان۔"

"آجاؤ اندر۔" شانزیب صاحب نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

جس وقت میں اندر داخل ہوا اس وقت شانزیب صاحب اپنی وہیل چیئر پر آنکھیں موندھے براجمان تھے۔انہوں نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور آنکھیں دوبارہ موند لیں۔

"کیا ہوا انکل؟" میں نے ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے زیرلب مسکرا کر جواب دیا۔

"بس ایسے ہی انوسہ کے کمرے سے واپس آیا تو چیئر پر بیٹھ گیا کہ چلو دو منٹ سکون ہی لے لوں۔"

"پھر تو میں نے ڈسٹرب کیا ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں برخوردار ایسی بات نہیں ہے۔" انہوں نے میری بات کی نفی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر ڈسٹربنگ ہوتی تو میں ایکسکیوز کر کے تمہیں وہیں سے چلتا کرتا۔"

"آصف میلو صاحب نام تھا ان کا۔" میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا تو انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھورا۔

"جن کا کام مکمل کیا ہے۔انہیں تھوڑی دیر قبل ہی پہنچا کے آیا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔" انہوں نے بھنویں اچکاتے ہوئے جواب دیا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"کوئی بات تو نہیں کی انہوں نے۔؟"

میں شانزیب صاحب کی بات کا کیا جواب دیتا۔اگر انہیں بتا دیتا کہ ان کا یہ نیا کسٹمر بھی انہی میں سے ہے۔جو ان کی اور ان کی دختر کی جان کے درپے ہیں تو شاید یہ بہتر نہیں تھا۔

"نہیں تو۔" میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت اچھے انسان تھے۔ملنسار اور احساس مند انسان معلوم ہوتے تھے۔کافی دیر ان کے ساتھ گفتگو بھی ہوتی رہی ہے۔پینٹنگز کے بارے میں انہوں نے کافی تعریفانہ کلمات ادا کیے تھے۔سن کر خوشی ہوئی تھی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شانزیب صاحب نے میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کے لیے سلام کا تحفہ بھی بھیجا ہے۔" میں نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا اور پینٹنگز کی پیمنٹ ان کی طرف بڑھائی۔

"وعلیکم السلام۔" شانزیب صاحب نے پیمنٹ پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔"

"آمین۔" میں نے ان کے دعائیہ کلمات کا جواب دیا۔

شانزیب صاحب نے ہمیشہ کی طرح بنا گنتی کے پیمنٹ جیب میں ڈال لی۔

"انوسہ سے ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں؟"

شانزیب صاحب نے سوال داغا۔

"نہیں تو میں تو سیدھا آپ کی طرف ہی چلا آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ اب کافی بہتر ہے۔" شانزیب صاحب نے بتایا۔

"برخوردار تمہارا حق بنتا ہے کہ تم بھی انوسہ کو کچھ وقت دیا کرو۔آخر کو تم بھی اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہو۔تمہارے اس گھر میں آنے کی وجہ سے اس کی بیماری میں کافی حد تک کمی واقع ہو چکی ہے۔اس لیے میری خواہش ہے کہ تم جس حد تک ممکن ہو سکے زیادہ وقت انوسہ کو دیا کرو۔وہ اب پہلے کی طرح ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی ہے۔"

شانزیب صاحب کی بات سن کر میرے من میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔میں انہیں کیا بتاتا کہ میں تو ہر پل اس کے ساتھ بیتانے کا خواہش مند ہوں لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں۔جنہیں زبان پر لانا بے حد مشکل امر ہوتا ہے۔

"میں ادھر ہی جا رہا تھا سوچا پہلے آپ کو حساب دے لوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"برخوردار مجھے تم پر کسی بھی قسم کی کوئی بے اعتباری نہیں ہے۔" شانزیب صاحب نے چنداں ناگواری سے جواب دیا۔

"انکل ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیسی بات ہے؟" شانزیب صاحب نے پوچھا۔

"اگر ایسی بات نہیں ہے۔تو اتنی جلدی کیا تھی۔تم نے کہیں چلے جانا تھا اور ویسے بھی یہ پیسے تم اپنے پاس رکھو۔تمہارے پاس بھی پیسے وافر ہونے چاہییں۔"

شانزیب صاحب نے فقرہ مکمل کرنے سے قبل ہی سارے پیسے مجھے تھما دیئے۔

"لیکن میری کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں ہے انکل کہ میں اتنے سارے پیسے اپنے پاس رکھوں۔" میں نے بتایا۔

"نہ تو میرا اب کوئی ایسا عزیز ہے۔جو مجھ سے ملنے آئے گا۔یا میں کسی کے لیے پیسے سنبھال کر رکھوں گا۔ویسے بھی جتنوں کی مجھے ضرورت ہوتی ہے۔میں خود ہی آپ سے طلب کر لیتا ہوں۔"

"دیکھو برخوردار۔" شانزیب صاحب نے میری بات سن کر مجھے مخاطب کیا۔

"لازمی نہیں کہ کوئی ملنے آئے یا کسی اپنے کے لیے پیسے سنبھال کر رکھے جائیں۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیسوں کی ایمرجنسی ضرورت پڑ جاتی ہے۔سفر میں پیسے ضرورت پڑ سکتی ہے۔یا کہیں بھی تو اس وقت بجائے پریشان ہونے کے یا ادھر ادھر رابطہ کرنے کے اپنے پاس ہوں تو بندہ اپنی مشکل تو مٹا ہی سکتا ہے ناں۔"

میرے پاس شانزیب کے مزید کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔اس لیے میں نے چپ چاپ پیسے جیب میں ڈالے۔اور ان سے اجازت لے کر ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔اب میرا رخ انوسہ کے کمرے کی طرف تھا۔

انوسہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر جیسے ہی میں نے دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اتفاق سے انوسہ نے دروازہ کھول دیا اور وہ بمشکل ہی بچی وگرنہ میرا ہاتھ اس کے چہرے پر جا لگتا۔دروازہ کھولتے ساتھ ہی وہ یکبارگی پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے یہ کیا؟" انوسہ نے سرزنش کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں پیچھے نہ ہٹ جاتی تو جناب کا ہاتھ میرے منہ پر آ کر جم جاتا۔"

انوسہ کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور شرارت بھی۔وہ زیرلب مسکرا رہی تھی۔دروازے سے ایک طرف ہٹ کر اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔میرے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر دیا لیکن چٹخنی نہیں لگائی تھی۔میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ویسے جناب کو آج ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

"میں نے سوچا تمہارے پاس تو ٹائم نہیں ہے میں خود ہی آجاتا ہوں۔" میں نے اس کے سوال کو پس پشت ڈالتے ہوئے جواب دیا تو اس نے ناک بسورتے ہوئے مجھے گھورا۔

"اچھا جی شکریہ۔" انوسہ نے چنداں خفگی کے عالم میں کہا۔

"تمہیں پتہ ہے اتنی زیادہ طبیعت خراب رہی ہے میری۔ اور تم نے ایک بار بھی پتہ تک نہیں کیا؟"

انوسہ کی شکایت بجا تھی لیکن شاید اس کی یاداشت کمزور ہوگئی تھی۔ کیونکہ ایک بار میں آیا تھا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا تھا۔

"شاید تمہیں یاد نہیں ہے لیکن میں آیا تھا تمہارا پتہ کرنے۔" میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"منٹ سیکنڈ کے لیے احسان چڑھانے۔" اس نے متواتر خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"اس سے تو بہتر تھا نہ ہی آتے۔"

"ایکچوئلی وہ....." میں بولنا چاہتا تھا لیکن انوسہ نے مجھے چپ ہاتھ کے اشارے سے چپ کروادیا۔

"عفان اتنے بہانے نہ بنایا کرو۔" انوسہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

نجانے اس وقت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ میں دیکھنے کی جسارت نہ بچی تھی۔ میں نے نگاہیں زمین پر گاڑھ دیں۔

"محبت کا رشتہ بہت مقدس رشتہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر بہانوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہانے تو اس رشتے کے اندر ہوتے ہیں۔ جس کے اندر مطلب پرستی یا خودغرضی کی آمیزش شامل ہو۔"

انوسہ میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی کسی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"اب کیسا محسوس کررہی ہو؟" میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں۔ جو ڈائریکٹ قلب و ذہن کو ایذاء پہنچاتی ہیں۔" انوسہ نے متواتر اسی لہجے میں کہا اور میں نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

اس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں مجھے بے پناہ محبت رقصاں دکھائی دی۔ وہ مجھے محبت بھرے انداز میں تکے جارہی تھی۔

"میں تمہیں زیادہ صفائیاں نہیں دینا چاہتا انوسہ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ بار بار تم سے ملنے پر شانزیب صاحب معترض نہ ہوں۔" میں نے وضاحت کی تو انوسہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرے پاپا شکی مزاج انسان نہیں ہیں عفان۔" انوسہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں مگر....." میں نے وضاحت کرنی چاہی لیکن انوسہ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک بار پھر چپ کروادیا۔

"پلیز شاہان۔" انوسہ بولی۔

اس کے بولنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندر سے چور چور ہو۔

"پیار محبت کے اندر اگر، مگر یا کاش کے لفظ جب داخل ہوجاتے ہیں تو پیار کی دیواریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔"

میں نے اس کی بات سن کر چپ رہنا ہی بہتر جانا۔ جب میں کافی دیر تک نہ بولا تو انوسہ خود ہی دوبارہ گویا ہوئی۔

"عفان کھانا کھالیا ہے یا....."

انوسہ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن ہونٹ بھینچتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ انوسہ نے ملازم کو بلا کر اسے کھانے کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد ہم آپس میں گفتگو کرنے لگ گئے۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن میں ناشتہ کرکے گھر سے نکل پڑا۔ میرے ساتھ الطاف بھی تھا۔ الطاف کو میں نے آصف میلو سے ہونے والی ملاقات میں ہر بات سے خبردار کردیا تھا۔ اور اسے یہ بھی بتادیا تھا کہ میں کہاں اور کس سے ملنے جارہا ہوں۔ الطاف میری بات سن کر بے شک

مضطرب ہوگیا تھا لیکن اس نے میری ڈھارس بندھائی تھی کہ اگر اس شانتری خبیث سے جان اسی طریقے سے چھوٹ سکتی ہے تو یہ بھی کرہی لینا چاہیے۔

گاڑی الطاف ڈرائیو کررہا تھا۔ راستے میں ہمارے درمیان اسی ٹاپک پر ہی گفت وشنید ہوتی رہی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ عجیب سی بے چینی کا شکار ہوگیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہاں جانے کی بجائے واپس پلٹ جاؤں لیکن نجانے کون سی کشش تھی جو مجھے وہاں کھینچے لیے چلی جارہی تھی۔

آصف میلو کے دیئے گئے کارڈ کے مطابق ہم ایک عالیشان کوٹھی کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اس کوٹھی کو دیکھ کر ایک بار تو آنکھیں اس پر ٹک سی گئی تھیں۔ ہمیں ڈور بیل بجائے کی مہلت ہی نہ ملی کیونکہ دروازہ خود بخود ہی کھل گیا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازہ کھولنے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

الطاف نے سوالیہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے گاڑی اندر پورچ میں لے جانے کا کہا۔ ادھر ہم گاڑی پورچ میں کھڑی کررہے تھے تو دوسری طرف مین گیٹ خود بخود بند ہوگیا۔ میرا دل ہولنے لگا تھا۔ یہی کیفیت الطاف کی بھی تھی لیکن میں نے سارے تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوگا۔ جب اس وقت تک یہ خبیث چڑیلیں ہمارا بال تک بیکا نہیں کرسکیں تو اب بھی ان سے ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

میں نے الطاف کو وہیں گاڑی میں بیٹھنے کا کہا۔ وہ میرے ساتھ اندر جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"عفان آپ بہت بڑا ریسک لے رہے ہیں۔" الطاف نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم چنتا مت کرو الطاف۔" میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"ہماری مدد خالق کائنات فرمائے گا۔ تم یہاں مستعد رہنا۔"

"آپ اکیلے اندر نہ جائیے۔" الطاف نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیا۔

"ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ اکیلا انسان اکثر و بیشتر ہمت ہار بیٹھتا ہے لیکن اگر کوئی ساتھ ہو تو اس کی ہمت دوگنی ہوجاتی ہے۔"

"میں نے کہا ناں تم چنتا مت کرو۔" میں نے اتنا کہا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔

ابھی میں مین انٹرس میں انٹر ہی ہوا تھا کہ ایک مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کے دائیں ہاتھ ڈرائنگ روم ہے۔ وہاں تشریف لے جائیں پلیز۔"

میں نے ایک نظر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ میں زیادہ دیر رکا نہیں اور دائیں طرف چل پڑا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہی ڈرائنگ روم تھا۔ میں چپ چاپ جاکر ڈرائنگ روم میں ایک سائیڈ پر رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

مجھے بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی ہوگی کہ ایک خوبصورت دوشیزہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اسے پہچاننے میں مجھے ذرا بھر دیر نہ لگی کیونکہ وہ شامین ہی تھی۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود پڑ گئی تھیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ کسی اپسرا کی مانند اس کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق عیاں تھی۔ اک دلکشی اور شگفتگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ ایک دوسرے سے بغل گیر تھے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ساتھ ہی اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"بہت خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے گھر آئے یقین نہیں ہورہا۔"

بات مکمل کرتے کرتے وہ بھی میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

"میں یہاں خود نہیں آیا۔" میں نے اسے بتانا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کروادیا۔

"ارے عفان صاحب۔" وہ دلبرانہ انداز میں بولی۔

"خود کوئی بھی چل کر نہیں آتا۔ ہمیشہ دوسرے کی چاہت انسان کو کھینچ کر لاتی ہے۔"

میں اس کی بات سن کر زیرلب مسکرادیا۔ عین اسی وقت ڈرائنگ روم میں شاہین کا والد داخل ہوا۔ نجانے مجھے کیسے پتہ لگ گیا کہ یہ شاہین کا باپ ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے بھی عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ وہ آتے ساتھ ہی شاہین کیساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں کافی حیران و ششدر رہا کہ گھر میں آئے مہمان سے اس نے ہاتھ تک ملانا گوارہ نہیں کیا تھا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی یہاں تک پہنچنے میں؟" شاہین کے والد نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔" میں نے زیرلب مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ کا گھر بہت پیارا ہے۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ عجیب سی کشش ہے اس مکان کے اندر کہ جو ایک نگاہ دیکھتا ہے۔ وہ گرویدہ ہوجاتا ہے۔"

میری بات سن کر دونوں باپ بیٹی کے لبوں پر مسکراہٹ جلوہ گر ہوگئی۔

"یہ خوبی صرف مکان میں ہی نہیں ہے۔" میری بات سن کر شاہین بولی۔

"جو ایک بار ہم سے بھی مل لیتا ہے۔ وہ بھی گرویدہ ہوجاتا ہے۔ اس کا دل نہیں کرتا کہ ہم سے جدا ہو۔"

میں شاہین کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ جواباً میں زیرلب مسکرادیا۔ قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی گویا ہوتا ڈرائنگ روم میں شاہین کی امی داخل ہوئی۔ وہ کوئی اور نہیں وہی منحوس شانتری تھی۔ جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ جس کے سر پر ایک ہی بھوت سوار تھا کہ میں اس منحوس کالی بھدی چڑیل سے شادی کر کے ساری زندگی کے لیے جوڈو کا غلام بن جاؤں۔ لیکن اب تو وہ ایسے برتاؤ کر رہی تھی جیسے وہ مجھے جانتی ہی نہ ہو بلکہ مجھے صرف شاہین ہی جانتی ہو۔ وہی شاہین جو میرے ہاتھوں ابدی نیند سو چکی تھی۔ اور اب ایک بار پھر زندہ سلامت میرے سامنے براجمان تھی۔

"یا خدایا میری مدد کرنا یہ سب کیا ہے؟ یہاں تو مردے بھی زندہ ہوچکے ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں خالق کائنات سے مدد مانگی۔

میں نجانے مجھے کیسے شاہین سے منسلک ہر رشتے کی آگاہی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر کوئی یہ بات ڈالے جا رہا تھا۔ شاہین کی امی بھی مجھ سے دور سے ہی ہیلو ہائے کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"شاہین بیٹا عفان صاحب ہمارے گھر پہلی بار آئے ہیں۔" شاہین کی امی نے اسے شاہین کو یاد دہانی کرواتے ہوئے مخاطب کیا۔

"چلو جاؤ انہیں اپنے گھر کی سیر کرواؤ تاکہ انہیں پتہ چلے کہ ہمارا گھر کتنا سندر ہے۔ جنت سے مشابہ ہے۔"

شاہین کی ماں اپنے منہ ہی میاں مٹھو بنے جا رہی تھی۔ اس کی بات سن کر میں زیرلب مسکرادیا لیکن اندر ہی اندر اس موٹی کالی بھدی کے لیے نجانے کیا کیا الفاظ نکل گئے۔ پھر یکدم ہی مجھے خیال آیا کہ میں انسانوں کے نہیں چڑیلوں کے گھرانے میں بیٹھا ہوں جنہیں ذہن میں ابھرے خیال سے بھی آگہی ہوتی ہے۔

"آؤ عفان۔" شاہین اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"آج میں تمہیں اپنے گھر کی سیر کرواؤں۔"

اس کی بات سن کر میں بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ساتھ ہی شاہین نے میرے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیا۔ لیکن پھر بھی اس نے کچھ فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ شاہین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی دل کو حوصلہ دیئے چل رہا تھا۔

نجانے وہ مجھے کہاں لیے جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پروردگار سے آنے والے حالات کی بہتری کی دعا کر رہا تھا کیونکہ یہ بات حقیقت پر مبنی تھی کہ ان حالات و واقعات نے مجھے ذہنی طور پر بہت زیادہ اپ سیٹ کیا ہوا تھا۔

اس کوٹھی کا ایک ایک گوشہ قابل دید اور قابل تعریف تھا۔ ہم لان میں آگئے۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک سوئمنگ پول بھی بنا ہوا تھا۔ شاہین پوری طرح سے مجھے لبھا رہی تھی۔ وہ سوئمنگ پول کے کنارے سنگ مرمر سے بنی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی اشارہ کیا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔

شاہین نے نجانے کون سا پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ جس کی خوشبو قلب و دہن کو بھا رہی تھی۔

"میرے ابو بہت اچھے ہیں۔" شاہین بولی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر کوئی ان کا دل جیت لے تو یوں سمجھ لو عفان کہ اس نے دنیا جیت لی۔"

میں شاہین کی بات کا مطلب بڑے اچھے طریقے سے سمجھ چکا تھا۔ میں نے اس کی بات سن کر بھنویں اچکائیں لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"اچھا عفان صاحب آپ یہ بتایئے کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

شاہین کا یہ سوال بڑا ہی عجیب تھا۔ یکدم ہی اس نے پرسنل میٹرز پر گفتگو کرنی شروع کردی تھی۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی دودھیا آنکھوں میں محبت کی دھنک مترشح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے رومینٹک انداز سے میں اس کے دل کی بات سمجھ ضرور چکا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کرسکتا۔

"ہر انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب وہ کسی نہ کسی خوبصورت چہرے پر گرویدہ ہوجاتا ہے۔" میں نے اب کی بار سوئمنگ پول کے پانی پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ بات بھی لازمی نہیں کہ وہ چہرہ خوبصورت ہو۔ کبھی کبھی خوب سیرتی بھی دوسرے کو اسیر کر جاتی ہے۔"

"ہوں۔" شاہین نے ہونٹ بھینچے۔

"بڑی فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں آپ عفان صاحب۔ ویسے کون ہے وہ خوش قسمت جس پر آپ فدا ہوچکے ہیں؟"

"میرے پیارے والدین۔" میں نے نم آلود لہجے میں جواب دیا۔

"میں ان سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ ان کی حیات میں کرتا ہوں۔"

"اوہ سوری۔" شاہین نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ بہت افسوس ہوا یہ جان کر۔ والدین بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔"

"بس قسمت کے لکھے کے سامنے ہر شخص لاچار ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر والدین اور بہن بھائیوں کے علاوہ بھی کوئی انسان ایسا ضرور انسان کی زندگی میں داخل ہوجاتا ہے۔ جس سے انسان کو محبت ہوجاتی ہے۔" شاہین اتنی بات کر کے کچھ دیر کے لیے رکی اور پھر دوبارہ گویا ہوئی:

"انسان کی زندگی میں اس نئے رشتے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اسے وہ بہت عزیز ہوتا ہے۔ اسے پانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنے قریبی رشتوں کی قربانی بھی دینی پڑجاتی ہے۔ ایسا کوئی آپ کی زندگی میں بھی تو شامل ہوا ہی ہوگا؟"

"آپ صحیح سمجھی ہیں۔" میں نے جواب دیا تو شاہین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"کیا میں اس کے بارے میں پوچھ سکتی

ہوں؟'' شامین نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ آپ کے والدین ہمارا انتظار کررہے ہوں گے۔'' میں نے شامین کو یاد دلاتے ہوئے کہا تو چاروناچار وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم دونوں چلتے ہوئے ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ ابھی ہمیں بیٹھے دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ شامین کی والدہ کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''شامین بیٹا عفان کو لے کر ڈائننگ روم میں آجاؤ۔ کھانا تیار ہے۔''

شامین نے میری طرف دیکھا اور میں بنا کوئی بات کیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں ڈائننگ روم میں پہنچے جہاں ایک بیضوی ٹیبل کے گرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک اس لمبوتری بیضوی ٹیبل کے فرنٹ والی کرسی پر شامین کا والد بیٹھا تھا۔ جبکہ آنے سامنے تین تین کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ شامین اور میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی وقت مجھے الطاف کا خیال آیا لیکن ایک بار پھر میں نے سوچا کہ الطاف کو نہ ہی بلاؤں تو بہتر ہے۔ کیونکہ میں ان لوگوں کی اس ساری مہمان نوازی کا نچوڑ نکالنا چاہتا تھا۔

ٹیبل کے اطراف ٹوٹل آٹھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ شامین کی ماں تقریباً کھانے کی مختلف ڈشیں سجا چکی تھی۔

''ارے آنٹی یہ کیا آپ خود ہی اتنی زحمت گوارہ کررہی ہیں۔'' میں نے شامین کی والدہ کو ڈشیں سجاتے دیکھ کر پوچھا۔

''گھر میں کوئی ملازم وغیرہ نہیں رکھا ہوا۔ میں جب سے آیا ہوں مجھے تو اس عالیشان بنگلے میں کوئی ملازم بھی دکھائی نہیں دیا۔''

''عفان بیٹا یہ سوال شامین کے پاپا خرم سے کرو۔'' شامین کی والدہ نے جواب دیا۔

''یہ کہتے ہیں کہ خواتین اسی وقت خاتون خانہ لگتی ہیں جب وہ گھر کے کام کاج خود کرتی ہیں۔ جو لوگ ملازم رکھتے ہیں اور اپنے اندرون خانہ انتظامات ان کے سپرد کرتے ہیں۔ وہ اپنے گھر سے کسی طور مخلص نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص نہیں ہوتے۔''

مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہوں۔ میں نے شامین کی والدہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بس سر ہلا دیا۔ خرم صاحب اور ان کی مسز سامنے رکھیں قابیں کھولنے لگیں۔ یکبارگی میں دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ میں یہ کیا کررہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کے گھر سے کچھ بھی نہیں کھانا چاہیے۔ ممکن ہے یہ کھانے کے اندر کوئی ایسی چیز ملا دیں یا کوئی ایسا جادو ٹونہ کردیں جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

مجھے تو ان لوگوں کے بارے میں کوئی اندازہ بھی نہیں ہورہا تھا کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ ان کے گھر کا کھانا پینا تو بڑی خطرناک بات تھی۔ شامین نے مجھے سوچوں کے بھنور میں غرق دیکھ کر ایک ڈش اٹھا کر میرے سامنے رکھی۔ میرے سامنے رکھی پلیٹ میں ایک چمچ بھی رکھ دی۔

''کن سوچوں میں غرق ہیں عفان صاحب؟'' شامین نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیوں شرما رہے ہیں آپ لیجئے نہ؟''

میں نے پریشان کن نگاہوں سے اس ڈش کو دیکھا۔ لیکن آناً فاناً میری حیرت ہویدا رہ گئی۔ اس ڈش میں شوربے جیسی کوئی چیز تھی لیکن وہ شوربہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور نہایت ہی بھیانک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس شوربے میں کالے کالے لمبے کیڑے کلبلا رہے تھے۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ میں نے حیرانی سے اس ڈش کو دیکھا۔ میری حیرانی کو شاید شامین نے بھانپ لیا تھا۔ شامین نے ڈش اپنی طرف کھینچ کر اس میں نگاہ دوڑائی تو اس کی آنکھیں بھی حیرت و خوف سے پھیل گئی۔ کراہیت کی وجہ سے اس کے منہ سے بڑی عجیب

سی آواز نکلی۔ ممکن تھا کہ وہ ابکائی کردیتی لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا کر اس ڈش کے اوپر ڈھکن دے کر اسے ایک طرف دیکھ دیا۔

''کیا ہوا؟'' شامین کی والدہ نے پوچھا جو ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''کک..... کچھ نہیں امی۔'' شامین نے دوسری ڈش اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن جب اس نے دوسری ڈش کا ڈھکنا کھولا تو اس کی صورت حال بھی ویسی ہی تھی۔ شامین نے سرعت سے اس کا ڈھکنا اس کے اوپر رکھ دیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ ڈش بھی کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو چکی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔

شامین کی والدہ نے جلدی سے ساری ڈشوں کو دیکھنا شروع کردیا اور اگلا منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کیا بات ہے خیریت تو ہے ناں؟'' شامین کے والد نے اہلیہ سے پوچھا۔

شامین کی والدہ نے ایک ڈش ان کے سامنے رکھی۔ جس کا ڈھکنا انہوں نے کھول کر دیکھا اور فوراً ہی بند کردیا۔

''آخر یہ سب کیا ہے؟'' خرم صاحب تقریباً دھاڑتے ہوئے بولے۔

ان کی کیفیت دیدنی تھی لیکن مسز خرم کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتی۔ وہ تو سر پکڑ کر رہ گئی تھیں۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ سب کیسے ہوا؟'' مسز خرم گویا ہوئی۔

''یہ سب کچھ تازہ تھا۔ میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہے مگر.....''

میں اس خالق کا شکر ادا کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شامین کی فیملی کی آنکھوں میں ندامت مجھے مترشح دکھائی دے رہی تھی لیکن میں تو اپنے خالق کا شکر بجالاتے نہیں تھک رہا تھا۔ میں سرعت سے باہر نکل آیا۔ یہ تو شکر ہے کہ میرے پیچھے باہر کوئی نہیں نکلا تھا۔ شاید وہ لوگ مجھ سے نگاہ ملانے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ لیکن میرے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ میں تو خود یہاں سے کچھ بھی نہیں کھانا چاہتا تھا۔

سب ڈشز میں سے کیڑے نکل آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں اس بات پر سوچنا چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میری غائبانہ مدد کی گئی تھی۔ تاکہ میں ان خبثاء کے اثر سے بچا رہوں۔ اب تو یہ بات مجھ پر ثابت ہو چکی تھی کہ یہ ضرور میرے ساتھ کچھ کرنے والے تھے لیکن ان کی ہر چال ناکام ہو چکی تھی۔ میں مین انٹرس کے پاس تھوڑی دیر رکا کہ شاید شامین مجھ سے ایکسکیوز کرنے یا مجھے باہر تک ڈراپ کرنے آئے لیکن کوئی بھی نہ آیا۔

میں باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن نجانے کیوں میرے دل میں ایک عجیب سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ میرے قدم باہر کی بجائے ایک بار پھر ڈائننگ روم کی طرف بڑھے۔ مجھے مین انٹرس میں کھڑے کاشف نے دیکھ لیا تھا۔ اس کی سوالیہ آنکھیں مجھ پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ ابھی تک فرنٹ سیٹ پر ہی براجمان تھا۔ مجھے ایک بار پھر واپس مڑتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر حیرت کے مارے سلوٹیں عیاں ہوگئی تھیں۔ لیکن میں اسے نظر انداز کرتا ہوا واپس ڈائننگ روم کی طرف بڑھا۔

میں نے ڈائننگ روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر شامین کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے ایک بار پھر آواز دی لیکن پھر جواب نہ ملا تو میں نے ڈائننگ روم کے دروازے پر دستک دی لیکن بے سود.....

پھر میں نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت ہویدا رہ گئی کہ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میرے اٹھنے سے قبل سب ہی سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ میں ڈائننگ روم سے کچھ فاصلے پر مین انٹرس کے سامنے کھڑا ادھر ہی دیکھتا رہا تھا کہ کوئی نکلے گا لیکن کوئی بھی نہیں نکلا تھا تو سب یکبارگی گدھے کے سر سے

سینگ کے جیسے کہاں غائب ہوگئے تھے۔

کچھ دیر تک میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اندر دیکھتا رہا۔ڈائننگ ٹیبل بھی خالی پڑا تھا۔جس کے اوپر کچھ ہی منٹ پہلے کتنی ہی ڈشز سجائی گئی تھیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔"اوہ میرے خدا!"

اس کے بعد میں حیران وششدر ڈائننگ روم سے باہر نکل آیا۔راہداری میں بھی کوئی دکھائی نہ دیا۔نہ ہی قرب وجوار میں کسی کی موجودگی کا کوئی معلوم ہو رہا تھا۔میں جان چکا تھا کہ یہ آسیب زدہ گھر اب اپنی اصلی حالت میں آگیا تھا۔میں سیدھا پورچ میں پہنچا جہاں الطاف بے صبری سے میرا انتظار کررہا تھا۔الطاف اب باہر نکل کر گاڑی سے پشت ٹکائے کھڑا اندر ہی دیکھ رہا تھا۔مجھے نکلتا دیکھ کر وہ فوراً ہی گاڑی میں ڈرائیور سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔میں نے گاڑی کا فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔الطاف نے گاڑی کو ریورس کیا اور پہلے کی طرح مین گیٹ آٹومیٹکلی طور پر کھل گیا لیکن اب اس چیز نے ہمیں قطعاً حیران نہیں کیا تھا۔

اس پراسرار اور سنسنی خیز واقعے نے ایک بار پھر مجھے مضطرب کردیا تھا۔میں حالات پر غور کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔شاہین اور اس کے والدین نجانے مجھ سے کیا کچھ کرنے والے تھے۔اگر میں ایک آدھ نوالہ کھالیتا تو نجانے پھر مجھے کیسی کیسی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا۔مجھے اس مالک نے ان کے ہر گھناؤنے منصوبے سے بال بال بچالیا تھا۔

میری غائبانہ مدد کی گئی تھی اور میں اس وجہ سے اپنے خالق ومالک کا بے حد مشکور تھا۔دوران سفر الطاف کے پوچھنے پر میں نے صرف اتنا کہا کہ کوئی خاص بات یا واقعہ رونما نہیں ہوا جس کی وجہ سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

الطاف مزید بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر میں نے جان بوجھ کر بات کا رخ ہی بدل دیا۔گھر پہنچتے ساتھ ہی میں چپ چاپ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں ایک دم سے اتنا سنجیدہ سا کیوں ہوگیا تھا۔یہی نہیں بلکہ کمرے میں داخل ہوتے ساتھ ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں بیڈ پر لیٹ گیا۔لیٹنے کی دیر تھی کہ نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی۔

میرے خواب میں مولوی ندیم صاحب تشریف لائے۔انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی بس کچھ نہ کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتے رہے۔اس کے بعد نجانے کیسے کیسے خواب آئے۔یاد نہیں لیکن مجھے صبح الطاف نے اٹھایا۔میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گیا کہ میں اتنا سویا تھا۔میں جب شاہین کے گھر سے واپس آیا تھا تو اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجنے میں بس کچھ منٹ باقی تھے اور میں اسی وقت سو گیا تھا۔

الطاف میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔مجھے کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے اس طرح دیکھنے کا کیا مطلب تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے الطاف سے پوچھا۔

"تم ایسے ٹکٹکی باندھے مجھے کیوں گھورے جارہے ہو۔کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟"

"لگتا ہے بڑے عرصے کے بعد آپ کو سونے کا ٹائم ملا ہے؟" الطاف نے کہا تو میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ کتنی دیر تک سوئے ہیں؟"

"بس یار آنکھ ہی نہیں کھلی۔" میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو اب تو کھل گئیں نہ آنکھیں۔" الطاف نے پوچھا تو میں نے زیر لب مسکرا کر ہاں میں سر ہلادیا۔

"تو پھر آجایئے میں ناشتے پر آپ کا انتظار کررہا ہوں۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ چلے اور میں فریش ہوکے آجاتا ہوں۔میں تھوڑی ہی دیر میں فریش ہوکے کاشف کے پاس پہنچ گیا۔ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ناشتے کے دوران ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہ ہوسکی۔ناشتے کے بعد الطاف نے برتن سمیٹے۔

"سنو الطاف۔" الطاف جو چائے تیار کرکے دو کپوں میں ڈال کر لایا تھا۔میں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے سوالیہ آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"جلدی چائے پیو قبرستان جانا ہے۔"

میری بات سن کر الطاف نے بھنویں اچکائیں۔

"خیریت تو ہے نہ عفان؟" الطاف نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

جلد ہی ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر قبرستان کی طرف جارہے تھے۔تھوڑی ہی دیر میں ہم قبرستان کے سامنے تھے۔راستے میں میں نے ایک پھولوں کی دوکان سے تھوڑے سے پھول بھی خرید لیے تھے۔ اور ایک دوکان سے اگربتی اور ماچس کی ڈبیا بھی خرید لی تھی۔ہم دونوں گاڑی سے اتر کر قبرستان میں داخل ہوگئے۔

پھولوں اور اگربتی والا شاپر الطاف کے ہاتھ میں تھا۔ہم دونوں مولوی ندیم کی قبر کے پاس جا کر رک گئے۔قبر پر کچھ پرندے بیٹھے ہوئے تھے جو ہمارے قریب پہنچتے ساتھ ہی اڑ گئے تھے۔قبر پر چاول اور دال مونگ کسی نے پھینکی تھی۔اسی وجہ سے پرندے اس قبر پر اکٹھے تھے۔میں نے الطاف سے شاپر لیا اور پھول نکالنے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالا تو الطاف نے مجھے مخاطب کیا۔

"عفان وہ کیا ہے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی اس طرف دیکھا جس طرف وہ انگلی سے اشارہ کررہا تھا۔ میں نے فوراً اس طرف دیکھا۔اس کا اشارہ مولوی ندیم صاحب کی قبر کی طرف تھا۔جب میں نے وہاں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔قبر پر ایک تعویذ پڑا ہوا تھا۔جسے الطاف نے فوراً ہی جھک کر اٹھالیا۔

"مجھے یاد آیا عفان۔" الطاف نے تعویذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مولوی ندیم صاحب میرے خواب میں آئے تھے اور انہوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں ان کی قبر پر آؤں۔یہاں مجھے ایک تعویذ ملے گا جو صرف آپ کے لیے ہے۔یہ خواب مجھے دو تین دن پہلے آیا تھا۔لیکن جانے انجانے میں میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔اب تعویذ دیکھ کر مجھے فوراً وہ خواب یاد آگیا ہے۔"

"تھینک الطاف۔" میں نے الطاف کے ہاتھ سے تعویذ لیتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے مولوی ندیم کی قبر پر فاتحہ شریف پڑھی اور پھول بچھائے پھر میں نے فرطِ محبت سے تین اگربتیاں مولوی ندیم کی قبر کے پاس لگائیں۔باقی ماندہ پھول مولوی ندیم کے ساتھ والی قبروں پر پھینک دیئے اور اگربتیاں بھی ایک ایک کرکے لگادیں۔

پھر میں مولوی ندیم کی قبر کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔الطاف ایک قبر کے پاس اگی گھاس صاف کرنے میں مشغول ہوگیا تھا۔میں نے اس تعویذ کو جسے الطاف سے تھام کر شرٹ کی فرنٹ پاکٹ میں رکھا تھا۔ہاتھ میں نکال لیا۔

"مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے ایک بار پہلے بھی آپ سے کچھ تعویذ لیے تھے۔" میں نے دل ہی دل میں مولوی ندیم کو مخاطب کیا لیکن میری نگاہیں مولوی ندیم کی قبر پر گڑھی ہوئی تھیں اور وہ تعویذ میرے ہاتھوں کی جھولی میں تھا۔

"ان تعویذوں کی وجہ سے مجھے بہت سی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے یہ تعویذ کس مقصد کے تحت میرے لیے چھوڑا ہے۔لیکن پھر بھی میں اس کی جان سے بڑھ کر حفاظت کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ میری وقتاً فوقتاً پشت پناہی فرمارہے ہیں۔اور اس سب کے لیے میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔"

میں آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔میں نے تعویذ کو جیب میں ڈال لیا۔مجھے وہ وقت بار بار یاد آنے لگا جب

بوقاف نے وہ تعویذ مجھ سے چھین لیے تھے۔ جنہیں میں نے سپرد خاک کیا تھا۔ جس کی وجہ سے شانتری کا چہرہ جھلس اور جسم کئی جگہوں سے جھلس گیا تھا۔

میں وہاں مزید نہ رک سکا۔ میں نے الطاف کو آواز دی جو ابھی تک قبروں کے پاس سے صفائی کرنے میں مصروف تھا۔ میں قبرستان کے اکلوتے دروازے کی طرف چل پڑا۔ جس کے پاس ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ الطاف بھی میرے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔

کتنی دلچسپ بات تھی کہ ایک طرف میری مخالف قوتوں میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا اور دوسری طرف میرا مالک میری حفاظت کا بھی بندوبست کیے ہوئے تھے۔ میرا مالک میرے لیے وسیلے بھی خود ہی پیدا کررہا تھا۔ بے شک میں ان حالات سے بہت زیادہ پریشان تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ بے صبری کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پہلے جہاں مجھے مرنے کی شدید خواہش تھی۔ اب وہ خواہش بالکل ختم ہوچکی تھی۔ میں جینا چاہتا تھا اپنے لیے بھی اور اپنی محبت کے لیے بھی۔

ہم دونوں واپس گھر آگئے۔ گھر آکر میں باہر لان میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ یکبارگی میرے ذہن میں ایک اور خیال نے جنم لیا اور میں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن اس سے پہلے اس خیال پر اچھی طرح سے غور وفکر کرنا تھا۔

دوسرے دن میں نے بڑی احتیاط سے اپنی تیاریاں شروع کردیں۔ حویلی کے دوسری طرف جیسا کہ پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ درختوں کی بہتات تھی۔ جھاڑ جھنکار بھی بری طرح سے اگ آئے تھے۔ اس طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ دی تھی۔ سوکھی خشک ٹہنیوں کے جابجا انبار دکھائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس خوبصورت حویلی کی بائیک سائیڈ پر کوئی جنگل ہو۔

سوکھے پتوں کے ڈھیر تھے۔ جو پیروں تلے آکر چرچراتے تو ان کی آواز قوت سماعت سے بھی ٹکراتی۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں الطاف کو ساتھ ملا کر سوکھی ٹہنیوں کو اکٹھا کرکے اس عمارت کے اندر بھرنا شروع کردیا۔ جہاں سے اس تہہ خانے میں جانے کا راستہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس بات کا پتہ شاہ زیب صاحب اور انوسہ کو نہ ہو۔ ویسے بھی شاہ زیب صاحب اس طرف نہیں آتے تھے۔

ہم دونوں نے ٹہنیوں کا اندر انبار لگا دیا تھا۔ الطاف نے ایک بار پوچھا بھی کہ میں باہر سے کوئی مزدور بلا لاتا ہوں یا پھر میں خود سارا کام کرلیتا ہوں آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں۔ لیکن میں نے اسے منع کردیا کہ نہیں ہم دونوں مل کر کرلیں گے۔

وہ مزید کیا پوچھتا آخر کو میں اس کے صاحب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ویسے بھی الطاف بہت کم ہی بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ ہم دونوں نے یہ کام بڑے ہی خفیہ طریقے سے کیا تھا۔

عمارت کا وہ اندرونی حصہ جو تہہ خانے کی طرف جاتا تھا۔ جس راستے میں مجھ سے ایک بلی مری تھی۔ جس کے بارے میں بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ شاہین ہے۔ شانتری کی دختر جو میرے ہاتھوں سے مرگئی تھی۔ مگر پھر جب میں ان کے گھر گیا تو وہ زندہ یوں گھوم پھر رہی تھی جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ کتنی مکار ہیں یہ دونوں ماں بیٹیاں۔ دونوں ماں بیٹیاں خبیث اپنے اپنے طور طریقوں سے مجھے پھانسنے کے لیے داؤ پیچ اختیار کررہی تھیں۔ لیکن میں بھی کوئی دودھ پیتا بچہ نہ تھا کہ ان کی پھیلائی جال میں پھنس جاتا۔

تہہ خانے کے دروازے تک وہ راہداری ہم نے تقریباً ٹہنیوں سے بھردی تھی۔ ہمارے قد کے برابر اس راہداری میں ٹہنیاں ہم نے بھردی تھیں۔ میں نے پورا دن پھر گھر ہی گزارا۔ کام کرنے کو من نہیں کررہا تھا۔ کبھی آکر الطاف کے پاس بیٹھ جاتا تو کبھی انوسہ کے پاس چلا جاتا۔ میرے اندر ایک ضدی پیدا ہوگئی تھی اور اس ضد کی وجہ سے میں نے ایک بھیانک منصوبہ بنانا شروع کردیا تھا۔ رات کا کھانا میں نے

اور انوسہ نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ شانزیب صاحب بھی اس وقت پہنچے جب ہم کھانا شروع کرنے لگے تھے۔

ہم دونوں نے انہیں کھانے کی آفر کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ دوپہر کو پیٹ بھر کر کھانے کی وجہ سے اب گنجائش نہیں ہے۔ مجھے اور انوسہ کو اکٹھے دیکھ کر اور انوسہ کو میرے ساتھ خوش دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک ساتھ کتنی ہی دعائیں انہوں نے دیں۔ انہوں نے اپنا بیگ ادھر ہی رکھا اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر وہ ہمارے ساتھ گفت وشنید کرتے رہے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔

کھانا کھانے کے بعد میں تھوڑی دیر مزید وہاں رکا اور اس وقت اپنے کمرے میں آگیا جس وقت انوسہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار انوسہ کے ساتھ اتنا وقت بیتایا تھا۔ اس پر انوسہ بھی بہت خوش تھی کہ میں اب بہت ٹائم دینے لگ گیا ہوں۔ مجھے انوسہ کی بہت چنتا تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اصل میں اس خبیث مخلوق کی نظر انوسہ پر ہے۔ میں کسی طرح جلد سے جلد انوسہ کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا تھا لیکن میں شانزیب صاحب سے یہ بات کرتے ہوئے بہت کتراتا تھا کہ کہیں وہ غصہ نہ کرجائیں۔

دوسری طرف انوسہ بضد تھی کہ میں شانزیب صاحب سے انوسہ کے بارے میں بات کروں لیکن میرے اندر فی الحال اتنی ہمت نہ پیدا ہو پارہی تھی کہ میں شانزیب صاحب سے اس ٹاپک پر بات کرسکتا۔ ایک بار میں نے تمام تر ہمت کو یکجا کرکے بات کرنا چاہی لیکن یوں لگا جیسے الفاظ حلق کے اندر جم سے گئے ہوں۔ زبان گنگ ہوگئی ہو۔ مجھے اس وقت احساس ہوگیا کہ ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا۔ ممکن ہے ایک وقت میں شانزیب صاحب خود ہی میرے اور انوسہ کے بارے میں بات چیت شروع کردیں۔ میں ہمہ وقت خالق کائنات سے دعا کرتا رہتا تھا کہ شانزیب صاحب خود ہی کسی دن میری اور انوسہ کی شادی کی بات کریں اور میں فٹ سے ہاں کردوں لیکن شاید ابھی انتظار کرنا لازمی تھا۔

بارہ بجے کے قریب وقت تھا جب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ سارے مکین اپنے اپنے کمروں میں گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں۔ میں نے اپنے بیڈ کے نیچے رکھی پٹرول کی بوتل اٹھائی جو میں نے الطاف کی نظروں سے بھی چرا کے بھروائی تھی۔ اس بوتل کے بارے میں اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے وہی ماچس نکالی جو قبرستان جاتے وقت دکان سے خریدی تھی۔ میرا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے پیروں میں آہنی زنجیریں ڈال کر مجھے یہ سب کچھ کرنے سے روکنے کی سعی کررہا ہو۔

لیکن آج میں بھی رکنے والا نہیں تھا۔ میں نے بھی مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے آج یہ قصہ ضرور منطقی انجام تک پہنچاؤں گا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر سر باہر نکال کر باہر جھانکا تاکہ تسلی کرلوں کہ کوئی ہے تو نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ راہداری میں دبے قدموں چلتا ہوا میں مین انٹرنس کے پاس آکر رک کر الطاف کے کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی لیکن مجھے پتہ تھا کہ وہ خود خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ لگ کر عمارت کے اس حصے کی طرف چلنے لگا۔ جس طرف پرانی عمارت واقع تھی۔ بالآخر میں چھپتا چھپاتا اس عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں چیر کر باہر نکل آئے گا۔ میرے ہاتھ بری طرح سے کانپ رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ میرا پورا جسم ہی وائبریٹنگ کررہا تھا۔ میرا جسم اتنی تیزی سے وائبریٹ کررہا تھا کہ بڑی ہی مشکل سے میں نے اس بوتل کا ڈھکنا کھولا۔ مجھے بار بار یوں لگ رہا تھا جیسے ان گنت آنکھیں میرے چاروں اطراف محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔

میرا دل کررہا تھا کہ میں زور زور سے چیخنا چلانا شروع کردوں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ایک بار پھر میں بری

طرح سے ڈر کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ میں بری طرح سے ڈر رہا تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کس سے ڈر رہا ہوں لیکن اتنا جانتا تھا کہ میرے دل میں ڈر نے بری طرح سے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

بالآخر بڑی ہی مشکل سے میں نے آدھی بوتل ان ٹہنیوں پر انڈیلی ہوگی۔ مزید انڈیلنے کی سکت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسی لیے میں نے باقی ماندہ بوتل کو ان ٹہنیوں کے اوپر اچھال کر پھینک دیا۔ اب میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی۔ میرے ہاتھ اتنے زیادہ کانپ رہے تھے کہ تیلی ٹھیک سے پنچ بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ ایک ساتھ کتنی ہی تیلیاں ضائع ہو گئیں۔

میں نے دل ہی دل میں اس خالق کو یاد کر کے ایک بار پھر کوشش کی تو تیلی نے آگ پکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحے ٹہنیاں آگ پکڑ چکی تھیں۔ میں نے اس باقی ماندہ ماچس کو بھی انہی ٹہنیوں کے اوپر پھینکا اور سرعت سے بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ساتھ بھی کتنے ہی لوگ بھاگ رہے ہوں۔ میرا سانس بری طرح سے پھول رہا تھا۔ میں بری طرح سے خوفزدہ ہو چکا تھا۔ میرے پیچھے خشک ٹہنیوں کے جلنے کی آواز ابھی تک میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ آگ اتنی تیزی سے پھیل رہی تھی کہ میرے پیچھے لال پیلی تیز روشنی پھیل چکی تھی۔ میں متواتر بھاگتا جا رہا تھا۔

میں الطاف کے کمرے کے سامنے جا کر دھڑام سے زمین پر گرا۔ شاید میرے گرنے کی آواز پر الطاف کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے فوراً گن سنبھالی اور باہر نکل آیا لیکن مجھے زمین پر گرا اور بری طرح سے ہانپتا دیکھ کر اس کے چہرے کے رنگ اڑ گئے۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ تبھی اس کی نگاہ اس پرانی عمارت کی طرف اٹھ گئی اور پھر اس کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر ٹک سی گئیں۔ الطاف کو سامنے دیکھ کر میرے خوف میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔

میں زمین پر ہی دونوں پاؤں لمبے کیے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی زمین پر ٹکائے اور اس پر اپنا سارا وزن ڈالے بیٹھا بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ الطاف نے ہاتھ کا سہارا دے کر مجھے کھڑے ہونے میں مدد کی۔ میں نے پہلی بار مڑ کر اس پرانی حویلی کی طرف دیکھا۔ آگ بری طرح سے بھڑک اٹھی تھی۔ دھوئیں کے غول کے غول بلند ہو رہے تھے۔ آگ کی لال پیلی روشنی نے ماحول کو منور کر دیا تھا۔

مجھے جو کرنا تھا میں نے کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ حویلی نیست و نابود ہو جائے گی۔ یہ ساری عفریتیں اسی آگ میں جل بھن کر ختم ہو جائیں گی لیکن شاید یہ میری خام خیالی تھی۔ میں نے الطاف کا شانہ دبایا اور اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ الطاف اندر جا کر میرے لیے ایک گلاس پانی کا لے آیا۔ جو میں ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔

"عفان آگ بری طرح سے بھڑک اٹھی ہے۔" الطاف نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ آگ زیادہ بھڑک جائے اور سوکھے درختوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ شانزیب صاحب آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا میرے بھائی۔" میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

پانی پینے کے بعد اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا ورنہ اس سے پہلے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی میرا دل سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔

یہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ ہوا نہیں چل رہی تھی۔ ورنہ آگ جس طرح بھڑک رہی تھی۔ اس کی چنگاریوں کے دور دور تک گرنے کے واضح امکانات تھے۔ آگ پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ جلد ہی میری سماعت سے کچھ شور سا سنائی دیا۔ اور اگلا منظر دیکھ کر الطاف اور میں دونوں ہی اپنی جگہ بت بنے رہ گئے۔

شانزیب صاحب اور انوسہ دونوں بھاگتے ہوئے حویلی سے باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ دونوں نے

ہمیں دیکھا تو تقریباً دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ دونوں کی سانسیں بری طرح سے پھول رہی تھیں۔ میں نے الطاف کو اشارہ کر دیا کہ وہ اس سب سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرے۔

"جلدی سے فائر بریگیڈ کو فون کرو برخوردار۔" شانزیب صاحب نے آتے ساتھ ہی تحکمانہ لہجے میں مجھے کہا۔

"ارے یہ آگ لگی کیسے؟ بہت شدید تو نہیں ہے کہیں پھیل ہی نہ جائے۔ جلدی سے فون کرو تاکہ بروقت عملہ یہاں پہنچ کر اس آگ پر قابو پا لے۔"

شانزیب صاحب ایک ہی سانس میں بولے جا رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ آگ کے پھیلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں نے فون ڈائریکٹری میں سے فائر بریگیڈ کا نمبر تلاش کر کے انہیں آگاہ کیا۔ شانزیب صاحب پرفی الوقت کچھ بھی عیاں کرنا بہتر نہ تھا۔ الطاف نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر انہیں پتہ چل گیا تو بہتر نہیں ہوگا۔

یکبارگی میری آنکھیں اس عمارت کے ایک خاص حصے پر ٹک گئیں اور جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ وہ ناقابل یقین اور ناقابل فراموش تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ساتھ کتنے ہی سائے اس عمارت سے نکل کر بھاگ رہے تھے۔ وہ سائے واضح نہیں تھے۔ جس سے یہ اندازہ لگانا بہت دقت طلب امر تھا کہ ان میں مرد کتنے تھے اور عورتیں کتنی تھیں۔ لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایک جم غفیر اس پرانی حویلی کے اندر جمع تھا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سایوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب پرانے پھاٹک والے گیٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ دروازہ خود بخود کھل چکا تھا۔ سب اس دروازے سے گزر کر اندھیرے میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی چیخ و پکار اور بھاگنے تک کی بازگشت میری سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ شانزیب صاحب اور انوسہ کے علاوہ کاشف پر ڈالی۔ لیکن ان لوگوں کی نگاہیں بس ایک ہی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ جہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ ان سایوں کو دیکھنے والا میں اکیلا ہی تھا۔ میرے علاوہ اور کوئی بھی انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔

شاید یہ ان سایوں کے درمیان ہونے والے عرصہ دراز کے واقعات کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے اب مجھ سے چھپ کر رہنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس وقت جو میں منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ اس وقت میں کتنی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

ابھی تک فائر بریگیڈ والے نہیں آئے تھے۔ آگ نے حویلی کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔ اب آگ کے شعلوں میں خود بخود ہی کمی پیدا ہونے لگ گئی تھی۔ آگ خوب بھڑک کر آہستہ آہستہ سرد ہوتی جا رہی تھی۔ ہم لوگ ابھی تک گیٹ کے پاس ہی کھڑے تھے۔ دوسرے ہی لمحے فائر بریگیڈ کی ایک ساتھ تین گاڑیاں پہنچ گئیں۔ الطاف نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور گاڑیاں اندر داخل ہو گئیں اور سیدھا اس حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ جسے آگ نے بری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے کر اس عمارت کا ستیاناس کر دیا تھا۔

ساڑھے چار بجے تک فائر بریگیڈ والے آگ بجھاتے رہے تھے۔ آگ پر جلد ہی ان لوگوں نے قابو پا لیا تھا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ لوگ چلتے بنے۔ ہم سب بھی عمارت کے پاس ہی کھڑے تھے۔ شانزیب صاحب کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"آخر یہ آگ لگی کیسے؟" شانزیب صاحب نے سوالیہ آنکھوں سے مجھے اور الطاف کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

ہم دونوں نے نفی میں سر ہلا کر لاتعلقی کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے پرتشویش نگاہوں سے ایک بار پھر ہمیں گھورا۔

"مگر تم لوگ تو پہلے سے اکٹھے کھڑے دیکھ رہے تھے۔" شانزیب صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ان کے سوال پر ہم دونوں کو تھوڑی ہچکچاہٹ ہوئی لیکن میں نے جلد ہی خود کو سنبھالا کیونکہ میں جانتا تھا کہ شانزیب صاحب کو بھنک بھی پڑ گئی تو آسمان سر پر اٹھالیں گے۔

"نجانے رات کے کس پہر یہ آگ لگی۔" میں نے شانزیب صاحب کو بتانا شروع کیا۔

"اچانک ہی کہیں الطاف کی آنکھ کھل گئی تو اس نے اس آگ کو دیکھا اور فوراً مجھے بلالایا لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر ہماری تو حیرت ہوا رہ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود پڑ گئی تھیں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کریں۔ وہ تو اتفاق سے آپ لوگ آئے اور فائر بریگیڈ کا حکم دیا ورنہ ہمارا تو اس طرف خیال بھی نہیں جارہا تھا کیونکہ یکبارگی اس لگنے والی آگ کی وجہ سے ہم دونوں ہکا بکا رہ گئے تھے۔"

"ہوں۔" شانزیب صاحب نے میری بات سن کر ہونٹ بھینچے۔

شاید تیر نشانے پر جا لگا تھا کہ کیونکہ انہوں نے میری بات پر یقین کرلیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بنا ایک بہت بڑا نہ صرف قدم اٹھایا تھا بلکہ شانزیب صاحب کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ اگر کل کو انہیں حقیقت سے آشنائی ہو جاتی ہے تو ان کی نظروں میں میرا مقام گر سکتا ہے۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا۔ ان کے فائدے کے لیے کیا تھا۔ اپنی محبت کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ جب تک یہ منحوس مخلوق یہاں آباد ہے۔ یہ میرا اور ان کی فیملی کا جینا دوبھر کرتی رہتیں۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ انہیں یہاں سے بھگایا جائے۔

ایک ایک کر کے سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ انوسہ کو تو پہلے ہی شانزیب صاحب نے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فی الوقت شانزیب کوئی فیصلہ نہیں کر پارہے۔ صبح اٹھ کر ہی اس کے بارے میں وہ ٹھیک سے کوئی فیصلہ کریں گے۔ ایک عجیب سی بے چینی میری رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ شانزیب صاحب کی پیشانی پر عیاں ہونے والی سلوٹیں مجھے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر رہی تھیں۔ میں فی الوقت کوئی فیصلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ میں نے الطاف کو آرام کرنے کا کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"عفان ایسے حالات میں نیند بھلا کیسے آسکتی ہے؟" الطاف نے سوالیہ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس کی بات میں حقیقت پنہاں تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آسکتی تھی۔ شانزیب صاحب بے شک اپنے کمرے میں چلے گئے تھے لیکن نیندان کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور ہوگی۔ ممکن ہے ان کا ذہن یہ سب کچھ دیکھ کر فوراً میری طرف پلٹ آیا ہو۔ قبل از وقت کوئی کوئی فیصلہ کرنا بہتر نہیں تھا۔ کاشف واحد آدمی تھا جس پر میں اعتماد کرتا تھا۔ اگر یہ کہوں کہ میری زندگی میں وہی ایک ہم راز تھا تو بجا ہوگا۔

"تم چنتا مت کرو الطاف۔" میں نے الطاف کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرنا بہت لازمی تھا۔ اس مخلوق کو اس گھر سے نکالنا لازمی تھا۔ وگرنہ عنقریب کوئی بہت بڑی مصیبت وہ پیدا کر سکتے تھے۔"

"ایک بات پوچھوں عفان؟" الطاف نے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے اس کارنامے کی وجہ سے وہ مخلوق یہاں سے نکل گئی ہوگی؟" الطاف نے پوچھا۔

الطاف کا سوال معنی خیز تھا۔ میں اسے اس بات کا کیا جواب دیتا کہ میں نے اس مخلوق کو خود اپنی آنکھوں سے سرپٹ بھاگتے دیکھا ہے۔ لیکن یہ بات الطاف پر فی الوقت عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صبح اس سے اس ٹاپک پر لب کشائی کروں گا۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" میں نے پر اعتماد

لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا تم اس بات کو پس پشت ڈالو اور آرام کرو۔ انشاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔"

الطاف نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا بس ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں جانتا تھا کہ الطاف ابھی تک اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سوالیہ نگاہیں میری کمر میں پیوست ہو رہی ہوں۔ ان نگاہوں میں کتنے ہی سوال تھے۔ میرے لیے قدم آگے بڑھانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھو لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں اپنے کمرے میں پہنچا اور اندر داخل ہوتے ساتھ ہی کمرے کو اندر سے چٹخنی لگا گئی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے یہ چند قدموں کا فاصلہ نہیں بلکہ میلوں کا فاصلہ طے کیا ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ میری سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ میں بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ جب سانسوں کی روانی میں کچھ بہتری محسوس ہوئی تو ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پر رکھا جگ گلاس اٹھایا اور ایک ساتھ ہی دو گلاس پانی کے غٹا غٹ پی گیا۔

رات جیسے تیسے کر کے گزر گئی۔ پہلی بار میں نے تہجد کی نماز پڑھی۔ پھر کتنی ہی دیر تک بیٹھا رہا۔ نماز فجر بھی میں نے کمرے میں ادا کی۔ الطاف کی بات ٹھیک ہی تھی کہ ایسے حالات میں بھلا نیند کیسے آسکتی تھی۔ کروٹیں بدلنے سے بہتر تھا کہ اس خالق کے حضور سجدہ ریز ہو کر آنے والے حالات کی بہتری کی دعا کی جائے۔

نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل گیا تو یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ الطاف اپنے کمرے کے باہر کرسی پر بیٹھا تھا۔ جس وقت میں اس کے پاس پہنچا وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں لیکن وہ میری طرف متوجہ نہ ہوا تو میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ ایک دم چونک کر کھڑا ہو گیا اور سر کو جھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے عفان؟" الطاف نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم اور اتنی صبح؟"

"اتنی صبح سے کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کے بندے میں تو نماز پڑھ کر تمہاری طرف آیا ہوں کہ چلو تمہارے پاس کچھ دیر بیٹھتا ہوں۔"

"اچھا۔" الطاف نے مختصر سا جواب دیا تو مجھے کافی حیرت ہوئی۔

"کیا بات ہے الطاف؟" میں نے الطاف کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت تو ہے ناں۔ تم اتنے پریشان اور کھوئے کھوئے سے کیوں دکھائی دے رہے ہو؟"

"کچھ نہیں عفان۔" الطاف نے بمشکل تمام زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن وہ مسکراہٹ کیا تھی گویا ہونٹوں نے کرب میں کروٹ بدلی ہو۔

"تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے؟" میں نے متواتر اسی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں عفان ایسی بات نہیں ہے۔" الطاف نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں دراصل سوچ رہا تھا کہ آپ نے جو یہ کام کیا ہے۔ چلو شانزیب صاحب تو خود بھی ان عفریتوں سے بہت حد تک پریشان تھے۔ لیکن آنے والے حالات کشیدگی ہی نہ اختیار کرلیں۔"

میں الطاف کی بات کا مطلب بالکل نہیں سمجھ پایا تھا۔ میں نے بھنویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو الطاف میں سمجھا نہیں۔"

میں نے پوچھا تو الطاف کمرے سے جا کر ایک اور پلاسٹک کی کرسی اٹھا لایا۔

"بیٹھیے بتاتا ہوں۔" الطاف نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں بیٹھ گیا۔ الطاف بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ عفریتیں پہلے ہی آپ پر کتنے وار کر چکی ہیں۔ اب جو کچھ آپ نے کیا ہے

اس کے بعد ان کی طرف سے کسی بھلائی کی توقع رکھنا تو بالکل ہی خام خیالی گردانی جائے گی۔"

الطاف دور اندیش انسان تھا۔ اس کی بات میں سچائی بھی تھی اور حقیقت بھی تھی۔ لیکن میں نے یہ قدم اٹھانے سے پہلے ان تمام واقعات پر گہری سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ پھر جا کر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

"مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے الطاف۔" میں نے جواب دیا تو الطاف نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ان عفریتوں نے پہلے کونسی کوئی کمی چھوڑی ہوئی ہے۔ جو اب یہ کچھ کریں گے تو حیرت ہوگی....."

"میں آپ کی بات ٹوک رہا ہوں معذرت۔" الطاف نے میری بات ٹوکتے ہوئے کہا۔

"لیکن جو کچھ بھی ہے پہلے اگر انہوں نے کچھ کیا بھی ہے تو آپ کو محض تنگ کرنے کے لیے۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ آپ اس گھر سے چلے جائیں لیکن اب آپ نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف وہ آپ کی بلکہ اس گھر کے مکینوں کی جان کے بھی دشمن بن جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ عمارت کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ اس کی دیواروں میں اب وہ مضبوطی نہیں رہی۔ لازمی بات ہے کہ شانزیب صاحب اب مزدور لگوا کر یا تو اس عمارت کی مرمت کروائیں گے یا پھر اسے گروا دیں گے کیونکہ یہ ڈھانچہ ان کی عمارت کی خوبصورتی کو گرہن لگائے گا۔ زیادہ امید نہیں ہے کہ وہ اس جگہ کوئی نئی عمارت تعمیر کروائیں لیکن اگر وہ کرواتے بھی ہیں تو یہ مخلوق پھر اس جگہ پر قابض ہو سکتی ہے۔

رات کے وقت میں نے پھاٹک والی سائیڈ پر ایک عجیب سی روشنی دیکھی۔ یہی نہیں کتنی ہی بار میں نے پھاٹک کا دروازہ کھلتے اور بند ہوتے دیکھا۔ لیکن دروازہ کھولنے یا بند کرنے والا کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔"

الطاف کی بات نے مجھے حیران نہیں کیا تھا کیونکہ میں نے تو اپنی آنکھوں سے اس مخلوق کی بھاگ دوڑ دیکھی تھی۔

"یقیناً وہ وہی مخلوق ہوگی جو اس حویلی سے نکل کر اس طرف گئی ہوگی۔" میں نے الطاف کی رائے لینے کے لیے کہا۔

"آپ کو یاد ہے نہ کہ مولوی ندیم صاحب نے آپ سے کہا تھا کہ یہ حویلی برسوں پرانی ہے۔" الطاف نے مجھے یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

"ظاہری طور پر کوئی دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کے اندر ایک بستی آباد ہے۔ عفان مجھے تو آپ کی طرف سے زیادہ چنتا کھائے جا رہی ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے نجانے اس کے بدلے میں وہ مخلوق کیا ردعمل کرتی ہے۔"

الطاف کی بات سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ وہ میرا اپنا نہیں تھا لیکن اسے میرا کافی احساس تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے درمیان مزید کوئی بات چیت ہوتی ملازمہ نے آ کر مجھے بتایا کہ شانزیب صاحب اور انوسہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں الطاف سے اجازت لے کر ڈائننگ روم کی طرف چل پڑا۔

شانزیب صاحب اور انوسہ ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بھی اس واقعے کے بعد سو نہیں پائے تھے۔ شانزیب صاحب نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ان کے دیکھنے کے انداز نے میرے اندر کھلبلی سی مچا کر رکھ دی۔

"برخوردار تم نے جو کچھ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری بچی کی حفاظت کے لیے کیا ہے۔" آناً فاناً سکوت زدہ ماحول میں شانزیب صاحب کی بازگشت گونجی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

میرے اندر اتنی جسارت نہ ہو پا رہی تھی کہ میں شانزیب صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی بات کا کوئی جواب دے سکوں۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارے لیے اتنا احساس رکھتے ہو۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا ہے تم بھی جانتے ہو کہ اس کے اثرات برے بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ اب تمہیں پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس

حویلی پر آسیب کا سایہ تھا۔ میرے خیال میں تمہیں مجھ سے زیادہ ہی اس کے بارے میں آگاہی ہو چکی ہوگی۔ ہم لوگ ان کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ جو کچھ تم نے کیا میں نے بھی کبھی یہی کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

بہرحال مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں اس گھر میں لا کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ایک بھلے وقت میں ایک بھلا فیصلہ کیا تھا۔ پہلے جہاں عدم موجودگی میں مجھے ہر وقت اپنی بچی کی چنتا کھائے رہتی تھی۔ اب میں جان چکا ہوں کہ تم میری عدم موجودگی میں میری بچی کی حفاظت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔"

شانزیب صاحب اتنا کہہ کر چپ ہو گئے لیکن ابھی تک میرے اندر اتنی سکت پیدا نہیں ہو پا رہی تھی کہ میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی کسی بات کا کوئی جواب دے سکوں۔

"شاہان میں بھی تمہاری مشکور ہوں۔" اب کی بار میری سماعت سے انوسہ کی مترنم بازگشت ٹکرائی تو پہلی بار میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کے لال گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ محبت مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے پہلی بار شانزیب صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خوشی سے مخمور دکھائی دے رہے تھے۔

"تم واقعی ایک بہادر انسان ہو۔ اللہ تمہاری بہر صورت حفاظت فرمائے۔"

شانزیب صاحب میری تعریف کر رہے تھے۔ لیکن میں حیران تھا کہ انہیں میرے اس فعل سے کیسے آشنائی ہو گئی تھی۔ الطاف تو کسی صورت بھی انہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے انہوں نے میری حرکات و سکنات پر نگاہ رکھی ہو۔ جس کی وجہ سے انہیں اس بارے میں پہلے ہی پتہ لگ گیا کہ جو کچھ بھی کیا ہے میں نے کیا ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کرنے کو تو بہت سارا کام پڑا تھا لیکن دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ آج کام کرنے کو من نہیں چاہ رہا تھا۔ شانزیب صاحب تھوڑی دیر بعد چلے گئے تھے۔ میری روٹین تھی کہ میں ناشتے کے بعد چائے الطاف کے ساتھ بیٹھ کے پیتا تھا لیکن آج میرا ارادہ تھا کہ چائے انوسہ کے ساتھ پیوں۔ تاکہ اسے کچھ وقت بھی دے سکوں اور اسے کریدنے کی سعی کروں کہ شانزیب صاحب کو اس بارے میں کیسے آگاہی ہوئی؟

☆.....☆.....☆

دن خلاف معمول گزر گیا۔ کوئی خاص نہ تو واقعہ رونما ہوا نہ ہی کوئی خاص بات۔ انوسہ کے ساتھ کچھ شاپنگ کرنے کے لیے میں خود ہی مارکیٹ گیا تھا۔ رات نہ سو سکنے کی وجہ سے میں تقریباً تین بجے دوپہر سو گیا۔ پھر رات کے کھانے کے وقت انوسہ نے ہی آ کر مجھے اٹھایا۔ مجھے کافی حیرت ہوئی کہ انوسہ میرے کمرے میں آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان لوگوں کو اب مجھ پر حد سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا کہ میں ان کے بارے میں غلط خیالات نہیں رکھتا۔

انوسہ تو ویسے ہی میری محبت میں قائل تھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی میرے روم میں نہیں آئی تھی۔ آج وہ میرے روم میں مجھے اٹھانے آئی تو میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دسترخوان پر ایک ساتھ کئی ڈشز لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس بات کی بجائے مجھے اس بات نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کیا کہ شانزیب صاحب اور انوسہ کے علاوہ کچھ نئے چہرے بھی دسترخوان پر موجود تھے۔

میں ان مہمانوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ انوسہ کا چہرہ بھی آج کافی چمک دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی عیاں تھی۔ وہ مجھے کن انکھیوں سے گھور رہی تھی لیکن میں تو بس اس بات پر حیران و ششدر تھا کہ بنا بتائے آج اتنے مہمان یکبارگی کہاں سے آن وارد ہوئے۔

ابھی مجھے بیٹھے کچھ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ یکدم ایک ناگوار سی بدبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ لیکن

میں یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ سب ہی میری جیسی کیفیت سے دوچار تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ ناگوار بو کہاں سے یکدم آنی شروع ہوگئی ہے۔ ایک مہمان عورت جس نے سالن کا ایک برتن اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ فوراً ہی اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟'' شانزیب صاحب نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لیجئے نہ آپ نے ہاتھ پیچھے کیوں کھینچ لیا؟''

''ان کھانوں سے بدبو کے بھبھوکے اڑ رہے ہیں شانزیب صاحب۔'' اس عورت نے ناگواری سے جواب دیا۔

''نہیں کھانے سے بدبو نہیں آرہی بلکہ ڈائننگ روم کے اندر کہیں سے بدبو آرہی ہے میری بہن۔'' اس عورت کے قریب بیٹھی اور عورت گویا ہوئی۔

''عفان انوسہ بیٹا دیکھا کھانا تو ٹھیک ہے ناں؟'' شانزیب صاحب نے مارے حیرت اور شرمندگی کے ہم دونوں کو مخاطب کرکے کہا۔

ہم دونوں نے اٹھ کر ایک ایک برتن اور کھانا چیک کیا لیکن کھانا بالکل ٹھیک ہی تھا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بدبو کہاں سے آرہی تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ ڈائننگ روم کے اندر سے یکدم بدبو کے بھبھوکے سے اٹھنے شروع ہوگئے تھے۔ کھانا تو بالکل ٹھیک تھا۔ پھر نجانے یہ بدبو کس کونے سے اٹھ رہی تھی۔

''اختر تمہیں یہاں کوئی بدبو محسوس ہو رہی ہے ڈائننگ روم میں؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شانزیب صاحب نے ملازم کو مخاطب کیا تو ہم سب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''جی صاحب جی محسوس ہو رہی ہے۔'' اختر نے نتھنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''کیا کمرے کی صفائی ٹھیک سے نہیں کی گئی تھی۔'' شانزیب صاحب تھوک نگلتے ہوئے بولے۔

''دیکھو کہیں کوئی چوہا وغیرہ مرا پڑا ہے یا کیا ہے جس نے کھانے کا مزہ کرکرا کرکے رکھ دیا ہے؟''

''پورا کمرہ صاف ہے صاحب جی۔'' اختر نے بتایا۔

''میں نے خود ہی صفائی کی تھی۔ ایسی کوئی بھی چیز اس کمرے میں نہیں ہے۔''

چاروناچار سب نے کچھ نہ کچھ کھانا زہر مار کرنا شروع کردیا۔ کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی وجہ سے کوئی ایکشن لیا جاتا۔ کھانا شروع کرتے ہوئے میری نظر انوسہ کی طرف اٹھی تو میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گیا۔ انوسہ کی پرورش ایک مہذبانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ اسے ہر طرح سے اطوار وآداب سے مرصع کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ایک ایسی حرکت کررہی تھی۔ جس پر مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

انوسہ نے ایک بڑی پلیٹ اٹھائی اور اس میں اتنی بریانی بھری کہ بس باہر گرنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ میں انگشت بدنداں تھا کہ اس نے اتنی بریانی کیوں بھری۔ حالانکہ اس کی خوراک سے میں اچھی طرح سے واقف تھا۔ بریانی وہ بہت شوق سے کھاتی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کھاتی تھی۔ جتنی کہ اس وقت اس نے بھر لی تھی۔ وہ بمشکل تمام کوئی آدھی پلیٹ ہی کھاتی ہوگی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے انوسہ بریانی کی بھری پلیٹ یوں چٹ کرگئی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار کو چٹ کرجاتا ہے۔ میری حیرت ہویدا رہ گئی تھی۔ مجھے اپنی بینائی پر وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ آدھی روٹی کھانے والی لڑکی بریانی کی فل بھری پلیٹ چٹ کرگئی تھی۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ انوسہ نے ہاتھ بڑھا کر بڑے سائز کے کوفتے پلیٹ میں نکالے اور ایک ہاتھ میں روٹی اٹھالی۔ بس پھر کیا تھا۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ غائب۔ یہ منظر دیکھ کر میری تو بھوک نو دو گیارہ ہوچکی تھی۔ انوسہ کم وبیش چھ افراد کا کھانا کھا چکی تھی۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے لیکن انوسہ سب سے بے نیاز یوں کھانے میں مصروف تھی جیسے صدیوں کی بھوکی تھی۔ میں نے ایک نگاہ سب پر ڈالی سب کی نگاہیں انوسہ پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

(جاری ہے)

وعدہ خلافی

محمد رضوان قیوم۔راولپنڈی

اچانک خوبرو دوشیزہ کی دلخراش اور فلک شگاف چیخ سنائی دی، اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور پھر دوشیزہ پر سوار جن کی آواز سنائی دی، تم لوگوں نے وعدہ خلافی کی لہٰذا......

خوف کے گرداب میں غوطہ زن...... ماورائی مخلوق کی دل گرفتہ......اور دل شکستہ کہانی

یہ کہانی جس بزرگ نے مجھے سنائی تھی۔ وہ آج اس دنیا میں نہیں ہے، دراصل اس کہانی کے راوی میرے ایک قریبی دوست کے نانا تھے۔ ان کا نام وزیر محمد تھا۔ لیکن ان کا نام بگڑ کر وزیرا پڑ چکا تھا۔ لوگ تو انہیں یہی کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن میں اپنے دوست کے رشتہ کی وجہ سے انہیں نانا کہا کرتا تھا۔ موصوف اخلاق کے بہت اچھے تھے اور بچوں سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ میری جب ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو وہ اس وقت لگ بھگ 80 کے لپیٹے میں تھے۔ میں اکثر جب اپنے دوست فہیم کے گھر جاتا تھا۔ تو ان سے لازمی ملا کرتا تھا۔

درحقیقت میں ان سے ان کے بیتے دنوں کے تجربات کی کہانیاں سن کر اخبارات ورسائل میں لکھا کرتا تھا۔

ایک دن انہوں نے مجھے کہا۔

"بیٹا رضوان! میں تمہیں ایک ایسی مافوق الفطرت کہانی سناتا ہوں۔ جس کے ڈراؤنے کردار 1942ء یعنی تقسیم ہند سے پہلے کے ہیں۔"

جو کہانی ان بزرگ نے مجھے سنائی تو میں وہ سچی کہانی من وعن قارئین آپ کی دلچسپی کے لیے رقم طراز کرتا ہوں۔ بقول ان بزرگ کہ۔

"1940ء میں پونہ بھارت کا مشہور تاریخی شہر ہے وہاں سے راولپنڈی بوجہ روزگار اپنے ماموں کلیم اللہ کے پاس آیا۔ ماموں نے میری والدہ کو پونہ چٹھی بھیجی تھی کہ وزیر احمد کو میرے پاس پنڈی بھیج دو۔ کیونکہ یہ پڑھائی سے بے زار ہے۔ سارا دن آوارہ دوسروں کے ساتھ ادھر ادھر مٹرگشت کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا میں اسے اپنے شہر میں کوئی نہ کوئی دھندے میں لگادوں گا۔

لہٰذا میں ان کے پرزور اصرار پر راولپنڈی شہر جولائی 1940ء میں آ گیا۔ میرے ماموں کی رہائش ان دنوں باغ سرداروں کے اس محلہ میں تھی۔

جہاں سکھوں کی زیادہ تر آبادی تھی۔ میرے ماموں یہاں ایک بہت مالدار سکھ گلاب سنگھ کے پاس اس کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے منشی گیری کا کام کرتے تھے۔

گلاب سنگھ کی بہت وسیع جائیداد کا سلسلہ تھا۔ اس زمانہ میں ماموں کی تنخواہ 1000 روپے تھی۔ جو اس وقت کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ گلاب سنگھ نے ماموں کی فیملی کے رہنے کے لیے رہائش اپنی حویلی کے ملحقہ بغلی کوارٹر میں دے رکھی تھی ماموں اگرچہ شادی شدہ تھے۔ لیکن اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ لہٰذا مجھے بلانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح رکھنا چاہتے تھے۔

میری ممانی سکینہ بی بی انتہائی پارسا اور رحم دل خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت لاڈ دیا۔ ان کا مالک گلاب سنگھ جس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام لکشمی جو بڑی تھی اور چھوٹی کا نام سونم تھا۔ اس کی بڑی بہن یعنی لکشمی لاہور کے کسی رئیس سکھ خاندان میں بیاہی ہوئی تھی۔ جبکہ سونم جس کی عمر جب میں نے اسے دیکھا تھا اس وقت 16 سے 17 سال تھی۔ جو انتہائی خوبصورت نیلی آنکھیں اور بڑے دلکش جسمانی خدوخال کی دوشیزہ تھی۔ ایک تو باپ کی انتہائی دولت دوسرے خوبصورتی نے اس کی شخصیت کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔

اس زمانہ میں سونے پر سہاگہ کہ سونم بہت چست کپڑے پہنا کرتی تھی۔ جس سے اس کے جسمانی اعضاء واضح ہو جاتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ علاقے کے منچلے لڑکے اس پر مرتے ہیں۔ لہٰذا وہ انہیں تڑپانے اور جلانے کے لیے بہت بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔

گلاب سنگھ کا اپنا رعب و دبدبہ تھا۔ اس لیے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اسے چھیڑنے یا اظہار محبت کر سکے وہ جہاں سے گزرتی تو قیامت ڈھاتی تھی۔ میری طرح اور کئی نوجوان اسے دیکھ کر دل کو موس کر رہ جاتے تھے گلاب سنگھ کی کیونکہ وہ بہت لاڈلی تھی لہٰذا اسے وہ پھولوں کی سیج میں رکھتا، اس کے کھانے پینے رہن سہن اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس کے باپ نے نوکروں کی پوری فوج تیار کر رکھی تھی۔ جن میں زیادہ تر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جن میں، میں اور میرے ماموں بھی شامل تھے۔

مجھے ماموں نے گلاب سنگھ کی حویلی میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے 50 روپے ماہوار پر نوکر کروادیا۔

سونم کبھی کبھار میرے ساتھ اپنی مخصوص بگھی میں بیٹھ کر موتی بازار درزی کے پاس میرے ساتھ جاتی۔ میں اور ایک نوکر بگھی کی چوکیداری کے لیے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگا کرتے تھے۔ وہ اکثر سچی بات ہے مجھے اتنی خوبصورت اور دلکش لگتی تھی کہ دل کرتا تھا کہ اسے کھینچ کر سینے سے لگالوں۔ اس کے چہرے پر ہر وقت دلکشی مچلتی رہتی تھی۔ لیکن بحیثیت نوکر اور ماموں کی عزت کی خاطر میں اپنی ہی آگ میں جلا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کے لیے بڑے مالدار سکھ فیملی کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے رشتے آ رہے تھے۔ لیکن گلاب سنگھ کہتا تھا کہ "میری بیٹی سونا ہے اسے ہیرے کے ساتھ ہی بیاہوں گا۔"

ادھر سونم بھی اپنے حسن پر اتنی نازاں تھی کہ اپنی مثال خود آپ دیا کرتی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت میں حکیم بہاری لال کے پاس گلاب سنگھ کے لیے دوائی لینے جا رہا تھا۔ کہ حویلی کا پرانا بوڑھا نوکر بھاگا ہوا آیا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں پریشانی کے عالم میں لڑکھڑا رہی تھیں۔ میں نے بھی تفکرانہ انداز میں پوچھا۔

"اوئے کیا ہوا ہے؟"

"وہ جی..... سونم بی بی نہا کر چھت پر گئیں اپنے بال سکھانے کے لئے اور جیسے ہی اپنی گت کھولی تو نہ جانے انہوں نے بھیانک چیخ ماری کہ وہ اس وقت سے لے کر اب تک بے ہوش ہیں۔"

میں اور وہ جب دوڑتے ہوئے حویلی کی چھت پر گئے تو وہاں واقعی سونم بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے گرد کئی حکیم اور ڈاکٹر کھڑے تھے۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے اسپتال فٹافٹ اٹھا کر لے جایا گیا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا۔ دھان پان سی لڑکی اس وقت بہت زیادہ وزنی لگ رہی تھی کوئی نرم و نازک حسینہ وزنی پتھر لگ رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے گلاب سنگھ کو تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں ٹھیک ہو جائے گی۔

اس کے تمام سکھ رشتہ داروں اور دیگر لوگ اس کے ہوش میں آنے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ گلاب سنگھ اور اس کی بیوی پرا تھنا کرنے لگی۔ تقریباً دوپہر کے وقت اسے ہوش آیا۔ اس نے اپنی بے ہوش اور برے ڈراؤنے انداز میں مردانہ آواز نکال کر کہا۔

"سب کو السلام علیکم۔" جو مسلمان وہاں کھڑے تھے جن میں میرے ماموں اور میں بھی مسلمان تھے۔ سب نے چونک کر وعلیکم السلام کہا۔

سکھوں کے منہ سے بھی بے اختیار وعلیکم السلام نکلا۔

سونم نے پاگل پنے میں اپنے بیڈ کی چادر کھینچ کر اسے اپنے سر پر ڈال کر حیرت انگیز انداز میں قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر تمام سکھڑے دہل گئے اور پریشانی کا شکار ہو گئے۔ یہ کیا ماجرا ہے.....؟

گلاب سنگھ نے لڑکی کے ہوش میں آجانے کی خوشی کے بجائے الٹا اسے برہمی کے عالم میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہے.....؟ تو سردارن ہے مسلی (مسلمان) نہیں۔"

سونم نے ایک زوردار تھپڑ گلاب سنگھ کے منہ پر رسید کرتے ہوئے زور زور سے قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دی۔

"اور ..... جی ..... یہ تو ..... مسلمان ہو گئی ہے۔" میرے قریب کھڑے ایک مسلمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کر۔" گلاب سنگھ نے اپنے گالوں پر کھایا ہوا تھپڑ اس شخص کے منہ پر منتقل کر دیا۔ پھر سونم دیوانوں کی طرح عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی اس نے اسپتال کے بیڈ کی چادر اٹھائی اور اسے جائے نماز بنا کر اسے فرش پر بچھایا اور نماز پڑھنے لگی۔ اس کی دلکش اور خوشنما آواز غائب تھی اور اب وہ مکمل مرد کے لہجے میں بول رہی تھی۔

"بیٹی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے.....؟" اس کی ماں نے ملائم انداز میں اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"تم سب کافر ہو۔ جہنم کی آگ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" اس کی دل دہلا دینے والی کان پھاڑنے والی آوازیں اسپتال کی در و دیواروں میں گونجنے لگیں۔ "لگتا ہے اس پر کوئی جناتی اثر ہو گیا ہے۔" ایک بزرگ سکھ نے کہا۔

گلاب سنگھ خاموش سہما ہوا بیٹی کے مچلتی صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔

"اب کیا کیا جائے.....؟" اس نے اپنے ہم عمروں سے مشورہ کیا۔

لہٰذا مشورہ یہ طے پایا کہ سونم کو کسی ماہر عملیات اور جن اتارنے والے کو دکھایا جائے۔ اسے جب کئی سکھ ہندوؤں جناتی، عملیات اور جادو کے کاٹ کے ماہرین نے دیکھا تو۔ ان میں سے تقریباً سب نے متفقہ طور پر یہ تشخیص کیا کہ ''سونم کے اندر کوئی مسلمان جن داخل ہوگیا ہے۔''

گلاب سنگھ کی حالت بیٹی کی وجہ سے ناقابل دید ہورہی تھی۔ وہ اس طرح لگ رہا تھا جیسے کوئی مچھلی پانی سے باہر تڑپ رہی ہو۔

ان دنوں ایک ہندو عامل پورم راولپنڈی، گجر خان اور مری کے ارد گرد بڑا طوطی بولتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے قبضہ میں ایسے موکل موجود ہیں جو کہ بڑے سے بڑے جن کو پلک جھپکتے نکال کا باہر کردیتے ہیں۔

پورم نے سونم کے کولہوں پر زوردار ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔ ''جاتا ہے کہ نہیں۔'' تو جن بولا۔

''نہیں جاؤں گا۔'' جن بہت ضدی انداز میں مردانہ آواز نکال رہا تھا۔

''تو کون ہے؟''

''میں مسلمان ہوں۔''

''زندگی چاہتا ہے تو چلا جا۔''

''نہیں جاؤنگا۔'' وہ بولا۔

پورم نے اپنا پورا زور لگایا۔ بالآخر ایک شرط پر سونم کے اندر سے جن نکلنے کو راضی ہوا۔ وہ شرط یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ ''اگر سونم مسلمان ہوجانے کا وعدہ کرلے تو وہ نکل جائے گا۔ ورنہ نہیں۔''

''ہاں..... ہاں وعدہ۔'' سونم مسلمان ہوجائے گی۔'' پورم نے کہا۔

''ابے یہ کیا بکواس کررہا ہے ہمارے کٹر سکھ خاندان کی لڑکی کو تو مسلمان کررہا ہے میں تیری گردن اتاردوں گا۔'' گلاب سنگھ کا چچا چلایا۔

''وہ سردار جی میں وقتی طور پر اس اڑیل مسلمان جن کو چکمہ دے رہا ہوں۔ لونڈیا مسلمان ہوجائے گی۔ ایک دفعہ اسے نکل جانے دو پھر دیکھو کون مسلمان ہوتا ہے۔'' اس نے سردار کے کانوں میں ہلکی سی کانا پھوسی کی۔

''تو وعدہ کہ سونم مسلمان ہوجائے گی۔''

جن نکل گیا۔ پورم نے اپنے کارنامہ یعنی سونم کے جسم اور روح سے مسلمان جن نکالنے کا گلاب سنگھ سے منہ مانگا معاوضہ طلب کیا۔ چند دنوں کے بعد سونم نارمل ہوگئی۔ اس نے اپنے باپ، ماں اور اپنے دیگر سکھ رشتہ داروں سے اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگی۔ وہ پھر سے ماڈرن اور مغرور ہوگئی۔

گلاب سنگھ کو اس کے بڑوں نے مشورہ دیا کہ اس کی جلد از جلد کسی اچھے پڑھے لکھے نوجوان سے شادی کردی جائے۔ لہٰذا گلاب سنگھ نے ایک سرکاری افسر گوروسنگھ سے سونم کی شادی کردی۔ دونوں میں بہت ہی پیار تھا گوروسنگھ شریف النفس رحمدل انسان تھا۔ ان کے دو بچے ہوئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

ایک دن گلاب سنگھ میرے ماموں سے اپنی جائیداد کے کرایہ داروں اور دیگر معاملات کا حساب لے رہا تھا اور میں ان کی حویلی کے استعمال کا ضروری سودا سلف لے کر وہاں پہنچا ہی تھا کہ گوروسنگھ بذات خود غصے اور برہمگی کے عالم میں آیا۔ اس کے سر پر تازہ زخم ہونے کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔

گلاب سنگھ میرے ماموں اور وہاں موجود سب نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا۔ ''یہ کیا ہوا تمہیں۔؟''

اس نے تو پہلے خلاف توقع بڑی گالیاں دیں اور گلاب سنگھ کو مخاطب کرکے بولا۔

''چل دیکھ تیری بیٹی نے پورے گھر کا کیا حال کیا ہے؟ اس نے اپنی بیٹی کو شدید زخمی کردیا ہے۔''

''پر کیوں..... کیسے.....؟'' گلاب سنگھ نے اپنے اعصاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تو چل تو سہی۔'' اس نے پہلی دفعہ گستاخی اور بدتمیزی کی تھی۔ وہاں کھڑے ماموں اور باقی لوگ اسے مزا چکھانے کے لیے آگے بڑھے لیکن گلاب سنگھ نے سب کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''کیا ہوا.....؟ بتاتا کیوں نہیں۔ اب پہیلیاں بھجوائے گا تو۔''

''اسے پھر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے کوئی جن پھر گھس گیا ہے۔ اس کے اندر تم نے ہم سے دھوکہ کیا۔ پاگل، جنوں کے سائے والی لڑکی ہمیں پکڑادی۔'' وہ چلایا۔

گلاب سنگھ نے ماموں کو کہا۔ ''چل کلیم اللہ! بگھی پر گھوڑے کس۔'' اور پھر گلاب سنگھ اس کی بیوی میرے ماموں اور میرے سمیت 10 سے 15 افراد جب گوروسنگھ کے گھر پہنچے تو واقعی وہاں سونم مردانہ آواز میں قرآن مجید کی سورتیں پڑھ رہی تھی۔ اس نے پورے گھر کو تہس نہس کردیا تھا۔ تقریباً وہی حرکتیں کررہی تھی۔ جو اس نے پہلی کی تھیں۔

اپنے خاوند اور بیٹی کے جسم پر شدید زخم ڈال دیئے تھے۔ وہ اس وقت دیکھنے میں بالکل پاگل لگ رہی تھی۔ اور عجیب عجیب حرکتیں کررہی تھی۔ کبھی کلمہ پڑھتی، کبھی زمین پر چادر بچھا کر نماز پڑھتی تھی۔ اس میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ اسے آدمی سنبھالنے سے قاصر تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔ ''ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔'' وہ مردانہ آواز میں دھاڑنے لگی۔

سارے گھر والے رو رو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ گلاب سنگھ کہہ رہا تھا۔ ''بیٹی ہوش کر اور ہوش میں آ۔'' لیکن اس کا مچلنا چیخنا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ''اسی پورم کو پھر بلا۔'' گلاب سنگھ نے ماموں کی طرف چلاتے ہوئے کہا۔

پورم آیا تمام سکھوں نے اس پر چڑھائی کردی۔

''ابے وہ مسلمان جن پھر آ گیا ہے، اگر نہیں نکالا تو تیری خیر نہیں۔ اب نکال اسے۔''

پورم نے اپنا مخصوص بھجن پڑھتا رہا مگر سونم کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی پورم پورا گھنٹہ اپنا جاپ (ورد) کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔

گلاب سنگھ کے آدمیوں نے اسے دھکے مکے مار کر بھگا دیا۔ سونم کا دیوانہ پن ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تنگ آکر اسے رسیوں سے اس طرح قابو کیا جس طرح قصائی ذبح سے پہلے گائے کی ٹانگیں باندھتے ہیں چند لمحے بعد کچی رسی ٹوٹی۔ وہ فوراً بھاگ کر اپنی زخمی بیٹی کے اوپر چڑھ گئی۔ صرف چڑھی نہیں بلکہ اس کی مضبوطی کے ساتھ گردن دبائی کہ اس کی سانسیں برابر کردیں۔ بچی مرگئی تھی۔ گوروسنگھ اس کی ماں بیٹا یہاں تک کہ گلاب سنگھ سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اب سکھ خاندان ماتم کدہ اور پریشان گھر بن کر رہ گیا تھا۔

بہت تھک ہار کر بالآخر گلاب سنگھ نے ایک مسلمان عامل کو دہلی سے بلوایا۔ اس نے سونم پر سوار مسلمان جن سے کہا کہ ''بتلاؤ تم کیا چاہتے ہو.....؟ تم نے اس کے ذریعے اس کی بیٹی کو کیوں مار دیا..... خاوند کو شدید زخمی کیا۔''

جن بولا۔ ''یہ جھوٹے لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ مسلمان ہوجائے گی۔ لیکن اس نے اپنا مذہب نہیں بدلا۔ لہٰذا اسے کوئی نہ کوئی سزا تو دینی تھی۔''

''تم سونم کو چھوڑ دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ مسلمان ہوجائے گی۔''

''نہیں۔ نہیں اب میں کبھی بھی اس کے جسم سے جدا نہیں ہوں گا۔''

''کہانی لمبی ہے لیکن مختصر آخر میں یہ ہوا کہ سونم کے خاوند نے تنگ آکر اسے طلاق دے دی اور بچہ چھین لیا۔ گلاب سنگھ ہارٹ فیل ہوجانے کی وجہ سے مرا۔ جب کہ سونم حویلی کے باہر چوک میں بیٹھی ہر وقت کلمہ اور سورتیں پڑھتی رہتی تھی۔ مسلمان اسے پیرنی اور سائیں کہا کرتے تھے۔

ایک رات سونم کی گلہ کٹی لاش نالہ کے کنارے ملی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اسے ہندوؤں یا سکھوں نے اس لیے قتل کیا تھا۔ کہ وہ سکھنی سردارنی ہوکر مسلمانوں کا کلمہ اور عبادت کیوں کرتی ہے۔ قارئین وزیر محمد کی یہ دلچسپ کہانی بہت طویل تھی لیکن میں نے اسے سمیٹتے ہوئے مختصر کردیا ہے۔

خوفناک کتاب

شہزاد خان-صادق آباد

نوجوان کی گردن کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ سا بنا ہوا تھا جس میں سے مغز نکال لیا گیا تھا اور ایک گڑھا سا بن گیا تھا اور اس گڑھے میں ایک کاغذ کا گولا بنا کر بھر دیا گیا تھا

ڈر و خوف کی پگڈنڈی پر رواں دواں رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑاتی.....کہانی

اکرم نے دوکان کا شٹر بند کیا اور ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا جس میں اس کی ضرورت کی چیزیں اور رقم تھی، بغل میں دبایا اور دکان کے سامنے کھڑی اپنی سائیکل کا تالا کھولا اور گھر کی راہ لی۔ اکرم ایک چھوٹے سے قصبے دیبالپور میں رہتا تھا اس کے والدین عرصہ ہوا اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اکرم نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر کے ایک پبلشر کے پاس ملازمت کر لی اور آہستہ آہستہ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے اس نے اپنے مالک کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر لیا۔ مالک اس کی ایمانداری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اس طرح اکرم نے اپنی ایمانداری کی بدولت اپنا مستقبل محفوظ کر لیا۔

دوکان کے مالک نے اپنا تمام کام اس کے سپرد کیا اور خود یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ اب اکرم اس دوکان کا تنہا مالک تھا اس نے اپنی روز و شب کی محنت سے دوکان کو چار چاند لگا دیئے اور اس کا کاروبار دوسرے لوگوں کی نسبت کافی ترقی کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام شہر کے بڑے پبلشروں میں لیا جانے لگا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس نے شہر کی بجائے قصبے میں ہی رہائش رکھنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں اس کے جاننے والے زیادہ تھے اس کی نسبت شہر میں رہنے والے افراد ایک دوجے کو پہچانتے تک نہیں ہیں۔ اور اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہر میں ماحول کسی قدر گرد آلود اور آب و ہوا گندی تھی لیکن اس کی نسبت قصبہ کی آب و ہوا اور پانی صاف ستھرا اور صحت افزا تھا۔

اکرم کے تین بچے تھے۔ جن میں سب سے بڑا لڑکا دس سال کا اور اس سے بالترتیب دو لڑکیاں تھیں۔ قصبہ میں ایک پرائمری سکول تھا جس میں وہاں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اگر کوئی صاحب حیثیت ہوتا تو اپنے بچوں کو مزید تعلیم دلانے کی خاطر شہر کا رخ کرتا اور اگر کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا تو وہ اپنے بچوں کو پانچ جماعتیں پڑھا کر گھر میں بیٹھا لیتا۔ اکرم اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا ارادہ رکھتا تھا اس نے دل ہی دل میں عہد کیا ہوا تھا کہ اگر وہ آگے نہیں پڑھ سکا تو کیا لیکن وہ اپنی خواہش کو اپنے بیٹے کی شکل میں پورا کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے بیٹے کو مزید تعلیم دلانے کی خاطر شہر کے ایک سکول میں داخل کرا دیا ہے۔

اسکول میں ہاسٹل کی سہولت ہونے کی وجہ سے

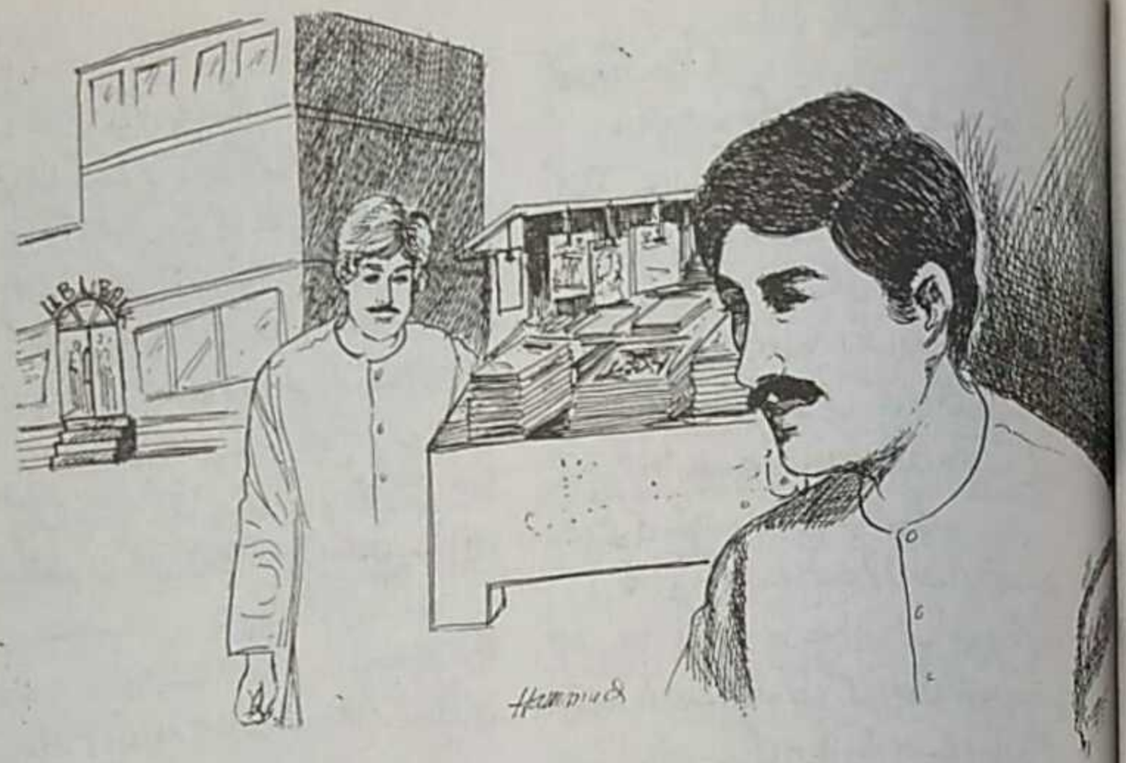

اس نے روزانہ آنے جانے کی دردسری سے بچانے کی خاطر اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔ اس کا لڑکا ہر جمعرات کی شام گھر آ جاتا اور ایک دن گھر میں رہ کر واپس دوسری صبح شہر روانہ ہو جاتا۔ آج بھی جمعرات تھی اور اس کا بیٹا گھر آ گیا ہوگا وہ یہی سوچتا ہوا جلدی جلدی سائیکل کے پیڈل چلاتا قصبہ کی طرف جانے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ سورج دور افق میں ڈوب رہا تھا اور آسمان پر زردی چھائی ہوئی تھی شام کا جھٹپٹا ہر سو چھا رہا تھا۔ قصبے کی کچی سڑک کے دونوں جانب گندم کے سنہری خوشے ہلکی ہلکی ہوا سے لہرا رہے تھے اور ان کے ٹکرانے سے سرگوشیاں سی پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ قصبہ کا فاصلہ شہر سے تقریباً دس فرلانگ رہا ہوگا عام حالت میں یہ فاصلہ وہ آدھے گھنٹہ میں طے کر لیتا تھا مگر آج اسے یہی راستہ طویل ہوتا محسوس ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

ابھی اس نے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ راستے میں ایک کتاب پڑی دکھائی دی۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتے کتاب کی طرف بڑھ گیا اور جیسے ہی اس نے جھک کر کتاب اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی چیخ نکل گئی۔

کتاب پر ایک ڈھانچے کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس پر نامعلوم زبان میں ایک موٹی سرخی لکھی تھی، تصویر میں ایک ڈھانچے نے اپنا سوکھا سڑا ہاتھ اوپر اٹھایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کے ساتھ ایک کوبرا سانپ بل کھاتا ہوا لپٹا دیکھا یا گیا تھا۔

وہ تو یہ سوچ کر کتاب اٹھانے کے لیے رکا تھا کہ اسکول جاتے ہوئے کسی بچے کی گر گئی ہوگی مگر اب اسے یہ اور ہی معاملہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے کتاب کو یوں ہی پڑا رہنے دینے کا سوچا پھر کچھ سوچ کر اسے اٹھایا اور سائیکل کے کیریئر کے پیچھے رکھ کر گھر کی راہ لی۔ گھر میں اس کی توقع کے مطابق اس کا لڑکا آیا ہوا تھا سب اس کے گرد اکٹھے ہوئے اس سے شہر کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ مزے لے لے کر انہیں اپنے متعلق بتا رہا تھا باپ کو دیکھ کر بیٹے نے سلام کیا۔ اکرم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دی اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے اس نے پیچھے رکھی کتاب اٹھالی۔

گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے اس کتاب کے بارے میں انہیں بتایا۔ یہ سن کر سب خوفزدہ نظروں

سے اس کتاب کو دیکھنے لگے۔ اس کی بیوی تو اس بات پر اصرار کرنے لگی کہ اس منحوس کتاب کو فوراً کہیں دور پھینک آؤ مگر اس کے سمجھانے پر انہوں نے کتاب کو کھول کر دیکھا۔ کتاب کے اوراق بوسیدہ تھے زمانہ کی گردش کے باعث اس کا رنگ گہرا زرد ہو گیا تھا۔ اس پر سیاہ چرمی کور چڑھا ہوا تھا اور سفید رنگ سے اس پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ اس کے اندر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں اور نامعلوم زبان میں اس پر کچھ تحریریں درج تھیں۔ کہیں کہیں کسی پیرا کو سرخ روشنائی سے نمایاں کرنے کے لیے اس کے نیچے لکیر کھینچ دی گئی تھی۔

کافی دیر تک مغز ماری کرنے کے باوجود اس کا سر پیر نظر نہیں آیا تو اکرم نے اسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

دوسرے روز اس کا لڑکا حامد اپنے والدین سے مل کر شہر جانے کے لیے گھر سے نکلا اور قصبہ کے واحد بس اسٹاپ پر آ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ قصبہ کی آبادی کم ہونے کی وجہ سے شہر اور قصبہ کے درمیان صرف ایک ہی کھٹارہ بس چلتی تھی۔ جس میں وہی لوگ سفر کرتے تھے جن کا تعلق قصبہ سے تھا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد اسے دور سے ایک ہیولا سا آتا دکھائی دیا۔ اور پھر واضح ہوتے ہی ایک پرانی سی بس اپنے پیچھے دھواں چھوڑتی کچی سڑک پر آتی دکھائی دی۔ بس میں برائے نام مسافر تھے حامد نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور بس اس کے نزدیک آ کر رکی اور اس کے سوار ہوتے ہی ایک جھٹکا لیتی شہر جانے والے راستے پر بھاگتی چلی گئی۔ بس ابھی شہر سے دو فرلانگ دور ہی ہوگی کہ اس کے ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے بس کو بریک لگاتے ہوئے روک دیا حالانکہ سامنے دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سب مسافر حیرت سے ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈرائیور بھی اب سامنے کے شیشے سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے سڑک کی جانب نظریں جمائے دیکھ رہا تھا۔ حامد نے اسے اس طرح نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا "چچا خیریت تو ہے بس کیوں روک دی"؟

ڈرائیور نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "میں نے ابھی ابھی سامنے سڑک پر ایک شخص کو سفید کفن میں لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اسے دیکھ کر ہی میں نے بس کو یکدم بریک لگائی تھی۔ مگر اب دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی جانور تک دکھائی نہیں دے رہا"۔ اس کی بات سن کر بس میں سنسنی سی پھیل گئی۔ بس کے مسافر دہشت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ مگر کسی کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔

پھر ایک شخص نے سکوت توڑا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوا "پاجی..... میرے خیال میں آپ کو وہم ہوا ہوگا یہاں تو دور دور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا ہے۔" ڈرائیور نے بھی سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بس اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر دوڑانے لگا۔

لیکن ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا۔ کہ اس کا ہاتھ گھوما اور بس تیزی سے سڑک سے اتر کر سائیڈ میں لگے ایک پرانے برگد کے درخت کے ساتھ جا ٹکرائی۔ مسافر جو آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یکدم ایک دوسرے کے اوپر گرے۔ بس کا آگے کا حصہ تقریباً سارا تباہ ہو گیا تھا ڈرائیور تو بس کے درخت میں لگتے ہی موقع پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ بس میں کل تیرہ افراد سوار تھے جن میں سے کچھ زخمی پڑے کراہ رہے تھے اور ان میں سے چند افراد کو صرف معمولی خراشیں آئی تھیں۔

بچ جانے والوں نے زخمی افراد کو سنبھالا اور ڈرائیور کی لاش بمشکل نکال کر زمین پر لٹا دیا۔ حامد کو بھی انہوں نے سیٹ سے اٹھا کر ایک درخت کے سائے میں لٹا دیا۔ جاں بحق ہونے والے مسافروں میں صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہی شامل تھے، ان میں سے دو تین افراد جنہیں معمولی چوٹیں آئی تھیں قصبہ کی جانب دوڑ گئے۔ تاکہ وہاں سے مدد لے کر آئیں۔ باقی مسافر درخت کے نیچے بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

حادثے میں بچ جانے والے مسافروں نے جیسے ہی قصبہ میں داخل ہو کر بس کے حادثہ کے متعلق بتایا تو پورے قصبے میں کہرام مچ گیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھر سے نکل کر جائے حادثہ کی جانب دوڑ پڑا۔ اکرم ابھی شہر جانے کے لیے سائیکل صاف کر ہی رہا تھا کہ اس نے بھی بس کے حادثے کے متعلق خبر سن لی۔ گھبراہٹ میں اس نے سائیکل بھی نہیں لی اور خبر گیری کرنے کے لیے پیدل ہی اس طرف دوڑ گیا جہاں اس نے حادثہ کے بارے میں سنا تھا۔ قصبہ کے دوسرے افراد بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور مل کر زخمیوں کو اٹھا رہے تھے۔ اکرم بدحواس ہو کر ایک ایک چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی اس کی نظر ایک جانب پڑے حامد پر پڑی تو وہ چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ حامد کے سر پر چوٹ کا نشان تھا جس میں سے خون رس رس کر پپڑی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور اس کا لباس خون سے تربتر ہو رہا تھا۔ وہ اسے اٹھائے قصبہ کی واحد ڈسپنسری کی طرف چل پڑا۔

ڈسپنسری میں ایک شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا اس نے جیسے ہی کسی کے چیخنے کی آواز سنی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے سے اکرم ہاتھوں پر ایک نوجوان لڑکے کو اٹھائے اس کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے اس کے ہاتھوں سے لیا اور ایک طرف پڑے لمبے میز پر لٹا دیا۔ اکرم نے روتے ہوئے اسے تمام واقعہ بتا دیا۔ اس شخص نے پانی گرم کر کے روئی سے اس کے زخم صاف کیے۔ اور مرہم وغیرہ لگا کر اس کی پٹی کر دی اور بعد میں ایک انجکشن لگا دیا۔ "فکر کرنے کی بات نہیں ہے جھٹکا لگنے کی وجہ سے اس کے سر پر چوٹ آئی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آرام آ جائے گا۔" اس نے ہاتھوں سے ربڑ کے دستانے اتارتے ہوئے اکرم سے کہا۔ اور اکرم دل ہی دل میں اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرنے لگا اور پھر واقعی کچھ دیر میں حامد نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جیسے ہی گردن گھمائی تو اس کی نظر اپنے والد پر پڑی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھنے لگا مگر اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔

اکرم نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ میز پر لٹا دیا۔ اس کے ہوش میں آنے پر اکرم نے اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے جو بتایا تو اسے سن کر اکرم کے ساتھ ساتھ ڈسپنسری میں موجود شخص بھی لرز گیا۔ اکرم فوراً سمجھ گیا کہ یہ حادثہ اس منحوس کتاب کی کارستانی ہے۔ اس نے سہارا دے کر حامد کو ٹیبل سے اٹھایا اور اسے لے کر گھر کی جانب چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس کتاب کو پھینکنے کے لئے الماری کھولی تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کتاب گدھے کے سر سے سینگ کے مصداق غائب تھی۔ حالانکہ وہ قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے وہ منحوس کتاب اس الماری میں رکھی تھی اور تالا لگا کر اس کی چابی ابھی بھی اس کی جیب میں تھی۔ اس صورت میں گھر کے کسی اور فرد کا تو کتاب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے الماری کو کھلا چھوڑا اور کمرے سے باہر آ کر اس نے جب گھر کے دیگر افراد کو کتاب کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو وہ سب بھی حیران اور خوفزدہ ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دنوں میں ہی وہ لوگ اس کتاب کو بھول گئے مگر ایک روز ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہونے پر انہیں یقین کامل ہو گیا کہ وہ پراسرار طور پر کسی آسیبی چکر میں پھنس گئے ہیں۔

ہوا یوں کہ ایک روز صبح کے وقت اکرم جب سو کر اٹھا تو اس کا بستر تازہ لہو سے تر تھا۔ اور اس کے اپنے کپڑے جو کبھی ہلکے آسمانی رنگ کے تھے خون میں گہرے سرخ ہو گئے تھے اس نے گھبرا کر اپنے گھر کے دیگر افراد کو آوازیں دے کر اٹھایا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی بیوی اور بچے خوف سے چیخنے لگے۔ بستر پر خون پھیلا ہوا تھا اس کے علاوہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس نے غسل کیا اور دوسرے صاف کپڑے پہن لیے۔ اس کی بیوی نے بستر دھونے کی

خاطر اسے لپیٹا تو اس کے نیچے سے کتاب کا ایک صفحہ نکلا جس کا رنگ گہرا زرد تھا۔ اور پھر یہ دیکھ کر اکرم کی سٹی گم ہوگئی کہ یہ اسی منحوس کتاب کا ورق تھا جو الماری سے غائب ہوگئی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ صفحہ یہاں کس نے لا کر رکھا اور باقی کتاب کہاں چلی گئی۔ صفحہ پر ایک سانپ کی تصویر چھپی ہوئی تھی جس کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس میں چڑیا بھی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ سانپ کا رنگ سیاہ تھا اور اس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ آدھے حصے پر تصویر تھی اور آدھے صفحے پر عجیب سے ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ اکرم نے کاغذ کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھا اور شہر کی طرف چل دیا۔

شہر پہنچ کر اس نے اپنی دوکان پر جانے کی بجائے اپنے ایک دوست شبراتی بابا کے پاس جانے کا قصد کیا۔ شبراتی بابا مضافاتی کالونی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پزیر تھے۔ ان کے ساتھ دوستی ہونے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ اور یادگار ہے۔ ایک دن اکرم اپنی دوکان پر بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا کہ اچانک ایک فقیر کی صدا سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا تو سامنے ایک درویش صورت شخص کو کھڑے پایا جو اپنا ہاتھ پھیلائے اس سے سوال کر رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے قدرے رحمدل واقع ہوا تھا اس لیے اس نے اس فقیر کو اندر بلا کر عزت و تکریم سے بٹھایا اور اس کی حاجت پوری کی۔

فقیر جس نے بعد میں اسے اپنا نام شبراتی بابا بتایا اس سے کہنے لگا کہ وہ اپنی دوکان ایک مہینے کے اندر اندر خالی کر کے کوئی اور دوکان تلاش کر لے اس کے کہنے کے مطابق اس کی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ اور یہ کہ وہ اس کا امتحان لینے کے لیے اس کے پاس آیا تھا اس نے اس کی عزت و تکریم کر کے اپنا نقصان ہونے سے بچا لیا ہے۔ اکرم نے بحث کرنے کی بجائے دوسرے روز ہی اپنی دوکان خالی کر کے دوسرے بازار میں ایک اور مناسب جگہ لے لی اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد فقیر کا کہنا سچ ثابت ہوا اور رات کے پچھلے پہر اس کی دوکان کی چھت ایک زوردار دھماکے سے زمین بوس ہوگئی۔ جس کی اطلاع چوکیدار نے اسے گھر آ کر دی تھی۔ اس دن اس نے سمجھ لیا تھا کہ شبراتی بابا کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ اس کے دل میں ان کی عزت اور بڑھ گئی۔ اور وہ گاہے بگاہے ان کے پاس جانے لگا۔ اس نے کئی بار انہیں کچھ رقم نذرانے کی صورت میں دینے کی کوشش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اسے ان مادی چیزوں سے شدید نفرت ہے۔ ان کا یہ جواب سن کر اسے دوبارہ ہمت نہیں ہوئی۔

اب اکرم دل ہی دل میں یہ دُعا مانگتا ہوا جا رہا تھا کہ بابا اسے گھر پر ہی مل جائیں تاکہ وہ انہیں تمام صورت حال بتا کر کوئی مشورہ لے سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں بابا کا گھر سامنے آ گیا اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ابھی اس نے دوبارہ دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے ایک چقندر کی شکل کا لمبوترے چہرے والا شخص جس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا باہر نکلا اور اس کی طرف دیکھ کر اس نے اکرم کو اندر کی طرف آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راستہ دیا۔

اکرم اسے سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ صحن میں ایک جانب چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا جس کے سامنے کے رخ دو منکے رکھے تھے۔ کمرے میں ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر شبراتی بابا آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اس کے گرد دو تین مرید بیٹھے ان کے بازو دبا رہے تھے۔

شبراتی بابا تسبیح ہاتھ میں تھامے جھوم رہے تھے۔ اکرم نے سلام کیا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے پہچان گئے اور اسے قریب ہی بیٹھا لیا۔

اکرم نے ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد انہیں کتاب ملنے سے لے کر حامد کے ایکسیڈنٹ اور اپنے بستر کا خون سے تر ہونے کا تمام قصہ تفصیل سے سنا دیا۔ اس دوران بابا خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اکرم چپ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

بابا نے تمام باتیں سن کر ایک گلاس منگوایا اور اس میں پانی بھر کر اپنے سامنے رکھ لیا اور خود کو ایک بڑی سی چادر میں چھپا لیا۔ ان کے مرید اور اکرم خاموشی سے ایک جانب بیٹھے انہیں دیکھتے رہے۔ وہ چادر کے اندر ہی اندر کچھ پڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہل بھی رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے چادر اپنے اوپر سے ہٹا دی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی کا رنگ خون کی طرح گہرا سرخ ہو رہا تھا اور بابا کا چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔ ان کی حالت یوں ہو رہی تھی جیسے وہ میلوں سے دوڑتے ہوئے آئے ہوں۔ کچھ دیر تک وہ سانس بحال کرتے رہے۔ پھر اکرم کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوئے۔

''میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ تمام حالات سے پردہ اٹھ جائے مگر میں صرف اس قدر ہی جان سکا ہوں کہ جو کتاب تمہیں ملی تھی وہ دو ہزار سال پرانی کتاب ہے۔ صدیوں پرانی اس کتاب کا موضوع کالے علم پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے متعلق ایک اہم بات جو مجھے معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ جس کسی کے پاس یہ کتاب ہوگی اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اب جب کہ تمہارے کہنے کے مطابق وہ کتاب الماری سے غائب ہو چکی ہے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک تعویذ بنا دیتا ہوں اسے اپنے گھر میں لٹکا دینا انشاء اللہ تمہیں یا تمہارے گھر کے دیگر افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ کہہ کر بابا نے اسے زعفران سے ایک تعویذ لکھ کر دے دیا۔

اکرم نے انہیں سلام کیا اور واپس دوکان پر آ گیا۔ سارا دن دوکان میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک گیا تھا اس نے دوکان قبل از وقت بند کی اور گھر کی جانب چل دیا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اسے اپنی جیب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اس نے سائیکل روک کر اپنی جیب میں دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

جیب میں ایک ننھا سا سانپ بیٹھا صاف نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے جلدی سے جیب الٹ دی۔ جیب میں رکھے پیسے اور دیگر کاغذات وغیرہ جن میں بابا کا دیا ہوا تعویذ بھی شامل تھا باہر نکل کر نیچے زمین پر گر گیا۔ اور پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیسے ہی اس نے کاغذات نیچے گرائے تو وہ سانپ جو اس نے جیب میں دیکھا تھا کہیں نظر نہیں آیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تعویذ بھی سرے سے غائب ہو گیا تھا جو اسے بابا نے دیا تھا اور پھر اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی کہ یہ سب دھوکا ہوا ہے یہ سب کارستانی اس کی جیب سے تعویذ نکلوانے کے لیے تھی۔

بادل نخواستہ اس نے دوبارہ گھر کی راہ لی اور جیسے ہی وہ گلی میں مڑا تو اسے اپنے گھر کے سامنے ہجوم نظر آیا اور گھر میں سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ منظر دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے ہجوم میں سے چند افراد کو پرے دھکیلتے ہوئے اندر جانے کے لیے جگہ بنائی اور اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اس کو اندر جانے کے لیے جگہ دی۔

سامنے چارپائی پر اس کی منجھلی بیٹی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے گلے میں ایک کاغذ اس طرح پھنسا ہوا تھا جیسے بلیڈ کو صابن میں پھنسا دیا جائے اور پھر اسے کاغذ کو پہچاننے میں قطعی مبالغہ نہ ہوا کہ وہ کاغذ اسی منحوس کتاب کا ورق تھا۔ جسے وہ غلطی سے گھر اٹھا لایا تھا۔ لوگ ایک دائرے کی صورت میں چارپائی کے گرد کھڑے تھے اور کسی کو اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر لاش کے گلے سے اس پھنسے ہوئے کاغذ کو نکال سکے۔

اکرم نے جیسے ہی کاغذ کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکالا تو خون ایک فوارے کی صورت میں زمین پر گرنے لگا۔ اس نے جلدی سے ایک کپڑے کا ٹکڑا لے کر لڑکی کے گلے پر باندھ دیا اور اس طرح خون کا بہاؤ رک گیا۔ لڑکی کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا اور نجانے کب اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ بعد میں ضروری رسومات سے فارغ ہو کر اسے دفنا دیا گیا۔

اکرم کی تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اسے ہر وقت اپنے چاروں طرف زرد رنگ کے اوراق اڑتے نظر آنے لگے۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتا چلا گیا۔ دوکان پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ معاشی طور پر بالکل ختم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس دن کو کوس رہا تھا جس دن وہ اس منحوس کتاب کو اٹھا کر گھر لایا تھا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس لیے اب اس غلطی کا خمیازہ اسے اور اس کے گھر کے دیگر افراد کو بھگتنا ہی پڑنا تھا۔

ایک صبح وہ سو کر اٹھے تو اس کی چھوٹی لڑکی جس کی عمر تقریباً چھ سال کے لگ بھگ تھی مردہ حالت میں پائی گئی۔ اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر خنجر سے نشان بنا دیئے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ لرزا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ بنا ہوا تھا اور جس میں سے مغز نکال لیا گیا تھا اور ایک گڑھا سا بن گیا تھا اور اس گڑھے میں ایک کاغذ کو موڑ کر بھر دیا گیا تھا اسے اس حالت میں دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔

سب سے دہشت ناک بات یہ تھی کہ وہ کاغذ اسی کتاب کا ورق تھا۔ پل دو پل میں تمام قصبہ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور آناً فاناً تمام لوگ اکرم کے گھر جمع ہونا شروع ہو گئے جو بھی بچی کو اس حالت میں دیکھتا خوف اور حیرت سے سہما سہما دور ہٹ جاتا۔ سب لوگ دل ہی دل میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے۔ اکرم کی بیوی پر غشی طاری تھی۔ ان کے لیے اپنی پہلی بچی کا صدمہ ہی جان لیوا تھا کہ یہ دوسرا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

اکرم کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ تھی وہ اپنی بچیوں کی اموات کا خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ لوگ انہیں دلاسے دے رہے تھے۔ مگر وہ اندر ہی اندر کھوکھلے ہوتے جا رہے تھے۔

اکرم دوبارہ شبراتی بابا کے پاس بھی گیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہوں نے دوبارہ حساب لگا کر دیکھا ہے مگر وہ اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بدی کی طاقت کے سامنے ان کا معمولی حاصل کیا ہوا روحانی علم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے ٹکر لینے کے لیے بڑے عامل کی ضرورت ہو گی۔ بدی اور نیکی کی طاقتیں ازل سے ہیں اور وہ شروع سے ایک دوسرے کے خلاف کارفرما رہی ہیں۔ بابا کا ٹکا سا جواب سن کر اکرم کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس لیے اس نے تمام معاملہ خدا پر چھوڑتے ہوئے چپ سادھ لی۔

مگر اب جس طرح پے درپے واقعات رونما ہونا شروع ہو گئے یہ اس کے لیے لمحہ فکریہ تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ دوکان بند رہنے کی وجہ سے نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی۔ اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ قصبہ کے لوگوں نے کچھ روز تک تو ان کی مدد کی لیکن آخر کب تک ہر کسی کے ساتھ پیٹ لگا ہوا تھا۔ اس لیے اب تو لوگ اس کے مکان کے نزدیک سے گزرنے سے بھی کتراتے تھے۔ کہ کہیں نحوست کے سائے ان پر بھی نہ پڑ جائیں۔ اس دوران اس کا لڑکا حامد جو کہ شہر پڑھنے گیا تھا وہ بھی معاشی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے فیس ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ناکام ہو کر گھر لوٹ آیا۔ وہ اپنی عمر کی سولہ بہاریں دیکھ چکا تھا گھوم پھر کر مزدوری ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کم عمر سمجھ کر ناکام رہا۔

گھر میں برے وقتوں کے لیے جو پونجی بچا کر رکھی تھی وہ کب کی ختم ہو گئی تھی۔

ایک روز اکرم جسے ٹی بی کا روگ لگ چکا تھا اسے قبر تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اس کی جدائی میں اس کی بیوی بھی چل بسی۔ اس بات کا حامد نے اپنے ذہن پر اتنا صدمہ لیا کہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اب قصبہ کی گلیوں میں خاک اڑاتا پھرتا ہے شاید کبھی زندگی اس سے بھی روٹھ جائے اور وہ بھی اپنے والدین اور بہنوں کے پاس چلا جائے۔

عبرتناک انجام

نینا خان۔ کراچی

بزرگ کی آواز سنائی دی، جو لوگ چند پیسوں کی خاطر ناقابل معافی گناہ کرتے ہیں وہ اپنی دنیا ہی نہیں اپنا آخرت بھی خراب کرلیتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو نیک ہدایت عطا فرمائے۔

خوف کے افق پر جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی خوفناک دہشت ناک......لرزاتی کہانی

طویل مسافت کے بعد وہ اپنی مطلوبہ جگہ آخر کار پہنچ ہی گیا تھا۔ تھکن سے برا حال تھا اگرچہ حقیقت کی تلاش نے اسے آرام کرنے سے روکے رکھا تھا اب وہ اس جگہ پر آ کر بیٹھا تھا جہاں وہ خواری اور گرد چھان کر آیا تھا۔ یہاں بھی لوگوں کا بہت ہجوم تھا قطار در قطار لوگ لائن لگا کر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن وہ مصمم ارادے سے وہاں بیٹھا اپنی باری آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ سارا دن انتظار کرنے کے بعد ایک آدمی نے باقی بچے لوگوں سے کہا۔

”حضرت صاحب سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب آپ سب کل تشریف لے آیئے گا۔“

اس کی بات سنتے ہی باقی تمام لوگ اٹھ کر جانے لگے مگر وہ اپنی جگہ پر جوں کا توں بیٹھا رہا۔ تمام لوگ جب چلے گئے تو اس آدمی نے اسے اپنی جگہ بیٹھا پایا تو اس کے پاس آ کر بولا۔

"حضرت سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے جاؤ اب کل آنا۔ ابھی حضرت کے آرام کا وقت ہے پھر اس کے بعد حضرت رات بھر عبادت میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔"

اپنے سامنے کھڑے شخص کی بات سن کر وہ گویا ہوا۔

"جناب کئی میلوں کی مسافت طے کرتا۔ جہاں بھر کی گرد چھانتا ہوا بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ جب تک مجھے اپنے سوالوں کے جوابات میں حضرت سے نہ لے لوں میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں حقیقت کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن میاں حضرت ابھی کسی سے نہیں ملتے وہ ظہر میں کل پر بیٹھیں گے اپنے مریضوں کی روداد سننے، تم کل آجانا۔" حضرت کے مرید نے جواب دیا۔ تو وہ پھر سے گویا ہوا۔

"میں بھی بہت دور سے اپنی روداد سنانے آیا ہوں میں رات یہیں قیام کرلوں گا بیٹھے بیٹھے لیکن جاؤں گا نہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر یہاں سے اٹھو اور وہاں سامنے چارپائی پر آرام کرلو۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں یہیں پر رہتا ہوں۔ سامنے وہاں میرا گھر بنا ہوا ہے۔ تم جاؤ میں تمہارے لئے چادر لے آتا ہوں رات اوڑھنے میں آسانی ہوگی۔"

آدمی کی بات سن کر وہ اٹھا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ساتھ چند کپڑے اور ضرورت کا سامان ایک بیگ میں لے آیا تھا۔ مزار کے احاطے میں بچھی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے چاروں اطراف نظر دوڑائی تو سامنے ایک بڑا سا کولر رکھا تھا اس نے اٹھ کر پانی پیا وضو خانے میں جا کر منہ دھویا۔ اور پھر سے چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی اپنے گھر سے ایک چادر اور چائے کا کپ لے آیا اور بولا۔

"میاں لو یہ چائے پی لو بہت تھکے تھکے معلوم ہوتے ہو۔" اس نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ ہاں کافی تھک چکا ہوں مگر مسافت سے نہیں اپنے سوالوں کو تلاش کرتے کرتے۔ مگر ان کا جواب ملتا ہی نہیں ہے۔" وہ انتہائی سنجیدگی سے اپنی بات کر رہا تھا تو آدمی گویا ہوا۔

"میاں بہت پریشان حال معلوم ہوتے ہو۔ اگر برا نہ مانو تو اپنا نام بتانا پسند کرو گے مجھے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"میرا نام جمیل ہے اور کئی عاملوں اور عالموں کے پاس گیا اپنے سوالوں کی تلاش میں مگر کسی نے بھی مجھے مطمئن نہیں کیا۔ کہاں کہاں اور کن کن شہروں میں دیہاتوں میں قصبوں میں گیا مگر کہیں پر سکون جواب نہیں ملا۔ ایک دن میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ مجھے ایک بزرگ شخص ملے باتوں باتوں میں مجھے انہوں نے یہاں کا پتا بتایا تو میں پوچھتا پوچھتا اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ شاید کہ حضرت سے مجھے میرے سوالوں کا جواب مل جائے۔"

جمیل کی بات پر وہ آدمی گویا ہوا۔ "جمیل میاں بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔ میرا نام عبدالقیوم ہے۔ میں حضرت صاحب کا مرید ہوں۔ یہ حضرت کے والد محترم کا مزار ہے۔ وہ بھی بہت پہنچے ہوئے عالم تھے۔ حضرت کے پاس بھی اللہ کے فضل و کرم سے بڑا علم ہے۔ تم صحیح جگہ پر آئے ہو۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔"

"عبدالقیوم صاحب ایک بات پوچھوں آپ سے؟؟؟" جمیل نے کہا تو عبدالقیوم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ یہاں ہی رہتے ہیں۔ مزار کے قریب گھر بنا لیا۔ یہاں آپ کو کوئی دقت تو نہیں ہوتی۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں اتنے مریض آتے ہیں۔ روحانی علاج ہوتا ہے۔ آپ کے بیوی بچے ڈرتے تو نہیں ہیں۔" جمیل کی بات پر عبدالقیوم ہنستے ہوئے بولا۔

"جمیل میاں۔ حضرت نے ہی ہمیں یہاں گھر بنا کر دیا ہے۔ اور حضرت کا ہجرہ بھی یہیں ہے۔ وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ حضرت کے ہوتے ہوئے نہ ہمیں کوئی ڈر ہے اور نہ ہی کسی چیز کی کوئی فکر اور رہی بات بیوی اور بچوں کی تو بیوی بہت صابر عورت ہے اور ایک ہی بیٹا جو کہ چار سال کا ہے۔ حضرت نے اسے اسلامی اور قرآن کی تعلیمات ابھی سے دینی شروع کر دی ہیں۔ بہت بولتا ہے ابھی سو چکا ہے۔ رات کافی ہو چکی ہے جمیل میاں

ٹھنڈ بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ کمبل اوڑھ لینا چلو صبح ملتے ہیں۔ فی امان اللہ۔"

عبدالقیوم کے جان کے بعد جمیل چارپائی پر لیٹا اور سونے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی دنوں کی مسافت کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ غم سے نڈھال اس وقت کو یاد کرنے لگا۔ جب اس نے اپنی اولاد کو کھویا تھا۔ آنسو مستقل اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔ حلق خشک ہونے لگا تو اٹھ کر کولر سے پانی پی لیا۔ پھر مزار میں جا کر بیٹھ گیا اور سورۃ یٰس کی تلاوت کرنے لگ گیا کہ شاید بے چین دل کو کچھ قرار آ جائے۔

تلاوت کے بعد اسے نیند آنا محسوس ہوئی اللہ کے کلام کو پڑھ کر کچھ راحت ملی تو واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گیا کمبل اوڑھا تو اسے نیند آ گئی۔ فجر کی اذان، مزار کے احاطہ میں مسجد جیسی جگہ بنائی گئی تھی۔ آذان کی آواز سے وہ اٹھا حاجت سے فارغ ہو کر وضو کر کے نماز کے لئے آ گیا۔

امامت ایک نورانی چہرے والے بزرگ کر رہے تھے ان کی آواز میں بہت مٹھاس تھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی جمیل امام صاحب کے پاس آیا اور بولا۔

"حضرت صاحب کیا مجھے وقت مل سکتا ہے۔ آپ سے بات کرنی ہے۔" نورانی چہرے والے بزرگ نے مسکرا کر جمیل کی طرف دیکھا اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ جمیل کو ان کے ہاتھ رکھتے ہی ایک قلبی سکون سا احساس ہوا اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بزرگ نے فرمایا۔

"بیٹا ابھی انتظار کچھ اور ہے قسمت میں۔ صبر سے کام لینا۔ تمہیں تمہارے تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے ابھی انتظار کرو۔"

بزرگ اپنے ہجرے میں جا کر تلاوت کرنے لگے۔ عبدالقیوم نے جمیل کے پاس آ کر کہا۔

"ابھی حضرت کے تلاوت کرنے کا وقت ہے کچھ دیر بعد ناشتہ کر کے تھوڑا آرام کریں گے۔ ظہر میں مریضوں کے روحانی مسائل کا حل فرمائیں گے۔ ظہر میں آج حضرت سے اپنے تمام سوالوں کے جوابات لے لینا۔"

عبدالقیوم کی بات سن کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جمیل نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

"جی عبدالقیوم بھائی اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری تلاش ختم ہوئی۔ مجھے میرے تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔ میرے مسائل کا حل آج ضرور مل جائے گا۔"

"انشاءاللہ۔" عبدالقیوم نے کہا۔

☆.....☆.....☆

عبدالقیوم جمیل کے لئے ناشتہ لے کر آیا تو دونوں نے ساتھ مل کر چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا، جمیل بہت خوش نظر آ رہا تھا اسے یقین تھا کہ آج اس کی مراد بر آئے گی۔ جمیل کو خوش دیکھ کر عبدالقیوم بولا۔

"میاں جمیل آج تمہارے چہرے پر خوشی دیکھ کر اچھا لگ رہا ہے۔"

"جی عبدالقیوم بھائی آج میرے دل کو تسلی سی مل گئی ہے کہ جن سوالوں نے مجھے کئی سالوں سے پریشان کر رکھا ہے آج مجھے ان کا جواب مل جائے گا۔ پتا ہے عبدالقیوم بھائی میں اتنے آستانوں پر گیا اتنے عالموں اور عاملوں سے ملا کبھی ایسا روحانی سکون نہیں ملا جیسا آج ملا ہے۔ جب حضرت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایسا لگا کہ ایک قلبی سا سکون ملا ہو۔ میرے مچلتے ارمانوں کو کسی نے ایک دم روک دیا ہو۔" جمیل کی بات سن کر عبدالقیوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں حضرت کے ہاتھ میں بہت شفا ہے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے ہیں اپنے مسائل کی تلاش میں۔"

"بس عبدالقیوم بھائی مجھے تو صرف ظہر کا انتظار ہے۔" جمیل کی بات پر عبدالقیوم نے کہا۔

"ٹھیک ہے جمیل میاں تم انتظار کرو میں ذرا مزار کی صاف صفائی کروا دوں۔"

☆.....☆.....☆

جمیل بہت بے چینی سے ظہر کی آذان کا انتظار کر رہا تھا تاکہ نماز ظہر سے فارغ ہو کر وہ حضرت سے مل سکے کچھ ہی دیر میں تین بڑی بڑی گاڑیاں آ کر مزار کے احاطے میں رکیں ان میں سے کوئی اثر و رسوخ کے حامل انسان اترے جسے جمیل دیکھ رہا تھا وہ حضرت کے ہجرے میں داخل ہوئے کچھ بات کرنے کے بعد حضرت ان کے

ہمراہ گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے گاڑی کی کھڑکی سے حضرت نے جمیل کی طرف دیکھ کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ جمیل اداس ہو کر پھر سے اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عبدالقیوم نے آ کر جمیل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میاں جمیل اداس مت ہو۔ حضرت نے کہا ہے کہ صبر کرو اور ان کا انتظار کرو وہ تمہارا مسئلہ ضرور حل کریں گے۔"

اپنے برابر میں کھڑے عبدالقیوم کا ہاتھ پکڑ کر جمیل نے رونا شروع کر دیا اور روتے ہوئے گویا ہوا.....

"آخر کب تک صبر کروں عبدالقیوم بھائی آخر کب تک؟؟ میں آج بہت خوش تھا لیکن میری یہ خوشی بھی مختصر لمحوں کی مہمان تھی۔ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے جب کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے تو پھر وہ بھی فوراً ہی ختم ہو جاتی ہے۔" عبدالقیوم چارپائی پر بیٹھتے ہوئے جمیل سے گویا ہوا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں جمیل میاں جب امید ٹوٹتی ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔ مگر حضرت نے جب کہا ہے کہ ہو تمہارا مسئلہ حل کریں گے تو وہ ضرور کریں گے۔ اصل میں یہ صاحب جو آئے تھے یہ ساتھ والے گاؤں کے زمیندار ہیں ملک صاحب ان کی چھوٹی بیٹی پر اثرات ہو گئے ہیں، وہ یہاں آنے نہیں دے رہا وہ جن اس لڑکی پر ہے۔ اس نے بہت پریشان کر دیا ہے ملک صاحب حضرت کو لے کر گئے ہیں عموماً حضرت ایسے کہیں نہیں جاتے مگر جوان لڑکی ہے اور وہ جن اس لڑکی کے ذریعے غلط حرکتوں پر اتر آیا ہے لڑکی کو بدنام کرنا اس کی عزت ناموس مٹی میں ملوانا۔ بس اسی وجہ سے حضرت خود چلے گئے تاکہ اس سرکش جن کو قابو کر کے سزا دے سکیں۔"

"ٹھیک ہے عبدالقیوم بھائی میں بھی دیکھتا ہوں کہ اللہ میری آزمائش کب تک لیتا ہے۔ ٹھیک ہے میں بھی ثابت قدم رہوں گا۔ اور خدا کی آزمائش پر پورا اتروں گا۔" جمیل نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری تمام مشکلات حل فرمائے اور یہ کڑی آزمائش ختم فرمائے آمین۔" عبدالقیوم نے دعا دی۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچنے کے بعد ملک صاحب نے حضرت کو ہال میں بیٹھا دیا وہاں حضرت بیٹھتے ہی گویا ہوئے۔ "بیٹھنے کا وقت نہیں ہے ملک صاحب مجھے فوراً اس کمرے میں لے چلیں جہاں بچی ہے۔"

"ٹھیک ہے حضرت صاحب چلیں میں آپ کو اپنی بیٹی سعدیہ کے کمرے میں لے چلتا ہوں۔"

ملک صاحب..... کو لے کر سعدیہ کے کمرے میں گئے تو ملک صاحب کی بیگم اپنی بچی کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں سعدیہ کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ حضرت کو دیکھ کر بیگم ملک نے حضرت کو سلام کیا۔

"السلام علیکم حضرت صاحب۔ حضرت صاحب میری بچی کی دیکھیں کیا حالت ہو گئی ہے۔ خدا کے واسطے میری بچی کی مدد کریں۔ اسے پھر سے ٹھیک کر دیں۔ آپ سے بہت امیدیں ہیں۔" حضرت نظریں جھکا کر گویا ہوئے۔

"وعلیکم السلام! بیگم صاحبہ امیدیں انسان سے نہیں اللہ سے وابستہ رکھنی چاہئیں۔ اللہ نے چاہا تو بچی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ یہاں سے جائیں اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اللہ سے دعا کریں ماں کی دعائیں بچوں کے حق میں ضرور قبول ہوتی ہیں۔"

بیگم صاحبہ گویا ہوئیں۔ "لیکن حضرت میں اپنی بچی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں میں کونے میں کھڑی رہوں گی۔ مجھے یہاں سے جانے کا نہ کہیں۔"

حضرت نے ملک صاحب کو دیکھ کر کہا۔ "ملک صاحب آپ ذرا انہیں یہاں سے لے کر جائیں۔" ملک صاحب کے کہنے پر بیگم صاحبہ وہاں سے آنسو پونچھتے ہوئے چلی گئیں۔ ملک صاحب حضرت کے ساتھ کھڑے تھے حضرت نے فرمایا۔

"ملک صاحب بچی کے سر پر ہاتھ رکھیں میں تلاوت شروع کرتا ہوں۔"

حضرت نے سورۃ جن کی تلاوت شروع کی۔ ملک صاحب نے بچی کے سر کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا وہ مسلسل سر چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس پر قابض سرکش جن مسلسل حضرت کو گالیاں دے رہا تھا۔ سورۃ جن کی تلاوت

سے اسے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ وہ بری طرح سعدیہ کے اندر سے چیخ رہا تھا۔ تلاوت سے فارغ ہو کر حضرت نے سعدیہ کے کانوں میں جا کر پھونک ماری تو سعدیہ کے اندر سے سرکش جن بولا۔

"چلا جا یہاں سے تو، میں اس لڑکی کو چھوڑ کر جانے والا نہیں۔"

حضرت نے پیار سے فرمایا۔

"دیکھو یہ ایک انسان ہے اور تم ایک جن ہو۔ بہت پیار سے بات کر رہا ہوں تم سے کہ اسے چھوڑ دو۔ اور اپنی دنیا میں واپس جاؤ۔"

"میں اس کے پاس خود سے نہیں آیا۔ مجھے تو عمل کر کے بھیجا گیا ہے۔ میں اس وقت تک نہیں جا سکتا۔ جب تک وہ مجھے حکم نہ دے۔ اسی کے حکم سے میں یہاں آیا ہوں۔" جن نے کہا۔

"کس نے بھیجا ہے تجھے اور کیوں بھیجا ہے۔" حضرت کے پوچھنے پر وہ بولا۔

"نہیں بتاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔"

حضرت نے پھر پیار سے کہا۔ "دیکھ میں بہت پیار سے کہہ رہا ہوں بتا کس نے تجھے بھیجا ہے؟ اور کیوں بھیجا ہے؟"

"نہیں بتاؤں گا میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس کی ڈھٹائی پر حضرت نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر اب بات پیار سے نہیں ہوگی۔ جیسے تیری مرضی۔" حضرت نے قرآن کی تلاوت کرنا شروع کر دی۔ سعدیہ کے جسم پر قابض جن چیخنے چلانے لگا، زور زور سے رسیاں کھلوانے کی کوشش کرتا رہا۔ مسلسل تلاوت سن کر بولا۔

"بس کرو مت پڑھو، مجھے تلاوت کے الفاظ جھلسا رہے ہیں، میں جل جاؤں گا۔ مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ بس کرو۔"

حضرت صاحب گویا ہوئے۔ "ٹھیک ہے پھر تجھے میرے سوالوں کے جوابات دینے ہوں گے۔"

"ہاں میں بتاتا ہوں۔ بس اب مت پڑھنا۔" جن نے کہا تو حضرت بولے۔

"تو پھر بتا کس نے بھیجا ہے تجھے اور کس وجہ سے بھیجا ہے۔"

"مجھے ملک صاحب کے بھتیجے انور ملک نے بھیجا ہے۔ وہ سعدیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ملک صاحب کے منع کرنے پر اس نے عمل کے زور پر مجھے سعدیہ پر قابض کر کے اس کی عزت خراب کرنے کے کام پر معمور کیا ہے تاکہ سعدیہ انور ملک کی نہیں ہو سکے تو کسی کے قابل نہ رہے۔"

جن کی بات سن کر حضرت نے ملک صاحب کی طرف دیکھا تو ملک صاحب آنسو صاف کر کے بولے۔

"انور میرے بھائی کا بیٹا ہے، بہت اوباش ہے عمل عملیات اور جادو ٹونوں میں بھی پڑا ہوا ہے۔ بھلا اس سے میں کیسے اپنی جان سے پیاری بیٹی کی شادی کر کے اپنی زندگی برباد کر دیتا، میں نے اسے سختی سے منع کر دیا اور دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ اسی بات کا بدلہ مجھ سے اور میری معصوم بچی سے لینا چاہتا ہے۔ حضرت صاحب خدا کا واسطہ ہے میری بچی کو اس جن کی قید سے بچا لیں۔ میں آپ کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر اپنی بچی کی جان اور عزت کی بھیک مانگتا ہوں۔ جب سے یہ منحوس جن میری سعدیہ پر قابض ہوا ہے۔ غلط غلط حرکتیں کروا رہا ہے۔ اس کی بے پردگی ہو رہی ہے وہ اپنے کپڑے اتار دیتی ہے۔ ہم نے جبھی اسے رسیوں سے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ حضرت صاحب میری بچی کی عزت بچا لیں۔"

اپنے قدموں پر گرے ہوئے ملک صاحب کو اٹھاتے ہوئے حضرت صاحب گویا ہوئے۔

"اللہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔ انور جیسے انسانوں کا خدا بہت برا حشر کرے گا۔ جو کسی کی عزت ناموس خراب کرتے ہیں۔ بس اب ہمیں اس شیطان سے سعدیہ بیٹی کا پیچھا چھڑانا ہے۔"

"حضرت صاحب یہ کام آپ ہی کرتے ہیں خدا کے واسطے میری بچی کا اس شیطان سے پیچھا چھڑائیں۔" ملک صاحب نے روتے ہوئے کہا۔

حضرت صاحب نے سعدیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر قرآنی سورتیں پڑھنا شروع کر دیں۔ سعدیہ بے ہوش ہو

گئی تو حضرت صاحب ملک صاحب کو لے کر ہال میں آئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ملک صاحب آج کی رات مجھے آپ کی حویلی میں ہی رکنا ہوگا۔ اسی ہال میں زمین پر سفید چادر بچا دیں ہم رات بھر یہاں بیٹھ کر قرآن کی تلاوت اور کچھ وظائف پڑھیں گے۔ انشاء اللہ سعدیہ بیٹی پر قابض جن واپس انور تک پہنچ جائے گا۔ جو عمل اس نے سعدیہ بیٹی پر کیا ہے وہی اب اس کے ساتھ ہوگا۔ اللہ کرم کرنے والا ہے۔"

رات بھر کی عبادت اور وظائف کرنے کے بعد آخر کار حضرت صاحب نے سعدیہ کو اس شیطان کے قبضے سے آزاد کروالیا۔ سعدیہ پہلے سے بہت بہتر لگ رہی تھی۔ ملک صاحب حضرت صاحب کے ہاتھ چومتے ہوئے بولے۔

"بہت بہت شکریہ حضرت صاحب آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"شکریہ کی ضرورت نہیں ملک صاحب یہ اللہ کا دیا ہوا علم ہے اسی کی رضا کے لئے اس کے بندوں کی مدد کرتا ہوں۔"

ملک صاحب حضرت صاحب کی بات سن کر بولے۔

"واقعی اللہ کا دیا علم ہے آپ کے پاس۔ اللہ آپ کو اجر دے حضرت صاحب اللہ آپ کو اجر دے۔ اب آپ ہمیں مہمان نوازی کا موقع دیں کچھ دن ہماری حویلی میں آرام فرمائیں۔"

حضرت صاحب مسکرا کر بولے۔

"اب آپ ہمیں ہمارے آستانے تک پہنچانے کا بندوبست کردیں تاکہ ہم جلد از جلد وہاں کسی کی مدد کرسکیں، کوئی ہمارا منتظر ہے وہاں۔"

"جیسا حکم حضرت صاحب میں ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں۔" ملک صاحب بولے۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف حضرت صاحب کے انتظار میں جمیل بہت بے چین بیٹھا تھا۔ اسے بہت شدت سے حضرت صاحب سے اپنے سوالوں کا جواب حاصل کرنا تھا۔ جمیل کو اداس دیکھ کر عبدالقیوم جمیل کے برابر میں مزار کے فرش پر بیٹھا اور بولا۔

"جمیل میاں اتنے اداس مت ہو، حضرت صاحب کام ختم کر کے یہاں واپس آئیں گے۔" جمیل نے نظر اٹھا کر عبدالقیوم کی طرف دیکھا۔

"جی عبدالقیوم بھائی بس اداس تھا تو یہاں مزار پر آ کر بیٹھ گیا تاکہ کچھ سکون مل سکے۔"

"میاں اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" عبدالقیوم کی بات سن کر جمیل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا ہوا ہے آخر تمہارے ساتھ؟ ایسے کون سے سوالات ہیں جن کی تلاش میں تم اتنے پریشان ہو اپنے گھر بار بیوی بچوں سے دور ہو؟"

عبدالقیوم کے سوالات سن کر جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ تڑپ کر بولا۔

"بیوی بچوں۔ عبدالقیوم بھائی بچوں کی وجہ سے تو یہاں آیا ہوں بچے ہی تو میرے سوالات ہیں۔ ان سوالات کی تلاش میں ہی سرگرداں پھر رہا ہوں کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔"

عبدالقیوم حیرت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ "بچے ہی سوالات ہیں؟ کیا مطلب ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا جمیل میاں کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ میں تو عجیب الجھن میں پھنس گیا تمہاری اس بات سے مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"عبدالقیوم بھائی میں بھی عجیب الجھن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب اماں میرے لئے لڑکیاں تلاش کر رہی تھیں۔ میری جاب بھی اچھی تھی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے آفس میں باس خوش تھے اور مجھے جلد ہی کافی ترقی بھی مل گئی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا اماں اور میں ہی اکیلے بڑے سے گھر میں رہائش پذیر تھے ابا کے انتقال کے بعد سے ہی اماں میرے پیچھے پڑی تھیں کہ میں شادی کرلوں تاکہ اپنی بہو کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں سکون سے رہ سکیں۔ میں نے کام کاج کے لئے تین نوکر رکھ دیئے تھے تاکہ اماں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ کافی لڑکیاں

دیکھنے کے بعد آخر کار اماں کو ایک لڑکی بہت پسند آئی اس کا نام ماہ نور تھا اماں نے جب ماہ نور کی تصویر دکھائی تو میں بھی ماہ نور کو دیکھتا رہ گیا وہ بہت خوبصورت تھی میں نے اماں سے کہا۔

"اماں کہیں یہ لڑکی تصویر میں تو خوبصورت نہیں ہے پتا چلے کہ حقیقت میں کالی اور عجیب سی ہو۔" اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں اپنے بیٹے کے لئے بھلا ایسی ویسی لڑکی پسند کرسکتی ہوں۔ جوڑ بہت خوبصورت رہے گا۔ اور ہاں کل اتوار ہے میں تو ماہ نور کے والدین سے کہہ آئی ہوں اتوار کو میرا جمیل گھر میں ہوتا ہے میں اسے کل لے کر آؤں گی اور ماہ نور کے ہاتھ میں پیسے اور مٹھائی رکھ جاؤں گی تاکہ بات پکی ہوجائے اور جلد ہی شادی بھی کرلیں گے۔ انہوں نے بھی حامی بھر لی ہے۔ تمہاری تصویر اور جاب کا سن کر بس کل اچھی طرح تیار ہوجانا میں کل ہی رشتہ پکا کر آؤں گی۔"

اماں کی بات سن کر میں مسکرا دیا! اگلے دن جب میں اماں کو لے کر اپنی کار میں ماہ نور کے گھر پہنچا تو ان کا گھر نارمل سا تھا مڈل کلاس فیملی سے ماہ نور کا تعلق تھا۔

ماہ نور اور اس کی بہن ماہ رخ بس دو ہی بہنیں تھیں ماہ رخ کی شادی ہو چکی تھی وہ بڑی تھی۔ ماہ نور کے والدین جلد سے جلد اپنے فراض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے انہیں میرا رشتہ اچھا لگا تھا۔ اندر اندر وہ میری انکوائری بھی کروا چکے تھے جبھی جلدی شادی کے لئے مان بھی گئے تھے۔ ماہ نور کو لا کر جب میرے برابر والے صوفے پر بیٹھایا گیا وہ پنک سوٹ میں ملبوس ہلکے سے میک اپ میں کسی پری کی طرح لگ رہی تھی۔ میں تو ماہ نور کی تصویر دیکھ کر ہی اسے پسند کرنے لگا تھا آج تو وہ کسی پری کی طرح جلوہ گر تھی میرے سامنے میں بس نظر چرا کر اس کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔

اماں نے ہم دونوں کا منہ میٹھا کر دیا اور ماہ نور کے ہاتھ میں پیسے رکھ دیئے ماہ کے والد نے بھی میرے ہاتھ میں پیسے رکھے اور جلدی شادی کرنے پر راضی ہو گئے۔ اماں کو بھی جلدی تھی اب تو مجھے بھی جلدی تھی کہ بس ماہ نور جلدی سے میرے بیوی بن کر میرے گھر آ جائے۔ دو مہینوں میں ہی ماہ نور میری بیوی بن کر میرے گھر آ گئی تھی۔

میں ماہ نور کو لے کر پاکستان ٹور پر یعنی ہنی مون کے لئے چلا گیا۔

ماہ نور کا شگفتہ لہجہ اس کی معصوم سی صورت اور پیار بھرا انداز مجھے اس کا دیوانہ بنائے رکھتا تھا۔ وہ سیرت کی بھی اتنی ہی اچھی تھی جتنی صورت کی۔ میری بے پناہ محبت دیکھ کر وہ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے یہ دیکھ کر اماں بھی خوش تھیں ہماری زندگی پہلے سے بھی بہت خوبصورت بن گئی تھی ماہ نور کے آنے سے۔

چند ماہ میں ہی ماہ نور نے خوشی کی نوید سنا دی میں اور اماں تو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے ایک عرصے بعد ہمارے گھر میں ایک ننھا مہمان آنے والا تھا۔ اماں تو دن رات ماہ نور کے آگے پیچھے رہتی اس کا خیال رکھتی تھیں۔ میں بھی دیوانوں کی طرح ماہ نو کر خیال رکھ رہا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ماہ نور کو درد شروع ہو گئی کار میں اور اماں ماہ نور کو ہسپتال لے کر گئے ہم بے چینی سے بچے کی آواز سننے کا انتظار کر رہے تھے۔

جیسے ہی ڈاکٹر لیبر روم سے باہر آئی وہ بہت ڈری اور گھبرائی ہوئی تھی نرسیں اور آیا بھی عجیب نظروں سے میری اور اماں کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ بھی عجیب طرح کا بیہو (Behave) کر رہی تھیں۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ آخر آپ سب اس طرح کیوں بیہو کر رہے ہیں۔ زچہ اور بچہ ٹھیک تو ہیں ناں؟" ڈاکٹر بولی۔

"آپ دونوں میرے ساتھ لیبر روم میں چلیں۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر میں اور اماں لیبر روم میں ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے پہنچ گئے ماہ نور زار و قطار رو رہی تھی اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا جیسے ہی کپڑے میں لپٹے بچے کو میں نے اور اماں نے دیکھا تو ہم گھبرا گئے اماں تو چکرا گئیں، میں نے انہیں سنبھالا اور انہیں کرسی پر بیٹھا دیا، آگے بڑھ کر بڑی ہمت سے میں نے کپڑے میں لپٹے بچے کو دیکھا تو میں حیران اور پریشان تھا، میری آنکھوں سے حیرت اور آنسو دونوں ٹپک رہے تھے۔"

جمیل کی باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہوئے

عبدالقیوم نے حیرت بھرے انداز میں جمیل کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"جمیل میاں آخر بچے میں ایسی کیا بات تھی جو تم اور لیبر روم میں موجود سب کے سب حیرت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے آخر بچے میں ایسا کیا انوکھا پن تھا جو سب ڈرے اور گھبرائے ہوئے تھے۔"

عبدالقیوم کے ہاتھوں کو پکڑ کر روتے ہوئے جمیل بولا۔

"وہ بچہ۔ اس بچے کا دھڑ تو عام بچوں کی طرح تھا مگر اس کا منہ انسانوں جیسا نہیں تھا۔ وہ ایک حرام جانور کا منہ تھا۔ یہ دیکھ کر سب گھبرائے اور ڈرتے ہوئے تھے۔ ماہ نور تو بار بار بے ہوش ہوئے جارہی تھی اماں کا بھی برا حال تھا۔ اب میں نے خود کو سنبھالا، اماں اور ماہ نور کو بھی سنبھالا، بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر اسے چیک کریں۔"

ڈاکٹر نے گھبراتے ہوئے اس کو چیک کیا۔ مگر وہ بچہ مرچکا تھا ڈاکٹر کی تصدیق کے بعد میں نے اس بچے کو سفید چادر میں لپیٹا اور ڈاکٹر سے ماہ نور کا ٹریٹمنٹ کرنے کا کہہ کر اس بچے کو قبرستان میں دفنا کر آ گیا۔ اس حادثے کے بعد میں ماہ نور اور اماں کو سنبھالا اماں کا کہنا تھا کہ "ماہ نور نے پریگننسی کے وقت جانوروں کو دیکھا ہوگا، جبھی ایسا ہوا ہے۔"

اپنے ملنے جلنے والوں کو یہاں تک کہ ماہ نور کی بہن اور والدین سے بھی۔ کہا کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، جبھی اسے فوراً ہی دفنا دیا۔

میں نے اپنی محبت اور احساس خیال سے ماہ نور کو اور اماں کو سنبھال لیا تھا۔ مگر ماہ نور چھپ چھپ کر روتی رہتی تھی۔

چند ماہ بعد ہی پھر ماہ نور ماں بننے والی تھی اس بار اماں اور میں نے ماہ نور کا مزید خیال رکھا اس کے سامنے کوئی ایسا جانور یا کوئی بھی چیز نہ آنے دی جس سے اماں کے خدشات پورے ہوتے۔

پھر ہم ہسپتال جب پہنچے تو اس بار وہی ہوا جس کی ہمیں امید نہ تھی۔ اس بار بچے کا چہرہ تو ہو بہو مجھ پر تھا مگر اس کا دھڑ جانوروں جیسا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر جانوروں کی طرح بال تھے۔ انگلیاں پاؤں سب جانور کی طرح اور وہ بچہ بھی مردہ پیدا ہوا تھا۔

یہ بات پھر سے قیامت کی طرح ہم پر ٹوٹی تھی۔

میں نے پھر ہمت کی اماں اور ماہ نور کو سنبھالا اور اس بچے کو خاموشی سے دفنا دیا۔

میں بری طرح پریشان تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اماں کو تو سنبھال لیا تھا، مگر ماہ نور پاگلوں کی طرح ہوگئی تھی۔ اماں نے کسی بزرگ کے پاس جا کر معلوم کیا تو اس بزرگ نے کہا کہ "کسی نے کالا عمل کیا ہے۔" اماں مجھے اور ماہ نور کو اس بزرگ کے پاس لے کر گئیں۔ ماہ نور نے اپنے دو بچے کھوئے تھے اس لئے وہ اور اماں اس بزرگ کی باتوں میں آ گئیں مجھے ان سب باتوں پر ذرا یقین نہ تھا مگر اماں اور ماہ نور کی خوشی کی خاطر خاموش تھا۔ اس بزرگ فراڈی نے بہت پیسہ مانگا اماں اور ماہ نور کی خاطر میں دیتا گیا۔ کئی بکرے اور دیسی مرغوں کے صدقات کرنے کے بعد اس نے کہا کہ اب پیدا ہونے والا بچہ نارمل ہوگا، اس نے ماہ نور پر کئے گئے کالے علم کا اتار کر دیا ہے۔

میں ابھی پھر سے بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماہ نور کی صحت مزید خراب نہ ہو جائے مگر اماں اور ماہ نور کی خواہش کے سامنے میں نے ہار مان لی۔ اماں اور ماہ نور بہت خوش اور پرامید تھیں کہ اب کی بار انہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ مگر ان دونوں کی امید پھر سے ٹوٹ گئی اس بار بھی میرے گھر پیدا ہونے والا بچہ نارمل انسان نہیں تھا۔ وہ بھی مردہ پیدا ہوا تھا۔

میں نے جس طرح ہمت کی میں لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔ میں بری طرح سے ٹوٹ چکا تھا۔ اب کی بار میں نے اماں اور ماہ نور کو نہیں سنبھالا بلکہ بہت رویا، بہت تڑپا، میر حالت بہت خراب تھی۔ میں نے ماہ نور کو اس کے والدین کے پاس چھوڑا اور خود آفس سے چھٹی لے کر گھر میں آرام کرنے لگا۔ آرام کیا کرتا مزید حالت خراب ہی ہو رہی تھی اماں نے پھر سے عالموں سے معلومات کرنا شروع کر دیا۔

میں بری طرح ٹوٹ چکا تھا کہ آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کس جرم، کس گناہ کی سزا مجھے مل رہی ہے؟ آخر میرے ہی بچے کیوں ایسے پیدا ہو رہے ہیں؟ میں نے تو کبھی کسی کا حق نہیں مارا؟ کسی کے ساتھ برا نہیں

کیا۔ اماں کا سعادت مند لڑکا تھا پھر کیوں ایسا میرے ساتھ ہو رہا ہے؟ سوال اتنے تھے مگر جواب کسی ایک سوال کا بھی نہیں تھا۔

کسی عالم نے اماں سے کہا کہ وہ میری دوسری شادی کر دیں۔ اماں میرے پیچھے لگ گئیں میں ماہ نور سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ بھلا کیسے میں کسی اور سے شادی کر سکتا ہوں ماہ نور چند دن بعد گھر آ گئی تو اماں اس سے خائف رہنے لگیں ماہ نور کو طعنے دینے لگیں، مجھے برا لگتا تھا مگر میں چپ ہو گیا تھا۔ ماہ نور نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"جمیل اگر اماں نے اپنے پوتوں کو کھویا ہے اور آپ نے اپنے بچوں کو کھویا ہے تو میں بھی ماں ہوں نو، نو مہینے تک اپنے اندر رکھا۔ ان کا وجود اپنے وجود میں محسوس کیا ہے۔ میں ماں ہوں، جمیل میں نے بھی اپنے بچوں کو کھویا ہے۔ مجھے نہیں پتا آخر خدا نے مجھے اس طرح کے بچے دے کر کس گناہ کی سزا دی ہے۔ جس طرح آپ ناواقف ہیں اسی طرح میں بھی نہیں جانتی کہ میرے ساتھ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آپ مجھے چھوڑ دیں گے دوسری شادی کر لیں گے اور اگر آپ کے بچے دوسری بیوی سے بھی ایسے ہی ہوئے تو کیا اسے بھی چھوڑ دیں گے۔" ماہ نور مجھ سے بات کر کے زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے اسے گلے لگا کر اسے چپ کروایا اور اس سے کہا۔

"میں دوسری شادی نہیں کر رہا، تم رومت چپ ہو جاؤ ماہ نور میں سب ٹھیک کر دوں گا، یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہو رہا ہے میں یہ جان کر ہی رہوں گا۔"

میں نے اماں کو سمجھایا اور خود اماں اور ماہ نور کو اپنے گھر آرام سے رہنے کا کہہ کر اپنے سوالوں کی تلاش میں نکل گیا، کئی عالموں، عاملوں سے ملا کوئی جواب نہ مل سکا ایسا جو مجھے مطمئن کر سکے، بہت مشکل سے یہاں پہنچا ہوں اب یقین ہے دل کو کہ مجھے میرے سوالوں کا جواب یہاں مل جائے گا۔"

عبدالقیوم کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اپنے آنسو صاف کر کے جمیل کو گلے سے لگا کر بولا۔

"انشاء اللہ حضرت صاحب کے آتے ہی تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔"

جمیل نے بھی اپنے آنسو صاف کر کے کہا۔

"آمین"

☆.....☆.....☆

اگلے روز حضرت صاحب نے آرام کرنے کے بعد اپنے ہجرے میں تلاوت سے فارغ ہوتے ہی عبدالقیوم سے کہا۔

"عبدالقیوم جاؤ اور اس لڑکے کو ہمارے پاس بلا لاؤ۔"

حیرت بھرے انداز میں عبدالقیوم گویا ہوا.....!

"حضرت رات میں تو آپ کسی سے نہیں ملتے تو اس وقت آپ....." حضرت نے مسکرا کر جواب دیا۔

"عبدالقیوم بہت سفر کیا ہے اس نے ہمیں اندازہ ہے اس کی تکلیفوں کا۔ تم جاؤ اور اسے بلا لاؤ۔"

عبدالقیوم فوراً ہی جمیل کے ہمراہ ہجرے میں حاضر ہو گیا۔ جمیل نے ادب سے سلام کیا اور حضرت کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگ گیا کافی دیر رو لینے کے بعد اس نے نظر اٹھا کر حضرت کو دیکھا اور بولا۔

"حضرت میں بہت پریشان اور حیران ہوں کہ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے۔"

حضرت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہمیں سب خبر ہے جمیل۔ عبدالقیوم بھی بہت پریشان ہے تمہاری روداد سن کر ہم سے بہت باتیں کی ہیں عبدالقیوم نے ہم اس وقت کسی سے نہیں ملتے یہ ہماری عبادت کا وقت ہے۔ لیکن تم سے ملنا ضروری تھا کہیں دل برداشت نہ ہو جاؤ ہمیں سب پتا ہے تم نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تمہارے سوالوں کے جوابات ہیں ہمارے پاس، جب ہم ملک صاحب کی حویلی سے آئے، جب سے اپنے علم کے ذریعے تمہارے سوالات کے جوابات تلاش کر رہے تھے، تمہارے تمام سوالات کے جوابات ہمارے پاس ہیں۔"

حضرت کی بات سنتے ہی جمیل ان کے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے بولا۔

"حضرت کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا؟؟ مجھے بتائیں میرے بچے ایسے کیوں پیدا ہوئے؟ کیوں میری

بیوی اور میری اماں نے اتنا دکھ سہا؟ مجھے بتائیں حضرت صاحب مجھے بتائیں کس گناہ کی سزا مل رہی ہے مجھے؟ میں نے تو کسی کا حق نہیں مارا۔ کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔ اپنی اماں اور بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں دونوں کے حقوق پورے کئے پھر بھی ایسا کیوں ہوا۔ کبھی رشوت نہیں لی۔ کبھی غبن نہیں کیا۔ پھر کیوں ایسا ہوا بتائیں مجھے۔"

"بس کرو جمیل بس کرو یہ سب کچھ تمہاری اماں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان کے گناہوں کی سزا ہے اللہ انہیں عبرت دکھا رہا ہے۔"

حضرت صاحب کی بات سن کر جمیل حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حضرت، میری اماں تو بہت سیدھی سادھی عورت ہیں اور بھلا وہ کس گناہ کی مرتکب ہیں جس کی وجہ سے میری اور ماہ نور کی اولاد ایسی پیدا ہو رہی ہے۔"

"جمیل ذرا تحمل رکھو اور صبر سے ہماری بات سنو۔ یہ اس وقت کی بات ہی جب تم بہت چھوٹے تھے تمہاری اماں کا نام نسیم بیگم ہے نا؟"

جمیل نے حیرانگی سے جواب دیا۔

"جی حضرت نسیم بیگم ہی ہے اماں کا نام۔"

حضرت پھر سے گویا ہوئے۔

"جب تم چھوٹے تھے تمہارے والد صاحب کی وفات ہوگئی تھی۔ تو تمہاری ماں نے تمہاری تعلیم و تربیت کس طرح کی یہ جانتے ہو۔ نسیم بیگم نے مردوں کو غسل دینا شروع کیا یہ کام وہ معاوضہ لے کر کرتی تھیں۔ کچھ کالا جادو کرنے والوں نے نسیم بیگم کو پیسے دے کر مردوں کے منہ میں اور ان کے کفن میں تعویذات رکھوانے شروع کر دیئے۔ چند پیسوں کے لالچ میں مردوں کا استعمال کالا جادو کے لئے کیا گیا۔ ان کی روحوں کو اپنے غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنا جادو گروں کے کالے علم کے ذریعے ہوتا ہے جو کہ ہمارے مذہب میں سخت ممانعت ہے۔ کیا کیا عمل کئے جاتے ہیں، پرانی قبروں میں بیٹھ کر اس بات کا ہمیں بخوبی علم ہے۔

تمہاری اماں نے بنا سوچے سمجھے چند روپوں کی خاطر جو کیا ہے۔ یہ وہ کرنی ہے، ان کی نسل آگے نہیں بڑھ سکتی تمہاری شادی کہیں اور بھی کروادی جائے تو بھی ایسی ہی اولادیں پیدا ہوں گی۔ ہاں تمہاری بیوی ماہ نور ایک اچھی لڑکی ہے اسے بھی اپنی ساس کے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔

تمہاری اماں کا انجام اپنے علم کے ذریعے جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے۔

بیٹا نماز قائم کرو پابندی کے ساتھ اور پرہیز گاری اختیار کرو، اللہ سے معافی مانگو ہم تمہارے لئے اللہ سے دعا کریں گے انشاء اللہ تمہاری اولاد نارمل پیدا ہو۔"

جمیل حضرت کی بات سن کر خوب رویا اور بولا

"حضرت صاحب کیا کوئی طریقہ نہیں جس سے اللہ میری اماں کو معاف فرمادے۔"

"نہیں بیٹا ایسے سنگین گناہ کی کوئی معافی نہیں۔ جو انسانوں کو اور مرنے کے بعد مردوں کو بھی استعمال کرے اپنے غلط مقاصد کے لئے اور اللہ کے کاموں میں مداخلت کرے اس کی مخلوق کو اذیت دے شرک کرے ایسے گناہ کو خدا معاف نہیں کرتا، لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں سزا ملتی ہے۔ اگر انسان یہ سوچ لے کہ اپنے غلط کاموں کی سزا وہ دنیا میں بھی بھگتے گا مکافات عمل کے ذریعے اور آخرت میں بھی اس کی کوئی معافی نہیں جو لوگ چند پیسوں کی خاطر ناقابل معافی گناہ کرتے ہیں وہ اپنی دنیا ہی نہیں اپنا آخرت بھی خراب کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

تم دونوں میاں بیوی نماز پابندی سے پڑھو تمہاری مصیبت دور ہو جائے، اللہ تم پر نظر کرم کر دے، اس کے لئے میں اللہ کے آگے گڑگڑاؤں گا۔ مجھے امید ہے میرا دل گواہی دے رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم و کرم کرے گا اور اب جو بچہ پیدا ہوگا وہ نارمل ہوگا۔"

حضرت کی بات سن کر جمیل اور عبدالقیوم نے ایک ساتھ کہا۔ "آمین"۔

پھر حضرت صاحب نے جمیل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیٹھ پر تھپکی دی اور بولے۔ "اب جا کر آرام کرو اور کل اپنے گھر چلے جانا۔ اللہ تم پر رحم و کرم کرے۔"

آدم خور

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

نوجوان کی ٹانگ پر تیز دھار آری جب چلنے لگی تو نوجوان کی دلخراش چیخیں آسمان کو دھلانے لگیں اور وہاں پر موجود سارے لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے کہ پھر.....

ایک پروفیسر کی ہولناک سرگزشت جو کہ آدم خور بونوں..... کے قبیلے میں پھنس گیا تھا

غلطی ابتداء سے ہی ہوگئی تھی، مجھے اپنی پارٹی کے ساتھ ہی بھاگ جانا چاہیے تھا، لیکن بے چارے ناٹو کی دردناک چیخوں نے میرے قدم تھام لیے تھے، سب لوگ مجھے روکتے رہے لیکن میں آواز کی سمت بھاگتا گیا تاکہ غریب لڑکے کو بچا سکوں، اور جب میں نے ان کو دیکھا تو بہت دیر ہو چکی تھی، میں خود ہی منجدھار میں چلا آیا تھا، ایک درجن برہنہ بونے قبائلی میری طرف بڑھ رہے تھے۔

میری نظروں کے سامنے سیاہ غبار سا چھا گیا تھا، سیاہ فام قبائلی نے مجھے کسی چڑیا کی طرح دبوچ لیا تھا اور گھسیٹتے لیے جا رہے تھے، میں بری طرح چیخ رہا تھا، دہشتناک انجام میری نظروں کے سامنے تھا۔ لیکن وہ وحشی قہقہے لگاتے ہوئے مجھے تیزی سے کھینچ رہے تھے۔ پھر انہوں نے جھٹکا دے کر مجھے کھڑا کر دیا اور پھر میری آنکھوں نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔

سیاہ زمین کے بیچوں بیچ ایک گول سا مٹیالا حصہ تھا، جہاں ناٹو کھڑا ہوا تھا، اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ اس حد تک کھلا ہوا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ اب اس کی باچھیں چڑھ جائیں گی اور خون پھوٹ پڑے گا اور وہ سیاہ زمین.....! وہ حرکت کر رہی تھی۔

میں نے زور سے آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا واقعی وہ گول سا حصہ لحہ بہ لحہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پھر آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا۔ اف میرے خدا! یہ تو سیاہ

چیونٹے تھے۔ سیاہ سیلاب کی شکل میں وہ بڑھتے جارہے تھے اور پھر لڑکے کی خوفناک چیخوں نے مجھے لرزا دیا۔ سیاہ سیلاب نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، وہ بے اختیار ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن خونخوار چیونٹے اس کے گوشت سے بری طرح چمٹ رہے تھے اور اپنے زہریلے سوئی جیسے ڈنگ گاڑ کر اس کا خون پی رہے تھے، پانچ منٹ کے اندر اندر وہاں صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی بچا تھا۔ اور چیونٹوں کا سیلاب واپس جارہا تھا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا اور میں دھپ سے زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر میں میرا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔

میرے کانوں میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی۔

"جب تک تم ماٹو گروسو کے علاقے میں ہو گے بالکل محفوظ رہو گے۔ لیکن اس سے باہر مغرب کی طرف جانے کی حماقت نہ کرنا، وہاں ایک بونا قبیلہ رہتا ہے۔ جب بھی کسی سفید فام آدمی نے انہیں دیکھا ہے وہ زندہ نہیں بچا ہے۔"

اور اب میں انہیں دیکھ رہا تھا وہ بالکل برہنہ تھے عورتوں کی ناف کے پاس ایک ڈوری سی بندھی ہوئی تھی جس سے رنگ برنگ پتھروں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں ان کے سفید سفید دانت بالکل نوکیلے اور لمبے لمبے تھے۔

چیونٹوں کے جانے کے بعد وہ سب کے سب ڈھانچے کی طرف بڑھے، ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد ہر قبائلی ایک ایک ہڈی لئے اسے بھنبھوڑ رہا تھا، ان کی ندیدی آنکھیں میری طرف لگی ہوئی تھیں، مجھے اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اب وہ پھر میری طرف بڑھ رہے تھے، ان کے ہاتھ میں گھاس کی بنی ہوئی ایک رسی تھی، انہوں نے اس کا حلقہ سا بنایا اور ایک بونے نے اچک کر میری گردن میں ڈال ڈیا ار سب مل کر اسے گھسیٹنے لگے۔

اور جب وہ رکے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ جنگل میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ میرے حواس بالکل معطل ہو چکے تھے۔ میرے سامنے گھاس کا بنا ہوا گنبد نما جھونپڑا تھا، اس کے ایک طرف گول سا سوراخ تھا۔ انہوں نے مجھے اس سوراخ میں سے اندر دھکیل دیا۔ میں زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میں ہارورڈ یونیورسٹی میں نیچرل ہسٹری کا سال دوم کا طلب علم تھا پلیسٹیر کیو منگو نہیں بلکہ خوف و دہشت سے لرزتا ہوا گوشت پوست کا ایک ڈھیر تھا، جو اس فکر میں گرفتار تھا کہ اسے کس طریقے سے ختم کیا جائے گا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ کون تھے، انہوں نے کبھی آگ محبت، چاقو یا رحم کے الفاظ نہیں سنے تھے، ان کا دماغ بندر اور پتھر کے زمانے کے انسان کے دماغ کی بیچ کی شکل کا تھا، وہ گوشت اور ہڈیاں کھاتے تھے اور بغیر پکائے ہوئے۔

بیرونی دنیا کی طرف سے کچھ پادریوں کو اس علاقے میں بھیجا گیا تھا کہ وہ انہیں انسان بنائیں لیکن یہ بونے ان کا گوشت کھا گئے اور ہڈیاں لے جا کر دریائے کورنڈا میں پھینک دی تھی تا کہ باہر کے لوگوں کو ان کا حشر معلوم ہو جائے۔

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا سو گیا۔

ایک عجیب سی آواز نے مجھے جگا دیا، میں نے آواز کی سمت کان لگا دیئے..... دھپ..... سرسر..... دھپ..... سرسر جیسے کوئی زخمی چمگادڑ، اذیت میں اپنے پر پھڑ پھڑا رہی ہو وہ کوئی بھی شے تھی، میں نے بڑی مشکل سے اس سوراخ سے باہر جھانکا، دن نکل آیا تھا۔

ایک بونے نے اپنا سر سوراخ میں ڈالا اور اپنے نیزے سے مجھے اٹھ کر باہر آنے کا اشارہ کیا، میں رینگتا ہوا سوراخ کی طرف بڑھا، میرا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا تھا اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔

سوراخ سے باہر نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا دم رکنے لگا، ایک دیو نما کیکڑے کی طرح کی شے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا، کبھی وہ سفید فام آدمی رہا ہوگا۔ مگر اب؟

اس کے برہنہ جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا، سینے اور پیٹ پر بڑے بڑے سفید بالوں کی ایک سفید چادر سی تھی۔ ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور گھٹنے کے پاس سے ٹانگ کا بقیہ حصہ بائیں طرف کو اس طرح مڑ گیا تھا جیسے پتائی کی ایک ٹانگ ہو۔ چلتے وقت وہ اسے گھسیٹتا تھا۔ اسی لیے وہ حیرت انگیز آواز پیدا ہوئی تھی۔

پیشانی سے اوپر اس کے سر پر ایک گہرا زخم تھا، جیسے کھوپڑی دو ٹکڑوں میں منقسم ہو کر آپ ہی آپ جڑ گئی ہو اتنے زخموں کے بعد اور طبی امداد کے بغیر بھی وہ زندہ بچ گیا تھا، اس کی آنکھیں بالکل ویران ویران لگ رہی تھیں۔

میرے ذہن میں کچھ ہلچل سی ہو رہی تھی، جیسے کوئی چیز نیچے سے اوپر آنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر سکون ہو گیا، ذہن کے پردے پر میرے بچپن کا ایک منظر نظر آرہا تھا، روز ویلت فیلڈ سے ایک جہاز کی پرواز کا سین۔

"ریمسے!" میں نے احمقوں کی طرح چلا کر کہا۔"

ڈاکٹر مارک ریمسے، ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ مر چکے ہیں۔"

پھر ہلچل ہوئی اور نوجوان ڈاکٹر ریمسے کا چہرہ میرے سامنے آیا، کتنا ہینڈسم نوجوان تھا، سب اسے فلائنگ ڈاکٹر کہتے تھے، اس کے پاس ایک انجن والا طیارہ تھا، اور اس کا زیادہ تر وقت پرواز میں گزرتا تھا، ایک دفعہ جب وہ برازیل کے جنگلات کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ طیارہ کہیں ٹکرا گیا اور پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ یہ کوئی پچیس سال پہلے کی بات تھی۔

اور اب وہ میرے سامنے تھا، کاش میں اسے نہ دیکھتا۔

اس کی گردن کے گرد ایک سانپ لپٹا ہوا تھا۔

اس نے اسے نکال کر نیچے ڈال دیا اور میری طرف بڑھا، اور منہ کھولا، اس کے سارے دانت غائب تھے، پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نما آواز نکلی جسے آواز بھی کہنا زیادتی ہے۔

"کبھی کبھی مجھے اتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ میں....."

کچھ دیر کے لئے اس کی حالت بدل گئی اور وہ کچھ عجیب الفاظ بڑبڑانے لگا جیسے کوئی گیت گا رہا ہو، ایک یا دو منٹ کے بعد پھر وہ ہوش میں آ گیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی یہی حالت رہتی ہے۔ کبھی وہ بالکل پاگل سا ہو جاتا ہے کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"تمہارا کام ابھی شروع ہوگا۔" اس نے شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا۔ لیکن میں کیا سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟

"وہ تمہیں ابھی زندگی رکھیں گے۔ تم ان کے لیے بہت اہم ہو۔" ایک بونی عورت ہمارے قریب سے گزری اس کے جسم پر کپڑے کا نام و نشان تک نہ تھا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر اسے دیکھ کر مجھے گھورا اور جب اس نے پہلے جملوں کی وضاحت کی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے دوسرے قبیلوں سے لڑائیوں میں بونوں کا بہت جانی نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ان کے یہاں پیدائش کی شرح بہت گر گئی تھی، اور جب کبھی ایسا ہوتا تھا تو ان کے یہاں روایت تھی کہ وہ کسی سفید فام آدمی کا گوشت عورتوں کو کھلاتے تھے لیکن اس آدمی کو مار کر نہیں بلکہ روزانہ اس کے جسم سے ایک ٹکڑا علیحدہ کیا جاتا تھا۔ ایک ایک بوٹی ہر عورت کو دی جاتی تھی اور جب تک اس آدمی میں جان باقی رہتی یہی عمل دہرایا جاتا۔

چند روز تک تو ان کا رویہ اس طرح رہا جیسے قربانی کے بکرے کے ساتھ اس کے مالکوں کا ہوتا ہے، وہ مجھے دن میں کئی بار بہت سا کھانا دیتے جو کبھی کچے گوشت اور درختوں کی جڑوں سے بنائے گئے لیس دار آمیزے پر مشتمل ہوتا تھا۔

میرے کپڑے اتار لیے گئے۔ اور انہیں تار تار کر دیا گیا، اور اب مجھے بھی برہنہ ہو کر گھومنا پڑتا تھا۔

اس دوران میں، جادوگر ڈاکٹر سے گفتگو کرنے کے کئی مواقع ملے، جب بھی وہ ہوش میں ہوتا تو مجھے بہت سی باتیں بتاتا۔ ایک روز اس نے مجھے موت کے تعویذ کے بارے میں بتایا، جس نے ان قبائلیوں کو خدا بنا دیا تھا۔

دراصل یہ ایک پرانا اعشاریہ چار کا ریوالور تھا اس کا فیتا تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے گھاس کی بنی ہوئی رسیوں کی مدد سے اسے اپنی کمر کے گرد لٹکا رکھا تھا وہ اسے تیل دیتا رہتا تھا، اسی وجہ سے وہ ابھی تک اچھی حالت میں تھا۔ وہ شیطانی انداز میں ہنستے ہوئے بتاتا۔

"اس رات کو جب میرا جہاز یہاں گرا تو وہ اسے کوئی آسمانی شے سمجھے ہوں گے، جہاز کے پروں میں آگ لگی ہوئی تھی اور انجن بے حد شور کر رہا تھا، جہاز جہاں گرا تھا، وہیں ان کے پادری کی جھونپڑی تھی۔ میں جب جہاز میں سے نکلا تو خون میں نہایا ہوا تھا۔"

اس نے برا سا منہ بنایا، واقعی اس وقت اس کی حالت بڑی دگرگوں ہوگی۔ ٹانگ ٹوٹی ہوئی اور چیختی ہوئی۔

”یہ بدبخت میری طرف بڑھنے لگے۔ مجھ میں بس اتنی سمجھ باقی رہ گئی تھی کہ اس ریوالور سے فائدہ اٹھا سکوں۔“
اس نے ریوالور کو تھپکی دی۔

میں نے ان کے سردار کا سر اڑایا تو وہ مسحور سے ہو گئے اور مجھے اٹھا کر ایک جھونپڑی میں لے گئے۔ جہاں میں تین ہفتے تک پڑا رہا۔ عورتوں نے مجھے اپنا دودھ پلایا یہاں تک کہ میں گوشت ہضم کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ان کا سفید دیوتا بن چکا تھا..........ہا..........ہا“ وہ بری طرح سر ہلانے لگا۔

”لنگڑا، اور دیوانہ خدا جس کے پاس صرف دو گولیاں بچی ہیں۔“

اس کا اندازہ بڑا مضحکہ خیز تھا۔“ دو گولیاں اور چٹخی ہوئی کھوپڑی، اب جو نئی نسل ہے، وہ باغی ہوتی جا رہی ہے جب میں نے گولی چلائی تھی تو یہ لوگ موجود نہیں تھے، اس لیے اس کہانی پر انہیں یقین نہیں آتا۔ بہرحال میں نے اس کا علاج سوچ لیا ہے۔ پہلی گولی اس کے لیے جو سب سے پہلے میری طرف بڑھے گا اور دوسری۔“ اس نے پھر ریوالور کو تھپکا۔ اس پر پھر دورہ پڑا، وہ واقعی بہت بہادر تھا، آدھے دماغ اور ڈھانچے نما جسم کے ساتھ اس نے پچیس سال قبل تک ان قاتل قبائلیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میری باری کب آئے گی؟

مجھے زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرنا پڑا، قید کے کوئی دو ہفتے بعد وہ خونی کھیل شروع ہو گیا، ایک دن صبح جب میں اٹھا تو میرا سارا جسم رسیوں سے جکڑا ہوا تھا، دن بھر میں اسی طرح پڑا انتظار کی ناقابل بیان اذیت کو برداشت کرتا رہا۔ دوپہر کو ایک عورت آ کر میرے حلق میں لیسدار شے ٹپکا گئی۔ شام ہوئی تو مجھے میدان میں لے جایا گیا، ایک گول دائرہ سا بنا ہوا تھا، جس کے چاروں طرف عورتیں بیٹھی تھیں۔

درمیان میں ایک نسبتاً اونچی جگہ پر کئی کھونٹے سے گڑے ہوئے تھے۔ قبائلی مجھے اٹھائے ہوئے گھیرے کے درمیان میں پہنچے تو عورتیں بھوکی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگیں، اب مجھے اس اونچی جگہ پر ڈال دیا گیا تھا اور قبائلی میرے جسم کے گرد بندھی ہوئی رسیوں کو کھول کر انہیں کھونٹوں پر سے گزار کر دوبارہ باندھ رہے تھے، تاکہ میں بالکل نہ ہل سکوں۔

جب رسیاں بندھ گئیں، تو ایک بوڑھی کریہہ المنظر عورت آگے بڑھی، اس کے ہاتھ میں بہت پتلی سی ڈوری تھی میں بغیر پلک جھپکائے اسے دیکھتا رہا، وہ میرے قریب آئی اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی، پہلے اس نے جھک کر میری ران پر ہاتھ پھیرا اور خوش ہو کر باقی عورتوں کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں کی حریصانہ چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑھیا نے ڈوری کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تان لیا اور میری پنڈلی پر بیٹھ کر ڈوری کو آرے کی طرح میری ران پر چلانا شروع کر دیا۔ درد کی شدت سے میری چیخیں نکلنے لگیں، اس کے ہاتھ اور تیز چلنے لگے۔ میں بے اختیار اپنی ٹانگ ہلانے کی کوشش کرتا اور وہ بڑھیا اپنا عمل تیز کر دی جاتی۔

خون کا فوارہ سا چھوٹا۔ میری کھال اور گوشت کٹ چکا تھا۔ بڑھیا نے ہاتھ روک کر سر جھکایا اور زخم سے خون چاٹنا شروع کر دیا، نہ جانے اس کی زبان میں کیا تھا کہ میرے زخم میں مرچیں سی لگنے لگیں اور میں بے اختیار رونے لگا، بڑھیا نے اب اس زخم سے چند انچ نیچے دوسری جگہ پھر وہی آرا چلانا شروع کیا۔ پھر وہی تکلیف شروع ہوئی جو کہ اب دوچند ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نئے زخم سے خون بہنے لگا اور بڑھیا نے پھر ہاتھ روک کر اسے چاٹنا شروع کر دیا، اس کے بعد کیا ہوا میں کس طرح بتاؤں، اس اذیت، اس دکھ، اس تکلیف کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ بڑھیا نے پہلے والے زخم کے پاس سے گوشت اٹھایا اور اسے ادھیڑنا شروع کر دیا۔ جب تک دونوں زخموں کا درمیانی پارچہ ادھیڑ کر الگ ہو گا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی مجھے ہوش آ گیا، بڑھیا ہر عورت کو ایک ایک بوٹی بانٹتے ہوئے آخری عورت کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ سب قہقہے لگاتی ہوئی اسے مزے لے لے کر کھا رہی تھیں۔

جب گوشت کا آخری ٹکڑا بھی کھا لیا گیا تو اب انہوں نے میری طرف توجہ دی، بڑھیا پھر میرے قریب آئی، اس کے ہاتھ میں پیالہ تھا، اس میں کوئی عرق سا تھا، جو اس نے میرے زخم پر ڈال دیا۔ زخم میں سے اتنی شدید ٹیس اٹھی کہ میرا سر گھوم گیا، لیکن اس کے بعد وہ حصہ تقریباً سن سا ہو گیا۔ دوسرے دن دوسری ران کے ساتھ یہی عمل دہرایا گیا۔ تیسرے دن دائیں ہاتھ کی باری آئی، اب نیند میری

آنکھوں سے بالکل غائب ہو چکی تھی، رات بھر میں تکلیف سے تڑپتا رہتا۔ رات کو میری رسیاں کھول دی جاتی تھیں۔

چوتھے دن تو رسیاں باندھنے کی بھی تکلیف نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بڑھیا نے میرے بائیں ہاتھ پر اپنا آرا چلایا تو میں کئی کئی انچ اوپر اچھلا، اور اس سے جو ناقابل بیان تکلیف مجھے ہوئی، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا، اب بھی جب مجھے وہ کیفیت یاد آتی ہے تو میں اسی طرح بے ساختہ اچھل پڑتا ہوں۔

اب میں دن رات عالم غنودگی میں رہنے لگا تھا، مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ کب مجھے اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ جب گوشت کاٹا جاتا تب ہوش آتا، اور پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو جاتا۔

تب ایک دن میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو دیکھا میری ٹانگوں اور ہاتھوں کا تقریباً سارا گوشت ادھڑ چکا تھا مجھے حیرت تو اس بات پر تھی کہ میں اب تک کیسے زندہ تھا۔ زخموں پر مٹی جمی ہوئی تھی اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، بخار سے میرا جسم بھن رہا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ چونکہ چاند آخری تاریخوں میں ہے اس لیے یہ عمل روک دیا گیا ہے۔ اب جب چاند پھر نکلے گا تو یہ عمل پھر شروع ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار میں زندہ نہیں بچوں گا۔ چھوٹے چھوٹے کنکر میرے زخموں میں بری طرح چبھ رہے تھے۔ یہ مٹی تو میرے زخموں کو سڑا دے گی اور میں مقررہ مدت سے پہلے ہی مر جاؤں گا، یہ سوچ کر میں جھونپڑی سے گھسٹتا ہوا باہر نکلا، میرا رخ دریائے کورنڈا کی طرف تھا۔

تکلیف کی وجہ سے میں انچ انچ گھسٹ رہا تھا، تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے اپنے پیچھے کچھ آہٹ سی سنائی دی۔ نیزہ لیے ہوئے ایک بونا میرے ساتھ تھا۔ اوہو! تو میری نگرانی ہو رہی تھی۔

میں کافی دیر تک پیٹھ کے بل گھسٹنے کے بعد دریا تک پہنچ پایا، اور کنارے پر لیٹ کر ذرا سا نیچے کھسکا۔ اب میرا جسم پانی کی زد میں تھا۔ بخار میں تپتا ہوا جسم جیسے برف میں رکھ دیا گیا ہو، مجھے اتنا سکون ملا کہ میری طاقت واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابھی میں پانی سے نکل کر باہر آیا ہی تھا کہ مجھے دور سے جادوگر ڈاکٹر آتا نظر آیا۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے جب میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کا رنگ پہلی بار نظر آیا نیلی نیلی آنکھیں آج دھلی دھلی لگ رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے ریوالور کی نال اس نگراں کی طرف گھما کر اسے دور جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دور ہٹ گیا تو ڈاکٹر میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”میرے بچے! تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے، مجھے تمہارے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تمہیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے، ورنہ دو تین روز بعد تمہارا گوشت پھر کاٹا جائے گا اور اب کے تمہارے سینے کی باری ہے، مجھے امید نہیں کہ اس کے بعد تم زندہ بچو گے اور تم ابھی جوان ہو۔“

میری سمجھ میں ایک جملہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر تو پاگل ہے، بھلا یہاں سے کون بچ سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر دھیرے دھیرے بولے جا رہا تھا۔

”سامنے جو گھنا سا درخت ہے، اس کے پیچھے کشتی موجود ہے۔ میری زندگی تو ختم ہو چکی ہے تم اس میں لیٹ جاؤ، دریا پار پہنچ جاؤ، یہ بونے دریا پار جانے کی ہمت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں انہیں دیکھتے ہی گولی مار دی جاتی ہے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور درخت کی طرف لے جانے لگا، ادھر نگراں یہ دیکھ کر ہماری طرف آنے لگا، ڈاکٹر نے فوراً ریوالور کمر سے نکالا اور بونے کے سر کا نشانہ لیا، اس کا سر یوں غائب ہو گیا جیسے تھا ہی نہیں۔

” بھاگو بے وقوف جلدی سے! ورنہ بونے آ جائیں گے۔“ ڈاکٹر خرخراتی آواز میں چیخا۔

میں گھبرا کر تیزی سے ایک چھلانگ میں درخت کے پیچھے پہنچا اور ایک کشتی میں الٹ گیا، کشتی پانی پر بہنے لگی۔

کنارے پر سے گولی چلنے کی آواز آئی، آخری گولی کی آواز، اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب میں ہوش میں آیا تو ہسپتال میں پڑا تھا زخم بھرنے اور چلنے پھرنے کی طاقت آنے میں ایک سال لگ گیا۔

انجام

مہر پرویز احمد دولو-میاں چنوں

درد ناک داستان سن کر بابا جی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور پھر گویا ہوئے ظالم ایک دن ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا حق کا سورج طلوع ہوگا اور پھر ظالم اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

اکثر خود غرضی اور مطلب پرستی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے.....تحیر انگیز کہانی

ہمارے ہاں یہ اقوال زریں بہت مشہور ہے کہ "برے آدمی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا بلکہ وہ اپنی چال، افعال، گفتار اور طرز زندگی سے پہچانا جاتا ہے۔"

پگ کی لاج اور نسل کی بقا کے لئے ریاض کی شادی تیز طرار، تند و تیز لہجے اور گھناؤنے کردار کی مالکہ شازیہ سے کر دی گئی۔

شازیہ بچپن سے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھنے تک بہت سے معاشقے پال چکی تھی۔ چاہنے والوں سے زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتے کھاتے اس کی زبان گھس چکی تھی، مگر قرعہ فال ریاض کے نام نکلا سیدھا سادا نوجوان تھا۔ شادی ہوتے ہی روزی روٹی کے لالے پڑ گئے، تھوری بہت اراضی تھی جس سے بڑی مشکل سے یہ خاندان گزارا کر رہا تھا۔

دوستوں کی مہربانی سے شازیہ ناز و نعم کی سیڑھیوں پر ہرنی کی طرح پاؤں دھرتی، منزل مقصود پر پہنچی تھی۔

شروع میں تو اس نے ریاض کو اہمیت نہ دی لیکن کچھ ہمدرد دوستوں اور رشتے داروں کے سمجھانے پر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

مزدوری کے بہانے ریاض کو گھر سے نکال دیتی جب کہ دوست احباب گھر میں محفلیں جماتے۔ ریاض کو گھر واپس آنے پر حالات سے آگاہی ہوتی۔ مگر وہ سر دردی لینے والی سوجھ بوجھ سے عاری تھا یا جان بوجھ کر خاموش ہو جاتا۔

وقت کی گاڑی آہستہ آہستہ منزل کی طرف گامزن تھی، شازیہ ریاض کے رویے سے بہت خوش تھی۔ کیونکہ وہ اس کے کسی قول و فعل میں دخل نہ دیتا تھا۔

جو دوست چاہت کی کڑاہی میں جل رہے تھے، ان کے دل بھی سازوں کی صورت بجنے لگے جب ریاض کسی بات پر بولتا ہی نہ تھا تو ایک چاہنے والے نے ارمانوں کو یوں زبان دی۔

"شازیہ.....! اب میں تیرے بن سانس لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تیرے بن جینا سزا لگتا ہے تجھ پر سب کچھ نچھاور کر چکا ہوں۔

ایسا کریں ریاض کی جو تھوڑی بہت زمین ہے وہ فروخت کر دو، ہم دو رافق پار اپنی محبت کی دنیا بسانے کے لئے کٹیا بنا لیں گے۔ ریاض تو تمہارا نوکر دکھائی دیتا ہے تم جنت کی حور وہ جنگل کا لنگور، تم محلوں کی رانی لگتی ہو، اس کچی اینٹوں کی گارے سے لپی دیواروں والی جھونپڑی میں کب اچھی لگتی ہو۔ خانہ بدوشوں کی سی حالت میں دیکھ کر میرا دل بہت کڑھتا ہے۔ میں راتوں کو انگاروں پہ لوٹتا ہوں۔

کچھ پیسوں کا میں بندوبست کرتا ہوں۔

"ریاض کو زمین بیچنے پر آمادہ کرو اگر وہ نہ مانے تو پھر اس کا مستقل حل تلاش کریں گے۔" شازیہ نے یہ اسکیم جب ماں کے آگے رکھی تو اس نے خوب لتاڑا۔

"عقلمند لڑکیاں دوستوں سے پیسے وصول کرتی ہیں اور تم زمین بیچ کر اس کو کھلانا چاہتی ہو۔ تمہاری مت ماری گئی ہے ایسے دوستوں کو چلتا کرو ریاض قطعاً زمین نہیں بیچے گا اور

اگر ایسا ہو جائے تو کیا تمہارا چاہنے والا تم کو اتنی عزت اور مقام دے گا جو تم کو ریاض دے رہا ہے۔"

☆.....☆.....☆

اب کی بار جو الیکشن کی وبا پھیلی تو ایک دن اسمبلی امیدوار کی طرف سے پورے علاقے کے دیہاتوں میں اعلان کروایا گیا کہ فلاں دن فلاں مقام پر بابا جوتی شاہ اپنے مریدین کو زیارت کروائیں گے۔ ان کے تمام مریدوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مقررہ دن مقررہ مقام پر اپنے پیر و مرشد کی زیارت کر کے ایمان تازہ کرنے اور ان کا نورانی وجدانی بیان سننے کے لئے تشریف لائیں۔

متعلقہ دن بابا جی نے تمام مریدین کو زیارت کروانے کے بعد متعلقہ امیدوار کو ووٹ دینے کی تلقین کی، اس کی اور پارٹی کی خوبیوں کے انبار لگا دیئے۔ جب کہ مخالف امیدوار اور اس کی پارٹی کو غدار وطن اور ایمان دشمنی قرار دیا۔

اگلے ہفتے دوسرے حلقے کے امیدوار کی طرف سے ایک بار پھر بابا جوتی شاہ کے حکم پر پہلے والے گراؤنڈ میں جمع ہونے کا حکم صادر کیا گیا۔

پہلے والے گراؤنڈ میں اس لئے اجتماع کیا گیا کہ وہ دونوں حلقوں کے درمیان خالی گراؤنڈ تھا۔

اب کی بار بابا نے پہلی پارٹی جس کی پچھلے ہفتے قصیدے گائے تھے، کو ملک و قوم کے لے خطرناک ناسور قرار دیا، جب کہ دوسری پارٹی جو پچیس سالوں سے اقتدار میں تھی اس کی شان میں زمین آسمان ایک کر دیا۔

مریدین زیارت کر کے اور وعظ نصیحت سن کر بابا جی کی عظمت پر عش عش کر اٹھے بابا جی کی اسلام دوستی مریدین دوستی کو ولی اللہ کی نشانی قرار دیا۔

بابا جی مریدوں اور امیدواروں کے دکھ پر بڑی مشکل سے مصروف زندگی سے وقت نکال کر تشریف لائے تھے۔

لوگوں کے مسائل کے حل اور اسلام کی ترقی کے لئے فرشتہ سیرت امیدواروں کو ووٹ دینے کی تلقین نے مریدین کے دل جیت لئے۔

ایسے لوگوں کے لئے ووٹ مانگ رہے تھے جو اسمبلی ہال جا کر عوام اور اسلام کی خدمت کریں گے۔

بابا جی نے فراخدلی کا مظاہر کرتے ہوئے امیدواروں کے لئے اس واسطے وقت نکالا تھا کہ ان لوگوں نے بابا جی کے آستانہ کی تزئین و آرائش کے لئے خطیر رقم بطور نذرانہ پیش کی۔

بابا جی نے اپنے قیمتی وقت کی قیمت ایک امیدوار

سے لاکھ روپے مانگی، لیکن اپنے مرید خاص کے مجبور کرنے پر اسی ہزار پر بات پکی ہوگئی۔

بابا جی بھی قول کے پکے نکلے، جلسے والے دن دو فر لانگ کے فاصلے کے پیجیرو کے پیٹرول کی مد میں دس ہزار لئے، پانچ ہزار ڈرائیور کو دلوائے جب کہ پانچ ہزار جلسے کی تاریخ یاد دلوانے والے پرسنل سیکریٹری کو دلوائے۔ دوسرے امیدوار سے بھی اسی ہزار کی جگہ لاکھ روپے ایسے ہی پورے کئے۔

بابا جی کا ریٹ کا جب امیدواروں کو پتہ چلا تو ایک امیدوار نے دو لاکھ میں بابا جی کو بک کرلیا، اس کے مخالف امیدوار کو پتہ چلا تو اس نے بولی بڑھا کر تین لاکھ کردی۔

ایک لاکھ بڑھنے پر بابا جی خوش بھی ہوئے اور غمگین بھی۔

خوشی اس بات کی کہ لاکھ روپے زیادہ مل رہے ہیں اور غم اس بات کا کہ دو لاکھ والے کو کیا جواب دوں۔

اور پھر بابا جی نے حکمت عملی سے سانپ بھی مار لیا اور لٹھ بھی بچالیا۔

"مجھے رات کو بزرگ خواب میں آئے ہیں، انہوں نے تمہاری حمایت کرنے سے سختی سے منع کیا ہے، اس لئے معذرت خواہ ہوں۔"

دو لاکھ والے امیدوار کو یوں کورا جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

حضور شام نگر کے ایم این اے کے امیدوار آئے ہیں۔ آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں میں ڈیوڑھی پر خادم کو پیغام دے آیا۔

امیدوار کی آمد کی اطلاع پاتے ہی بابا جی نیند سے یوں بیدار ہوئے جیسے انہیں لال سانپ کھانے والے بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔

سب سے پہلے شیو بنا کر چہرہ خوبصورت بنایا، بڑھی شیو کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے داڑھی رکھی ہو، غسل کیا صاف ستھرے کپڑے پہن کر پرفیوم سے مہکایا سر پر سفید پگ اور درمیان میں سبز عمامہ سجایا، حقہ تھامے ایک مرید آگے چل رہا تھا جیسے اونٹ کی مہار تھامے ساربان۔

بڑی چاہ و چشم اور رعب و دبدبے کے ساتھ آستانے پر تشریف لائے، ہم نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

متعلقہ امیدوار نہ صرف احترام کے لئے اٹھ کر آم کی شاخ کی طرح جھک گیا بلکہ جڑی بوٹی کی طرح پاؤں سے لپٹ گیا اور چوم چوم کر ان پر لگی گرد و غبار کو صاف کردیا۔

ان خرافات سے فارغ ہو کر الیکشن میں حمایت کے لئے التجا کرنے لگا ساتھ ہی ملازم کو حکم دیا کہ گاڑی میں رکھے تحائف سے بھرے بیگ لاؤ۔

تحائف کے ساتھ لاکھ لاکھ والی دس نوٹوں کی گڈیاں بابا جی کے حضور پیش کیں صرف دس نوٹوں کی گڈیاں دیکھتے ہی حضور کی آنکھوں سے نکلنے والے شرارے بھڑک کر شعلوں میں بدل گئے۔

"تمہارا مخالف امیدوار تیس لاکھ روپے کل دے کر حمایت کے لئے ترلے کر رہا تھا۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا، شاید یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس سے بات فائنل نہ ہو سکی اور تم نے میرے ضمیر کی قیمت صرف دو لاکھ تحائف اور دس لاکھ نقد لگا رہے ہو ایسے خوش قسمت لمحات زندگی میں بار بار نہیں آتے۔

تیس لاکھ روپے سے ایک پائی بھی کم نہ لوں گا ورنہ وہ بھی اس لئے کہ تم چار ضلعے دور سے آئے ہو، ورنہ پچاس لاکھ سے کم پر بات پکی نہ ہوتی۔

اگر دل مانے، جیب اجازت دے تو بات پکی ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

یہ کلمات فرماتے ہی گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

امیدوار کے ہوش ٹھکانے آگئے، تیس لاکھ کی خطیر رقم اوپر سے بابا جی کی بے اعتنائی اسمبلی ہال کی رعنائیاں اور شان و شوکت۔

آنکھوں کے آگے خوابوں کی تعبیریں دل میں ہلچل مچانے لگیں۔

امیدوار میری خوشامد اور منت کرنے لگا، اس کی میری بحث اور سودا بازی شروع ہوئی اور آخر کار بیس لاکھ پر بات فائنل ہوگئی۔ پندرہ لاکھ ان کے پاس نقد تھے جب کہ پانچ لاکھ جلسے والے دن دینے کا وعدہ کیا۔

میں ایک بار پھر ڈیوڑھی پر دستک دے رہا تھا۔ بابا جی یوں نمودار جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ جب بیس لاکھ کی بات کی تو ایک بار پھر بھڑکے۔

"بابا جی کس نے آپ کو تیس لاکھ دیئے تھے۔ آپ نے اتنا بڑا جھوٹ بولا کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا اور دل دھڑکنے لگا کہ اگر تصدیق ہوگئی تو آپ کی عزت مریدوں کی نگاہوں میں کیا رہ جائے گی، مگر آپ تو اب بھی اسی جھوٹ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ میں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوتا ہوں ہمیں تو تیس ہزار بھی کسی نے نہیں دیئے۔ میں نے بابا جی کو حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

"بیٹا! یہاں جھوٹ سچ کی تصدیق کون کرتا ہے، یہی تو ہمارے کمائی کے دن ہوتے ہیں جو پانچ سال بعد نصیب ہوتے ہیں، مریدوں کو جس دن عقل آگئی اس دن ہماری بدقسمتی کے دن شروع ہو جائیں گے، ہم لوگوں کو اینٹوں کے بھٹوں پر اینٹیں بنانی پڑیں گی، ہم تمام پیروں کی بھرپور کوشش ہے کہ مرید، پیری مریدی کے جال میں پھنسے رہیں، ان کی آزادی کا مطلب ہے ہمارا بھوکا ہونا، جہالت سے جتنا ہو سکے فائدہ اٹھائیں۔ ہم تو شراب پی کر غنودگی کی حالت میں ہوں تو مرید پاؤں نہیں چھوڑتے کہ یہ بابا جی کا وجد کا وقت ہے اس وقت ان کی نظر کرم سے ہر آس امید خواہش اور منت پوری ہوگی۔

ہمیں اپنی خبر نہیں ہوتی یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام سمجھتے ہیں، اور یہ امیدوار یہ بھی سونے پہ سہاگہ ہیں، یہ عوام کے لئے نہیں اپنے مفاد کے لئے اسمبلی ہال کا انتخاب کرتے ہیں، سیاست ان بڑے لوگوں کے لئے مختص ہیں اے سی گاڑی، اے سی گھر اور اے سی اسمبلی ہال۔

یہ پانچ سال بعد قابو میں آتے ہیں۔ جس دین اور عوام خدمت کے نام پر ووٹ لیتے ہیں، عوام کو سرکاری ہسپتالوں میں ڈسپرین کی گولی نہیں ملتیں، ان کا علاج لندن اور امریکہ ڈالروں کے عوض ہوتا ہے، غریب پرور، غریبوں کے ہمدرد کروڑوں کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں غریبوں کو ٹکوں کی بنی جھونپڑی نصیب نہیں ہوتی، عوام کے گھروں میں بجلی آتی نہیں اور ان کے محلوں سے جاتی نہیں۔ ایک ماہ کا جاگنا پانچ سال سو کر گزارتے ہیں اور عوام سالوں جاگتے ہیں۔

عوام کی غربت اور مسائل میں اضافہ ہوتا ہے ان کی گاڑیوں، فیکٹریوں، بنگلوں اور جائدادوں میں اضافہ ہوتا ہے، عوام دس بیس ہزار بینک سے قرض لیں تو واپسی دیر سے کرنے پر گھر بار، جانور، فصل زمین تک نیلام کردی جاتی ہے یہ کروڑوں، اربوں روپے لیں تو ان کو معاف کردیا جاتا ہے، عوام ناجائز موٹر سائیکل چالان پر بحث کریں تو حوالدار کار سرکار میں مداخلت کا پرچہ کٹواتا ہے، یہ جلوسوں، تقریروں، میں عدالتوں کے معزز جج صاحبان کو جو مرضی کہیں اور پھر یہ کہہ دیں گر ہم اپنے جاپ کو عدالت کے رحم و کرم والے وہ جراثیم ہیں جن کی افزائش کے لئے سائنسدان بھی کوشاں ہیں آج تک ان کو نتھ ڈالنے والا اس دھرتی پر نہیں آیا۔

اگر تھوڑا بہت حزب اختلاف کے طور پر عرصہ کاٹنے پڑے تو اگلے پانچ بعد اقتدار کا چارج سنبھالتے ہی قبروں میں پڑے مخالفین کے ڈھانچوں سے بھی انتقام لیتے ہیں۔

بہر حال اگر تم نے بات پکی کردی ہے تو میں تمہارے فیصلے کو رد نہیں کرتا، پیسے ہیں تو تھوڑے لیکن چلو کوئی بات نہیں کسی اور طریقے سے پورے کرنے کی کوشش کرے گے۔"

☆.....☆.....☆

"حضرات ایک ضروری اعلان سنیں! حضور قبلہ گھوپے شاہ دس تاریخ کو گاؤں شمالی کے پاس کھلے گراؤنڈ میں آکر کچہری لگائیں گے۔

زیارت کے خواہشمند مریدین اور دیگر علاقے کے تمام معززین جوق در جوق تشریف لاکر جذبہ ایمانی کا مظاہرہ کریں حضور کا نورانی وجدانی بیان سن کر اپنی آخرت کو سنواریں۔

متعلقہ دن میدان اور ارد گرد کی خالی اور فصل والی زمین میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مریدین سائیکل، موٹر سائیکل، بیل گاڑی، گدھا گاڑی، اور ٹریکٹر، ٹرالیوں میں جوق در جوق آکر اپنے آپ کو سچا اور پکا مرید ثابت کرتے نظر آئے۔

متعلقہ امیدوار بابا کے استقبال کے لئے لمبی چوڑی گاڑیوں کے قافلہ لئے موڑوے پر منتظر تھا۔ گاڑیوں کے جھرمٹ میں حضور اسٹیج پر تشریف لائے۔

مریدین نے اور پیر جی زندہ باد کے نعروں سے فضا کو یوں شوریدہ کردیا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

بابا جی اسٹیج پر کھڑے ہوکر پرجوش نعروں کا جواب دینے کے بعد یوں گویا ہوئے۔

"پیارے مریدوں! آپ نے پانچ سال ظالم حکومت کے زیر سایہ جس کرب سے گزارے اس نے مجھے سالوں انگاروں پر بٹھایا، میں آپ کے دکھ پر خون کے آنسو روتا تھا، مگر مجبور تھا، میرے بس میں کچھ نہ تھا۔

آپ کے ٹیکسوں کے روپوں سے بیرون ملک جائدادیں، کمپنیاں چلائیں گاڑیوں، کوٹھیوں اور فیکٹریوں میں اضافہ کیا، آپ کے مسائل سے منہ موڑ کر وسائل اپنی اور عزیز واقارب کی ذات پر خرچ کرتے رہے آپ آج بھی، بجلی، صاف پانی، ہسپتالوں، اسکولوں اور انصاف کو ترس رہے ہیں جب کہ وہ یورپ اور ایشیا کے مہنگے ترین ممالک میں اربوں ڈالرز کی جائدادوں کے مالک ہیں، آپ کی جھونپڑی کی چھت آج بھی ٹپک رہی ہے ان کے بنگلوں میں آسمانی بجلی سے بچاؤ کے بھی سسٹم آویزاں ہیں۔

ہر بار آپ سے کھلواڑ کیا جاتا ہے، لیکن اب کی بار آپ کو جاگنا ہوگا، اپنے سوئے مقدر کو جگانے کے لئے لڑنا ہوگا۔ اپنے ووٹ سے قسمت بنانی ہوگی۔ یہ امیدوار آپ کی بے زبانی کا ترجمان ہے، آپ کے حق کے لئے اسمبلی میں آواز اٹھائے گا، مسائل حل کروا کر دم لے گا، اسمبلی ہال تک بذریعہ ووٹ پہنچانا آپ کا کام ہے اور پھر ایوان کے اندر ہلچل مچانا، آپ کے حقوق کی جنگ لڑنا اس کا کام ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جو آپ کے مسئلے کو حل کرنے میں مخالف کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹکتا رہے گا، ووٹ دے کر اس کے ہاتھ مضبوط کرو، اسمبلی ہال جانا ممکن کرو، پھر اس کا جوش وجذبہ اور عوام پروری دیکھنا۔

آپ کو اپنے پیر کے انتخاب پر فخر ہوگا، آپ کا انتخاب باکمال ہوگا۔ میں اور یہ مل کر آپ کی آرزوؤں کو بام عروج تک پہنچائیں گے۔ آپ کے مشکلات کے دن اب ختم ہونے والے ہیں۔"

غرض چکنی چپڑی باتوں سے بابا جی مریدوں کو قائل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس دوران ایک شرپسند مرید خاص کو ایک عجیب شرارت سوجھی،

"بابا جی! میری خواہش ہے اس امیدوار سے پانچ لاکھ اور لئے جائیں ور گھر گھر جا کر ووٹ مانگا جائے، امیدوار کے ساتھ ہمارا بھی کئی گنا فائدہ ہوگا۔ ہر گھر سے نذرو نیاز اور شیرینی کی مد میں لاکھوں روپے مزید مل جائیں گے۔ قومی اسمبلی کا حلقہ ہے جو لاکھوں ووٹروں پر مشتمل ہے۔"

اتنا خوبصورت، مفید اور ثمر دار مشورہ سن کر بابا جی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تم بہت شریر ہو، ایک تیر سے شکار پہ شکار کئے جا رہے ہو، پیسے کمانے کا ہنر خوب جانتے ہو، سمجھ گئی، بے روزگاری، غربت ہماری اور تھانے کچہری کی بچی کھچی کسر نکالنا چاہتے ہو، تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں مریدوں کا خون نچوڑنے کے لئے ڈرپوں کا خوب اہتمام کیا ہے۔"

☆.....☆.....☆

بابا جی نے حلقے کا طوفانی دورہ شروع کردیا۔

وہ بابا جی جو گاڑی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے، مریدوں کے جراثیموں والے ہاتھوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے دور سے پھونک مارتے تھے، صدقہ، خیرات، نذرو نیاز کے الگ سے بندے رکھے ہوئے تھے، اب کی بار گھر گھر جا کر دریا دلی کا مظاہرہ کررہے تھے۔

مریدوں کو زیارت سے مستفید کروا رہے تھے، بدلے میں نوٹوں کی بارش سے تھیلوں کو بھرتے جارہے تھے۔

مریدین بابا جی کی مرید پروری، کسر نفسی، اعلیٰ ظرفی کی قوالی کر کے حق مریدی ادا کررہے تھے۔

پیر و مرید اپنی اپنی کارکردگی پر نازاں تھے۔

☆.....☆.....☆

بابا جی کی گاؤں آمد پر شازیہ نے گھر کو دلہن کی طرح سجا رکھا تھا۔ ساتھ ہی بیٹی نادیہ کو بھی خوب سجا سنوار کر حضور کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیا۔

نادیہ بھی ماں کے نقش قدم پر چل نکلی تھی، لیکن شازیہ اپنے کرتوتوں کی آبیاری بیٹے کے من کے گلشن میں نہیں کرنا چاہتی تھی، شازیہ اور ریاض کے لاکھ سمجھانے کے باوجود نادیہ لفنگوں سے دوستی کرنے سے باز نہ آئی۔

ماں باپ نے شادی کر کے اس بلا کو سر سے ٹالنا چاہا، لیکن ہر جگہ اس کا کردار آڑے آجاتا، کئی جگہوں پر بات چلی، مگر ہر جگہ نادیہ کے باغیانہ رویے اس ارادے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دیتے۔

ہر طرف سے مایوس ہوکر انہوں نے بھی درباروں پر چلے باندھنے، دم درود اور تعویذ گنڈوں سے آس کا دیا جلانے کی کوشش کی۔

بابا جی کی آمد کا سنتے ہی ان کو منزل ملنے کا یقین ہو گیا۔ بابا جی کے پھونکوں اور تعویذوں پر پتھر کی طرح یقین تھا۔

ان کی ایک پھونک سے ان کا بیڑا پار ہوجانا تھا۔

☆.....☆.....☆

بشیر غریب والدین کا بیٹا تھا، محنت مزدوری سے زندگی کی گاڑی دھکیل رہا تھا۔ غریبوں کی زندگی ان کی غربت کی طرح طویل گھڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کی دعاؤں سے اثر یوں زائل ہوجاتا ہے جیسے شدید گرمی کے موسم میں بارش ہونے سے حبس اور گرمی۔

ایسے ہی یہ لوگ اس آس امید کے درمیان ہچکولے کھا رہے تھے، مگر منزل کا ابھی دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

ایسے لوگوں کو گھر میں نوکری دینے کے لئے سو بار سوچنا پڑتا ہے۔ رشتے داری کے کنویں میں کون بنا سوچے سمجھے چھلانگ مارے گا۔

بابا جی کی آمد کا سنتے ہی ان کی آس کے جگنو بھی ٹمٹمانے لگے۔

"بشیر کے ابا، بابا جی سے دعا کروائیں گے، ان کی زبان اور دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ وہ ہم دکھیاروں کی التجا ضرور سنیں گے، ان کی نظر کرم سے ہماری مشکلات حل ہوں گی، بشیر کے سر پر سہرا سجے گا، ہمیں بھی خوشیوں کا سویرا نصیب ہوگا، ہم بابا جی کو منہ مانگی شیرینی دیں گے۔ جتنی زیادہ شیرینی ہوگی، اتنا ہی قبولیت کی گھڑیاں نزدیک ہوں گی، بیٹے کی خوشی کی خاطر ہم بابا جی کو شیرینی دے کر خوش کردیں گے، گائے کا بچھڑا سال کا ہونے کو ہے یہی بابا جی کو دے دیں گے۔ بیٹے کی خوشیوں سے یہ زیادہ قیمتی نہیں ہے۔"

آس کے دیئے جلا کر، میاں بیوی نے سکھ کا سانس لیا۔

ترتیب کے لحاظ سے بشیر کا گھر پہلے آتا تھا اور نادیہ کا بعد میں۔

بابا جی نے بشیر کے گھر قدم مبارک فرمایا تو اس کے ماں باپ قدموں میں گر گئے، بشیر کا گھر بسانے کے لئے دعا کی التجا کی، نوٹوں کے حوالے کرنے کے ساتھ موٹے تازے بچھڑے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اتنا مال ملنے پر بابا جی جوش میں آگئے ایک ہفتے کے اندر اندر شادی کی نوید سنا دی۔

بشیر کے ساتھ ماں باپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔

بابا جی کی کرامت نے معترف ہونے پر مجبور کردیا۔

اگلے چند گھروں کے بعد ریاض کے گھر پہنچے تو میاں بیوی پہلے ہی پلکیں بچھائے قدم بوسی کے لئے بے قرار ہورہے تھے، جب کہ نادیہ سر پر دوپٹہ اوڑھے عقیدت سے جھک کر دعاؤں کے تحفے سمیٹنے لگی۔

شازیہ اور ریاض نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر بیٹی کا گھر بسانے کے لئے دعا کی گزارش کی نادیہ کے رشتے کے لئے دعا کی التجا سنتے ہی بشیر کا بچھڑا بابا جی کے حضور ڈکرانے لگا۔ بابا جی نے ان کو ایک ہفتے بعد رشتہ طے ہونے کی خوشخبری سنائی۔

الیکشن کون جیتا کون ہارا، پیر جی کے ساتھ مریدوں کو بھی غرض نہ تھی۔ اگلے ہفتے کے انتظار نے دونوں گھرانوں کو ایڑیاں اٹھا کر انتظار کرنے پر مجبور کردیا۔

ہفتے بعد دونوں گھرانوں کو بابا جی کے حجرے میں مخصوص شرائط طے کرنے کے بعد رشتوں کی ڈوری میں باندھ دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

شازیہ نے نادیہ کے جذبات کے آگے بند باندھنے کی ناکام کوشش کی تھی، مگر شادی کرنے کے بعد وہ کافی حد تک اپنی ذمے داری کی ادائیگی کر چکی تھی۔ اور مطمئن بھی تھی، اب نادیہ کے کردار کے ذمے دار اس کے سسرالی تھے۔ نادیہ نے آتے ہی پرانی روش اپنانے کی کوشش کی۔

اس نے سمجھا شادی کے بعد اسے کھل کر کھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ مگر یہاں کے حالات اس کی توقع کے برعکس نکلے۔

بشیر نے چار دیواری تک اسے محدود کر دیا، خود محنت مزدوری کرتا، نادیہ کو آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کے قطعاً اجازت نہ دی۔

نادیہ کی آزاد طبیعت ان پابندیوں کی پابند نہ تھی مگر مجبور تھی یہ پابندیاں اس کے خاوند کی طرف سے اس پر عائد تھیں۔

بشیر کی غیر موجودگی میں گاؤں کے ایک نوجوان سے تعلق بنانے میں آخر کار وہ کامیاب ہوگئی۔

بشیر دن کو مزدوری پر جاتا تو وہ اپنے محبوب کو گھر بلا کر اس کی بانہوں کے جھولے میں جھولتی۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ اس لیلیٰ مجنوں کی کہانی بھی زد عام ہوگئی۔

بشیر کو نادیہ کی یاری رنجیدہ کر گئی، اس نے بشیر کی عزت کا جنازہ نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بشیر نے عزت کو بچانے کے لئے باہر مزدوری کرنے کی بجائے مقامی زمیندار کے ہاں نوکری کر لی، جس کا ڈیرہ بشیر کے گھر کے سامنے تھا۔

وہ سارا دن کام بھی کرتا اور گھر کی نگہبانی بھی۔

لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، نادیہ نے بشیر کی مصروفیت کو نظر میں رکھنا شروع کر دیا۔

وقت پاتے ہی محبوب کی جدائی کو شرف ملاقات فراہم کرتی۔

ایک رات بشیر فصلوں کو پانی لگانے کے بعد تھکا ہارا گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے، نادیہ محبوب کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔

یہ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، آؤ دیکھا نہ تاؤ محبوب تو بھاگ گیا نادیہ کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ لاتوں، گھونسوں، مکوں کی وہ بارش کی کہ خدا کی پناہ۔

رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ دن ہوتے ہی نادیہ ماں کے پاس پہنچ گئی۔

ریاض کو ظالم، جلاد اور وحشی قرار دیا۔ جس نے بلاوجہ مار مار کر اس کا حشر نشر کر دیا۔

ماں نے جب بیٹی کی ناگفتہ بے حالت دیکھی تو وہ بھی غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔ نادیہ کا محبوب بھی گاڑی لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔

سب لوگ گاڑی میں سوار ہو کر تھانے پہنچ گئے مار دھاڑ اور ارادہ قتل کی ایف، آئی آر بشیر کے خلاف کٹوا دی، سفارش اور رشوت کا استعمال کر کے مضبوط کیس بنوایا۔

اسی شام پولیس دندناتی آئی اور بشیر کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اور جاتے ہی خوب چھترول کی۔

اگلی صبح نادیہ اس کا محبوب اور ایک سفارشی تھانے پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے اپنے سامنے بشیر کو پھر چھترول کروائی۔

نادیہ کا جوتا منہ میں ڈال کر اس سے معافی کا مطالبہ کیا وگرنہ ارادہ قتل کے الزام میں ہمیشہ کے لئے جیل بند کروانے کی دھمکی دی۔

اتنی دیر میں ریاض کے رشتے دار اور گاؤں کے معززین آ گئے۔ سب نے ہاتھ جوڑ کر نادیہ اور اس کے محبوب سے معافی مانگی، تب جا کر اس شرط پر بشیر کی جان چھوٹی کہ بشیر نادیہ کے ننھیال میں رہے گا۔

جان بچی سو لاکھوں پائے۔ تمام شرائط مان کر بشیر کی تھانے سے رہائی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

بابا وتن شاہ ایک خدا ترس انسان تھے۔ فقیر منش آدمی انتہائی رحمدل خدا ترس انسانیت کی محبت، دکھ درد پریشانیوں میں ابر رحمت کی طرح برسنے کی حرص و ہوس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اس کے آستانے پر صبح شام سائلین کا تانتا بندھا رہتا۔ بابا جی حسب توفیق لنگر پانی سے تواضع کرتا، تعویذ دم درود، قبر کی پھونک، بزرگوں کی دعائیں۔ غرض ہر حربہ طریقہ اپنا کر پریشان حال مریدین کی دادرسی کرتا۔

بابا جی بے لوث انسان تھے جو نذر و نیاز دیتا اس کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے اور جس کے پاس واپسی کا کرایہ نہ ہوتا، اس کو کرایہ کے ساتھ گھریلو استعمال کی اشیاء اور راشن دیتے، بابا جی خلوص نیت سے بغیر کسی دنیاوی غرض کے صرف خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر دعاؤں کے نذرانے پیش کرتے اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دعا قبولیت کے مقام پر فائز ہوتی۔

دکھوں کی پٹاریاں تھامنے والے خوشیوں کے پھولوں سے لدے پھندے گھروں کو لوٹتے ایک دن بشیر آستانے کے پاس سے گزرا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر رک گیا۔ بابا جی کی زیارت کرنے کے بعد ان کی درد بھری دعاؤں، دکھ سے بہتے آنسو دیکھ کر ان کی کرامات اور انسان پروری کا معترف ہو گیا۔

اپنی داستان الم بابا جی کے حضور پیش کی اور آئندہ ظالموں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے دعاؤں اور خاص نظر کرم کی درخواست کی۔ دردناک داستان سن کر بابا جی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے، آنکھیں دکھ سے بھر آئیں انتہائی خلوص اور گریہ زاری سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی۔

"بیٹا! ظالم ایک دن ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا، حق کا سورج طلوع ہوگا، تم نے ہر ظلم پر صبر کیا پھل ضرور ملے گا، تمہارے دکھوں کا مداوا ہوگا، انصاف کا ترازو حق تولے گا تو دنیا دیکھے گی۔ ظالموں کے عبرتناک انجام پر لوگ توبہ توبہ کر کے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔

ان کا انجام دیگر ظالموں کے لئے عبرت کا موجب بنے گا۔ ظلم کی سیاہ رات ختم اور حق کا سورج طلوع ہونے کا انتظار کرو، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو۔" بابا جی نے بشیر کو دلاسہ دیا۔ پند و نصائح کی، ثابت قدم رہنے کا درس دیا۔

صرف رب ذوالجلال سے حاجت روائی کی یقین دہانی کروائی۔ نادیہ کے محبوب کی بہن اور بھائی کی شادی وٹے سٹے پر ہوئی تھی۔ بھائی کو جوئے کا بہت شوق تھا۔ گھر کا سارا سامان جوئے کی نذر کر چکا تھا۔

ایک رات گاؤں کے نواح میں واقع قبرستان میں جوا کھیل رہا تھا۔ جب سب نقدی ہار چکا تو بیٹی کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ بھی ہار گیا۔ اگلے چند دن بعد جیتنے والے نے شرط مانگی تو برادری گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لئے بیٹی کا رشتہ مفت دینے کا اعلان کر دیا۔

بیوی اس کے کرتوتوں سے واقف تھی۔ سخت مخالفت کے باوجود لڑکی کا نکاح ہو گیا۔ بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئی اور نکاح تنسیخ کا دعویٰ کر دیا۔

عدالت سے طلاق ہوتے ہی اس نے بھائی کو طلاق دلوا دی، چار بچوں کی ماں بلاوجہ طلاق کا کلنک لگوا کر میکے آ گئی۔ جس شخص نے تھانے ایف آئی آر کٹوانے میں نادیہ کی مدد کی تھی، اس کی شادی شدہ بیٹی ایک نوجوان سے پیچا لڑا بیٹھی۔ دو بچیوں کو کھول کر محبوب کے ساتھ بھاگ گئی۔ دوسری بیٹی کی وٹے سٹے پر شادی کی تو لڑکے داماد نے پہلی رات ہی طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔

ایک دن بادلوں کی گھن گرج نے آسمان پر عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ بوندا باندی موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ گھر کے صحن میں بندھی بکریاں چھوڑ کر جب نادیہ اندر لے جانے لگی تو چانک آسمانی بجلی کڑکی اور سیدھی نادیہ کے اوپر آ گری۔ بکریوں کے ساتھ نادیہ بھی موقع پر خاکستر ہو گئی۔ یوں ظلم و ستم کی یہ روداد اپنے انجام کو پہنچی۔

جس کسی نے بھی عبرتناک موت کے بارے میں سنی، کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرنے لگا۔

جس زمیندار کے ہاں بشیر ملازم تھا، اس کی صرف ایک بیٹی تھی۔ نادیہ کی موت کے بعد اس نے بشیر کو بیٹی کا رشتہ دے دیا۔ آج وہ دو بچوں کا باپ ہے، علاقے کے زمینداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ خوش حال زندگی سے میاں بیوی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اِسرار

محمد خالد شاہان۔صادق آباد

آخری قسط

نقطه نقطه لفظ لفظ سطر سطر خوف و هراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی هوئی خونچکاں بھونچکاں اور لهولهان کهانی جو که پڑھنے والوں پر سکته طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

لیکن ناگنی بار بار کے اڑنے اور پھر نیچے اتر کر انسان بننے سے تنگ آ گئی تھی۔ایک بار پہلے بھی یہ بلا اسے اپنے اندر نگل چکی تھی۔اب ناگنی اسے زبردست مزا چکھانا چاہتی تھی۔اس نے آنکھیں بند کر کے ایک بہت ہی گہرا سانس کھینچا اور پل بھر میں انسان کی جگہ وہاں ایک ایسا ہیبت ناک زمین سے ستر فٹ چھ منزلہ بلڈنگ جتنا کنگ کانگ کھڑا تھا اس ڈائنا سار نے ایسا زبردست درندہ لاکھوں سال پہلے نہ دیکھا ہوگا۔کنگ کانگ کو ڈائنا سار ایک بلی کے بچے کی طرح نظر آ رہا تھا ناگنی کو اپنی طرف کھینچنے کی بجائے اب وہ اس کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا۔ڈائنا سار بھی اپنے سامنے کنگ کانگ کو دیکھ کر گھبرا گیا اور بھیگی بلی بن کر ایک طرف سمٹ گیا۔پھر گردن سکیڑ کر پیچھے ہٹا اور ایک طرف کو بھاگا مگر کنگ کانگ یعنی ناگنی اب اسے اتنی مہلت نہیں دے سکتی تھی۔اس نے ناگنی کو اس جزیرے پر بہت تنگ کیا تھا۔کنگ کانگ نے ایک چیخ ماری اور دونوں لمبے لمبے بازو بڑھا کر ڈائنا سار کو چھوٹے سے ریچھ کے بچے کی طرح اوپر اٹھا لیا۔ڈائنا سار خوف سے سہما ہوا کنگ کانگ کی ہتھیلی پر بیٹھا تھا۔

کنگ کانگ نے ڈائنا سار کو اپنے سر پر سے اوپر اٹھایا۔اور پوری طاقت سے زمین پر دے مارا۔اس کے زمین پر پٹخنے سے ایسا بھیانک دھماکہ ہوا کہ زمین کئی جگہوں سے پھٹ گئی۔اور ڈائنا سار اس کے اندر گم ہو گیا۔زمین کے نیچے سے ڈائنا سار کی چیخیں گونج رہی تھیں۔کنگ کانگ اپنا چٹان جیسا پاؤں مار کر اوپر سے زمین برابر کر دی۔ڈائنا سار کی آواز ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی۔

ناگنی اس وقت انسان کی شکل میں آ گئی۔یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ زندگی میں اتنا بڑا کنگ کانگ بنی تھی۔اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ دوبارہ انسان کی شکل میں آنے کے بعد اس کا سر چکرا رہا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے کندھوں پر اپنا بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ڈائنا سار کا مقابلہ وہ کنگ کانگ بن کر ہی کر سکتی تھی۔بہت جلد ناگنی کی طبیعت سنبھل گئی۔وہ کشتی کے پاس آئی اسے ریت پر گھسیٹتی ہوئی خزانے کے پاس لے گئی اور خزانہ اس میں رکھا اور کشتی کو سمندر میں دھکیل کر چپو چلاتی کھلے سمندر کی طرف چل پڑی۔

دن کی روشنی اب کم ہونے لگی تھی سورج دور سمندر میں غروب ہو رہا تھا۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ناگنی کشتی کو گھسیٹتی ہوئی بہت جلد جزیرے سے نکل گئی۔خزانے کا صندوق اس کے آگے کشتی میں پڑا تھا۔اس میں کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات تھے۔لیکن ناگنی کو دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔زمین کے اندر جتنے بھی خزانے دفن تھے، وہ سب اگر چاہتی تو نکلوا کر حاصل کر سکتی تھی۔مگر ناگنی دولت سے بے نیاز تھی۔وہ تو اس خزانے کو سنہری بالوں والی لڑکی تک پہنچانا چاہتی تھی۔یہ خزانہ اس لڑکی کی خاندانی نشانی

اور امانت تھا۔ ابھی ناگنی نے مزکو اس کی بیوی سے ملانا تھا جس پر طلسم کیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد اسپین جا کر شاہان اور شریم کو بھی تلاش کرنا تھا۔ اس وقت سب سے پہلا اور ضرور ی کام اس کشتی کا کھوج لگانا تھا۔ جس میں مزاور سنہرے بالوں والی لڑکی سوار تھی جسے خزانے کے دو چوروں نے اغوا کر لیا تھا۔ جزیرہ کافی پیچھے رہ گیا، شام کے سائے سمندر پر پھیل گئے۔ سورج غروب ہوگیا۔ پھر رات کی سیاہی نے سمندر کو اپنی کالی چادر میں لے لیا۔ آسمان پر بے شمار ستارے نکل آئے، ناگنی کی کشتی اب اپنے آپ مغرب کی طرف سمندر ی لہروں پر چلی جارہی تھی لہریں بڑی پرسکون تھیں۔ ہوا بڑے سے چل رہی تھی ناگنی کشتی میں ٹیک لگائے بیٹھی ستاروں کو تک رہی تھی۔ پھر اس نے دور سمندر میں دیکھنے کی کوشش کی، کہ شاید اغوا شدہ کشتی کا سفید بادبان دکھائی دے۔ لیکن سمندر پر اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا تھا۔ ناگنی نے آنکھیں بند کرلیں اب وہ دوسرے دن سورج کی روشنی میں کشتی کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔ رات ناگنی نے کبھی جاگ کر اور کبھی سو کر گزار دی۔

صبح ہوگئی، سورج نکل آیا۔ سمندر پر سنہری دھوپ پھیل گئی۔ ہر طرف روشنی ہوگئی۔ ناگنی نے کشتی میں کھڑے ہوکر گہرا سانس لیا اور سفید عقاب بن کر ہوا میں اڑ گئی۔ وہ سمندر کے اوپر مغرب کی طرف چلی جارہی تھی۔ دور تک سمندر خالی تھا۔ سوائے بڑی سمندری لہروں کے اور کوئی شے نظر نہ آتی تھی۔ کہیں کوئی شارک مچھلی ایک پل کے لئے اچھل کر لہروں کے اوپر آتی تھی۔ اور پھر واپس چلی جاتی تھی۔

ناگنی عقاب کی شکل میں آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اچانک اسے سمندر میں دور سفید سی چیز نظر آئی ۔عقاب نے اپنی رفتار تیزی کردی وہ سفید چیز بڑی ہوتی گئی۔ یہ وہی بادبانی کشتی تھی جسے مزاور سنہری بالوں والی لڑکی سمیت اغوا کرلیا گیا تھا۔ اور جس کی ناگنی کو بڑی شد ت سے تلاش تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ کشتی کے اوپر پہنچ گئی۔ کشتی پر وہی دونوں چور موجود تھے ایک بادبان کی رسی کو کھینچ کر بانس سے باندھ رہا تھا اور دوسرا خنجر لئے بیٹھا ناریل کاٹ رہا تھا۔ دونوں کی شکلیں جلادوں سے ملتی جلتی تھیں۔

مزاور وہ لڑکی وہاں کہیں نہیں تھی، عقاب کے اوپر چکر لگانے لگا ایک چور کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ اس نے سفید عقاب کو دیکھا تو اپنے ساتھی سے کہا۔

"یہ سفید عقاب سمندر میں کہاں سے آ گیا؟ ادھر تو ایسا پرندہ کبھی دیکھنے میں نہیں آتا۔" دوسرا چور ناریل کاٹتا ہوا رک گیا۔ اور آنکھیں اوپر اٹھا کر عقاب کو تکنے لگا۔ ناگنی بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں وہ اڑتی ہوئی نیچے بادبانی کے بانس پر بیٹھ گئی۔ پہلا چور بولا۔

"اسے پکڑنا چاہئے۔ سفید عقاب بڑا مہنگا بکتا ہے۔" دوسرا چور کہنے لگا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ جو کوئی سفید عقاب کے کبا ب بنا کر کھالے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں تو اس کے کباب بنا کر کھاؤں گا۔" پہلے چور نے کہا۔

"یار پہلے اسے قابو تو کر لینے دو۔ پھر بے شک کبا ب بنالیں ناگنی نے بھی ان کی گفتگو سن لی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ ان لوگوں کے پنجرے میں پھنس جائے اور پھر رات کو سانپ بن کر مزاور لڑکی کو تلاش کرے اب جو اس نے سنا کہ وہ اس کو ذبح کر کے اس کے کباب بنانے کا پر واگرام بنا رہے ہیں تو ناگنی نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ دونوں چوروں نے عقاب کو پکڑنے کے جتن شروع کردیئے۔ انہوں نے عرشے پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھیلا دیئے۔ مگر ناگنی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ ایک دم اسے اڑ گئی چور اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ عقاب سمندر کے اوپر اڑتی کشتی سے دور نکل گئی۔ پھر اس نے سمندر میں غو طہ لگایا اور جونہی وہ پانی کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ اس نے ایک دم سے سمندر میں رہنے والے پانی کے ناگنی کی شکل بدل لی۔ یہ ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا پتلا سانپ تھا جو بڑی تیزی سے لہراتا ہوا سمندر کی لہروں پر تیرتی ہوئی کشتی کی طرف جارہا تھا۔ اس کو چور نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کشتی کے قریب آ کر سمندری ناگن نے اپنا رخ کشتی کے پچھلے حصے کی طرف موڑ لیا۔ پیندے کے پاس پہنچ کر سمندری ناگنی نے اچھل کر کشتی کی دیوار کے ساتھ چمٹ گئی اور پھر رینگتی ہوئی اوپر چڑھ گئی۔ ناگنی نے اپنی گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں چوروں میں

سے کوئی بھی اوپر نہیں تھا۔

یہ بادبانی کشتی جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے عام کشتی سے بڑی اور جہاز سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کے عرشے کے نیچے بھی ایک کمرہ تھا۔ جہاں رسی کی سیڑھی جاتی تھی۔ ناگنی عر شے پر آ گئی اور جنگلے کے ساتھ ساتھ رینگتی ہوئی اسی جگہ پہنچی جہاں لکڑی کا تختہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ اور نیچے رسی کی سیڑھی لٹک رہی تھی۔ ناگنی نے نیچے سے آتی آواز کو سننے کی کوشش کی کہ شاید مزیا لڑکی کی آواز سنائی دے۔ مگر نیچے سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک چور کی آواز آئی، وہ کچھ کھاتے ہوئے اپنے ساتھی چور کو پکار رہا تھا۔

"ارے ادھر آؤ۔ ناریل کا پانی ان دونوں کو پلا دو آخری ناریل کا پانی ہی پی لیں بے چارے۔" ناگنی کا ماتھا ٹھنکا۔ پھر رسی کی سیڑھی۔ ہلنے لگی۔ نیچے سے کوئی اوپر آرہا تھا۔ سمندری ناگنی جلدی سے عرشے کے کونے میں پڑے ہوئے رسوں کے گٹھے کے پیچھے چھپ گئی۔ اتنے میں عرشے کا تختہ نیچے سے کسی نے پرے کردیا اور پھر پہلے ایک چور اوپر آیا۔ اس کے بعد مزاور سنہری بالوں والی لڑکی کو اوپر لایا گیا۔ ان دونوں کے ہاتھ مضبوطی سے ان کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ آخر میں دوسرا چور باہر نکلا دونوں چوروں کے ہاتھوں میں خم دار تیز دھار والے بڑے خنجر تھے۔ کشتی کھلے سمندر کی بڑی بڑی ہیبت ناک موجوں پر تیرتی جارہی تھی۔ ایک چور نے لکڑی کا ایک تختہ جنگلے پر ڈال دیا اور پھر مزاور سنہری بالوں والی لڑکی کو اس تختے پر کھڑا کیا اور چلنے کا حکم دیا۔ اس تختے پر چلنے کا مطلب یہ تھا کہ چھ قدم چلنے کے بعد وہ سمندر میں گر جاتے اور بپھری ہوئی سمندر کی موجیں انہیں نگل جائیں۔ یہ قیدیوں کو مارنے کا پرانا طریقہ تھا۔ بحری ڈاکو اپنے دشمنوں کو اسی طرح ہلاک کیا کرتے تھے۔ مزبے چارے کا موت کے خوف سے برا حال ہورہا تھا۔ لڑکی بھی ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ موت سمندر میں منہ کھولے کھڑی تھی۔ وہاں انہیں بچانے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ دونوں چور خنجر لئے ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ اگر وہ ان کا حکم نہیں مانتے تو خنجر ان کے سینوں میں جاتے اور اگر تختے پر آگے جاتے تو سمندر میں خونخوار جبڑوں والی شارک مچھلیوں کا شکار ہوجاتے۔ ایک چور نے حکم دیا۔

"چلو آگے چلو۔ میں دس گنوں گا اگر تم سمندر میں نہ کودے تو یہ تیز خنجر تمہاری گردنوں میں گھونپ دیئے جائیں گے۔ اور پھر تمہاری لاشیں سمندری شارکوں کا نوالہ بن جائیں گی۔" چور نے گنتی شروع کردی۔ ناگنی سمندری ناگنی کے روپ میں ابھی تک یہ سارا بھیانک تماشہ دیکھ رہی تھی۔ مزسب سے آگے تھا۔ اس کے پاؤں ابھی تک تختے پر جمے ہوئے تھے۔ سنہری بالوں والی لڑکی اس کے پیچھے تھی، وہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی تھی۔ چور کی گنتی آٹھ تک پہنچ چکی تھی۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ ناگنی رسے کے گٹھوں سے باہر نکل آئی۔ وہ عرشے کے تختے پر رینگتی ہوئی اس چور کی طرف بڑھی جو گنتی گن رہا تھا۔ دوسرا چور خنجر لئے بالکل تیار کھڑا تھا کہ جونہی دس کی گنتی پوری ہو تو وہ لڑکی کی پیٹھ میں خنجر گھونپ کر اسے ہلاک کردے اور اس کے بعد مز کو سمندر میں دھکا دے دے۔ گنتی نو تک پہنچی تو سمندری ناگنی گنتی کرنے والے چور کے پیچھے پہنچ چکی تھی۔ ابھی چور کے منہ سے دس کا لفظ نہیں نکلا تھا کہ اسے اپنی پنڈلی پر چبھن سی محسوس ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا حلق خشک ہوگیا اور اس کی آواز بند ہوگئی۔ دس کا لفظ بولنے کی بہت کوشش کی مگر اس کے گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ ناگنی کے زہر نے اس کا گلا بند کردیا تھا دوسرے چور کا منہ سمندر کی طرف تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ اس کا ساتھی نو کے ہندسے پر آ کر کیوں رک گیا ہے۔ وہ دس کا لفظ کیوں نہیں ادا کررہا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ معاملہ کیا ہے۔

دوسرے چور نے سمجھا کہ شاید اس کا ساتھی سو گیا ہے۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس نے قریب جا کر اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ دھڑام سے پتھر کے بت کی طرح عرشے پر گر پڑا اور پتھر کے بت کی طرح اس کا جسم ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ دہشت کے مارے دوسرے چور کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے آج تک انسانی لاش کو اس طرح ٹوٹ کر بکھرتے نہیں دیکھا تھا۔ چور کی چیخ کی آواز سن کر مزاور لڑکی نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ایک چور کی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہوکر عرشے پر کانچ کے ٹکڑوں

کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ اور دوسرا چور پھٹی پھٹی سہمی ہوئی آنکھوں سے لاش کو تک رہا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ بندھے تھے چور کے ہاتھ میں ابھی تک خنجر تھا۔ وہ چور کی طرف بڑھے ہی تھے کہ وہ ہوشیار ہوگیا اور خنجر لہراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہاری وجہ سے میرا دوست اچانک موت مر گیا۔“ جونہی وہ خنجر لہراتا ہوا مزاور سنہری لڑکی کی طرف بڑھا ناگنی بھی حرکت میں آ گئی۔ وہ گٹھے کے پیچھے سے اچھلی اور چھلانگ لگا کر ہوا میں اڑتی ہوئی دوسرے چور کی گردن سے چمٹ گئی اور ایک سیکنڈ میں اسے بھی ڈسا اور پھر تیزی سے رینگتی ہوئی سمندر میں کود گئی۔ دوسرا چور بھی ویسے ہی اپنی جگہ پر رک گیا۔ اس کا بھی گلا بند ہوگیا۔ دوڑنے کے لئے اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ایک پاؤں آگے بڑھایا۔ مگر اس کے بعد وہ ایک انچ نہ ہل سکا۔ یہ اس کی زندگی کی آخری حرکت تھی۔ وہ پتھر کا بت بن چکا تھا۔

مزاور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔

”یہ سانپ کہاں سے آ گیا۔“ مزنے کہا۔

لڑکی بولی۔ ”سمندری سانپ تھا۔ تیر کر کشتی میں آ گیا ہوگا خدا نے ہماری مدد کے لئے بھیجا تھا۔“ اور پھر لڑکی نے آگے بڑھ کر دوسرے چور کی لاش کو سمندر برد کر دیا۔ پھر لڑکی نے کہا۔

”اس طرح کھڑے رہنے سے کیا ہوگا۔ جلدی سے بادبان کا رخ موڑو تا کہ پیچھے جزیرے پر جا کر اپنے ساتھی ناگنی کا پتہ کریں وہ ہمارا خزانہ لئے وہیں ہوگی۔“ مزنے کہا۔

”خدا خیر کرے۔ جزیرے پر تو خونخوار بلا ڈائنا سار نے تباہی مچا رکھی تھی۔ کچھ بھی ہو ہمیں واپس جا کر ناگنی کو لانا ہوگا۔ یہ اس کی زندگی اور خاندانی خزانے کا سوال ہے۔ جلدی سے بادبان کا رخ موڑو۔“ مزنے کشتی کا رخ جزیرے کی طرف کر دیا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ناگنی سے ملا جائے۔ کیونکہ ناگنی کے بغیر وہ اپنی بیوی کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ بادبانی کشتی جزیرے کی طرف جا رہی تھی۔ دوسری طرف ناگنی جب ناگن کی شکل میں سمندر میں گری تو پانی کی سطح تک پہنچتے ہی وہ پھر سے سفید عقاب بن کر ہوا میں پرواز کر گئی وہ واپس اپنی کشتی میں جا کر خزانہ ساتھ لے کر مزاور لڑکی سے ملنا چاہتی تھی۔ اس خیال سے وہ مطمئن تھی کہ اب سمندر میں ان لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں۔

ناگنی سمندر میں اپنی چھوٹی کشتی کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ سفید عقاب کی شکل میں سمندر کے اوپر پرواز کرتی چاروں طرف تیز نظروں سے تک رہی تھی۔ آخر دور سے اسے اپنی کشتی نظر آ گئی وہ سمندر کی موجوں پر بہے جا رہی تھی۔ ناگنی کشتی میں اتر گئی۔ اور پھر سے انسانی شکل میں آ کر بادبانی کشتی کی طرف چلنے لگی، دوسری طرف سے بادبانی کشتی بھی ناگنی کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ آخر دونوں ایک جگہ مل گئیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئیں۔ خزانے کو دیکھ کر لڑکی خوشی سے جھوم اٹھی۔ خزانے کے صندوق کو بڑی کشتی پر لادا گیا۔ چھوٹی کشتی سمندر میں چھوڑ دی گئی۔ لڑکی بادبانی کشتی کو لے کر ایک دن کا سفر طے کرنے کے بعد اپنے جزیرے میں آ گئی۔ یہ کافی بڑا جزیرہ تھا۔ اور آبادی بھی کافی تھی۔ لڑکی ناگنی اور مز کو اپنے پرانے محل نما مکان میں لے گئی۔ وہاں ان کو سات روز تک مہمان رکھا۔ ان کی بڑی خدمت کی اپنے بھائی سے ملایا۔ مز کی صحت بھی ٹھیک ہوگئی۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا۔ تو مز نے ناگنی سے کہا۔

”وہ اپنی بیوی کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اب انہیں وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ میں اپنی بیوی کے بغیر سخت پریشان ہوں۔“

”تم تو جانتے ہو کہ وہ طوم کے جادوگر کی قید میں ہے، اور وہ جادوگر نے طلسم کر رکھا ہے، خدا جانے وہ کس حال میں ہے.....؟“ ناگنی نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ ہم کل ہی یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ میں نے ایک روز پہلے سنہری لڑکی سے بات کی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ شمالی افریقہ کو جانے والا جہاز کل یہاں سے روانہ ہوگا۔ ہم اسی میں سفر کریں گے۔“ مز بڑا خوش ہوا۔ پھر ناگنی سے کہنے لگا۔

”بہن.....!! میں سوچتا ہوں کہ اگر عین وقت پر

سانپ آ کر ہماری مدد نہ کرتا تو خزانے کے چوروں نے ہمیں سمندر میں پھینک دینا تھا، ناگنی بہن کیا سمندری سانپ کشتیوں میں آ جاتے ہیں۔ میں نے تو ایسا واقعہ پہلے کبھی نہیں سنا۔“

دوسرے روز وہ ایک بادبانی جہاز پر سوار ہوئے اور شمالی افریقہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ سنہری بالوں والی لڑکی اور اس کے بھائی انہیں چھوڑنے بندرگاہ تک آئے تھے۔ جب تک جہاز ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا وہ بندرگاہ پر ہی کھڑے رہے۔ ناگنی نے ان کے خزانے سے ایک پائی تک نہیں لی تھی۔ سنہری لڑکی نے اسے بہت کچھ دینا چاہا تھا۔ لیکن ناگنی کی خودداری نے گوارا نہ کیا کہ وہ لڑکی سے راستے کے اخراجات کے لئے رقم لے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ابھی چاندی کے کچھ ٹکڑے موجود تھے۔ اس سارے سفر میں ناگنی کو اگر افسوس تھا تو اس بات کا کہ وہ تو شاہان اور شریم کی تلاش میں نکلی تھی۔ کہ راستہ میں کن بلاؤں سے واسطہ پڑ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھی کہ میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دو انسانوں کو نئی زندگی دی۔ اگر میں کسی طرح اس جزیرے میں نہ پہنچتی تو مزاور لڑکی دونوں ختم ہو چکے ہوتے۔ اب اسے ایک ہی سوچ تھی کہ وہ جلد از جلد مز کی بیوی کو جادو کے طلسم سے آزاد کروائے اور شاہان اور شریم کی تلاش میں اسپین چلی جائے۔ سمندری جہاز بڑے سکون کے ساتھ شمالی افریقہ کی طرف سفر طے کر رہا تھا۔ جہاز میں زیادہ تر افریقہ کے حبشی مسافر تھے۔ عرب اور مصری مسلمان بھی تھے۔ یہ مسلمان تاجروں کا جہاز تھا مسافر بھی زیادہ تر مسلمان تھے۔ صبح شام جہاز پر اذان دی جاتی تھی۔ مسلمان نماز پڑھتے۔ ناگنی بھی مسلمان ہو چکی تھی اور اس نے ہزاروں سال پہلے ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لئے وہ بھی ان کے ساتھ ہی نماز ادا کر رہی تھی۔ مز پارسی تھا وہ اپنے طریقے سے عبادت کرتا۔

جزیرے سے افریقہ کے ساحل تک کا فاصلہ زیادہ لمبا نہیں سمندری جہاز چھٹے روز شمالی افریقہ کی بندرگاہ سے جا لگا۔ وہاں سے وہ طوم کے شہر کی جانب روانہ ہوگئے تھے۔

آج سے سو برس پہلے طوم کا شہر اسلامی تہذیب کا مرکز تھا۔ اور دوسرے مذہبوں کے لوگ دور دور سے یہاں آتے تھے۔ بڑا صاف ستھرا گنجان اور خوبصورت مشرقی شہر تھا۔ حبشی مسلمان بڑے محنتی اور دیانت دار تھے۔ مز اور ناگنی ایک سرائے میں جا کر ٹھہرے۔ اب انہیں اس جادوگر کو ڈھونڈھنا تھا جو طوم شہر میں کہیں سوداگر کے بھیس میں رہتا تھا۔ اور جس نے مز کی بیوی تاج پر طلسم کر کے اسے قید کر رکھا تھا۔

دو تین روز، دونوں طوم شہر میں آوارہ گردی کرتے رہے۔ انہوں نے ایسے سوداگر کا ہر جگہ پتہ کیا۔ جو جادو بھی جانتا تھا۔ لیکن کسی نے کچھ نہ بتایا۔ کسی کو کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ چوتھے روز ناگنی نے مز سے کہا۔

”تم سرائے میں ٹھہرو۔ میں شہر سے باہر کی بستی میں جا کر سراغ رسانی کرتی ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ مز نے کہا۔

”ابھی تمہارے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں پہلے مجھے پتہ لگا لینے دو۔“ صبح صبح ناگنی طوم شہر سے دور ایک بستی میں چلی گئی۔ یہاں کچھ ایسے امیر حبشی رہتے تھے جن کے پھلوں کے باغات تھے ناگنی ایک باغ میں آئی اور سوڈانی مزدور سے کہا کہ۔ ”وہ بھی مصر کی رہنے والی عرب ہے۔ اور یہاں کام کی تلاش میں آئی ہے۔“ سوڈانی مزدور نے کہا۔

”تم شکل صورت سے اچھے خاندان کی لگتی ہو یہاں کی سخت مزدوری تم سے نہیں ہو سکے گی۔“ ناگنی بولی۔

”پھر کیا کروں میں.....؟ کوئی کام کر کے روزی کمانا چاہتی ہوں۔“ سوڈانی مزدور نے کہا۔

”تم سامنے والی پہاڑی کی جھیل کی طرف جاؤ وہاں ایک سوڈانی امیر کا محل ہے۔ اس کا ہیرے جواہرات کا کاروبار ہے۔ اور اس کے محل میں بڑے ملازم کام کرتے ہیں۔ شاید تمہیں بھی وہاں کوئی اچھا سا کام مل جائے۔“ ناگنی نے یونہی پوچھ لیا۔

”کیا اس سوڈانی امیر کے پاس کوئی جادوگر بھی رہتا ہے.....؟“ سوڈانی مزدور نے کہا۔

”چھی..... آہستہ بات کرو۔“

"کیوں کیا بات ہے بھئی؟" ناگنی نے سرگوشی میں کہا۔ سوڈانی مزدور بولا۔

"بات یہ ہے کہ اس سوڈانی امیر کی شہرت سوڈان میں اچھی نہیں ہے، لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑا زبردست جادوگر ہے۔ اور اس کے پاس کوہ قاف سے جن اور چڑیلیں آتی ہیں۔" ناگنی کے لیے اتنی ہی معلومات کافی تھیں۔ اب تو وہ سوڈانی امیر کے محل میں اڑ کر پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے سوڈانی مزدور سے کہا۔

"نہیں بھائی۔ میں ایسے جادوگر کے پاس ملازمت نہیں کرسکتی۔"

"تو پھر میں اپنے ہاں ہی تمہارے لئے نوکری کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"نہیں بھائی شکریہ! میں نے ارادہ بدل لیا ہے اب میں کوئی اور کام کروں گی۔" یہ کہہ کر ناگنی وہاں سے چل دی۔ وہ سیدھا واپس سرائے میں آئی مزکو ساری بات بتا کر بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ وہی جادوگر ہے، جس کے قبضے میں تمہاری بیوی ہے۔" مزنے بے تاب ہو کر کہا۔

"خدا کے لئے میری بیوی کو اس جادوگر کی قید سے رہائی دلاؤ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

"مز بھائی صبر کرو۔ تھوڑا صبر سے کام لو۔ میں اسی کام کے لے تو اتنی تکلیفیں اٹھا کر یہاں آئی ہوں۔ لیکن ہمیں بڑی سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا.....!!" اپنی بیوی کا سن کر مز بے چین اور بہادر بھی ہوگیا تھا۔ مگر ناگنی اسے ساتھ لے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ پہلے خود جا کر حالات کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ تسلی بھی کر لینا چاہتی تھی کہ مز کی بیوی وہاں اگر ہے تو کس حال میں ہے؟ اور اس کی کس طریقے سے مدد کی جاسکتی ہے.....؟ اس نے مز سے کہا۔

"نہیں بھائی تمہیں میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں پہلے مجھے اکیلا وہاں جا کر حالات کا جائزہ لینے دو۔" مز نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جائزہ لیتے ہی رہ جاؤ۔ اور وہ جادوگر میری بیوی کو کسی دوسری جگہ پہنچا دے۔" ناگنی بولی۔

"نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"تم بھلا ایک جادوگر کا کیسے مقابلہ کرسکو گی۔"

"یہ تم نہیں جانتے کہ میں کس طرح سے ایک جادوگر کا مقابلہ کرسکوں گی۔ کیا میں نے جزیرے میں اتنی خوفناک بلا ڈائنا سار کا اکیلی مقابلہ نہیں کیا؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" مز شرمسار ہو کر بولا۔

"تو پھر میں اس جادوگر کا مقابلہ بھی کرلوں گی۔ انسان کے دماغ میں عقل ہونی ضروری ہے۔ پھر وہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اب میں جاتی ہوں تم اسی سرائے میں رہ کر میرا انتظار کرنا۔ خبردار یہاں سے ہرگز ہرگز کسی دوسری جگہ مت جانا۔"

"نہیں ناگنی بہن میں اسی سرائے میں رہوں گا۔"

ناگنی نے جاتے جاتے سرائے کے حبشی مالک کو کہہ دیا کہ اس کا بھائی مز سرائے میں رہے گا۔ اسے جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیا کردی جائے۔ اس کی ساری رقم میں خود ادا کروں گی۔ ناگنی نے سرائے کے مالک کو چاندی کا ایک قیمتی ٹکڑا پیشگی بھی دیا۔ سرائے والا بڑا خوش ہوا بولا۔

"جی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کے بھائی کو یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

سوڈانی تاجر جادوگر کا چھوٹا سا پراسرار محل پہاڑیوں میں شہر سے باہر جھیل کنارے واقع تھا۔ ناگنی ایک غریب نوجوان لڑکی کے بھیس میں وہاں گئی جس کو نوکری کی ضرورت تھی۔ محل کے اردگرد پرانے شاہی محل کی طرح ایک گہری کھائی بنائی گئی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ محل کے دروازے تک ایک پل عبور کر کے جانا پڑتا تھا۔ جو کھائی کے اوپر بنایا گیا تھا۔ دروازے پر دائیں بائیں دو حبشی غلام پہرہ دے رہے تھے۔ پل سے ہو کر ناگنی دروازے پر پہنچی تو پہر یدار حبشی نے پوچھا کہ۔

"وہ کون ہے اور کس سے ملنا چاہتی ہے۔" ناگنی نے کہا۔

"مصر کی ذہنی والی ہوں کبھی اپنے باپ کے ساتھ سوداگری کرتی تھی۔ ہمارا تجارات کے مال سے لدا ہوا جہاز

سمندر میں غرق ہوگیا۔ میرا باپ بھی سمندر میں ڈوب گیا۔ اب میں دنیا میں اکیلی ہوں چاہتی ہوں یہاں کوئی چھوٹا موٹا کام مل جائے تو زندگی کے دن پورے کرلوں۔" حبشی پہرے دار نے دوسرے پہرے دار کو دیکھا۔

"کیا خیال ہے۔" دوسرے پہرے دار نے کہا کہ۔ "اسے محل کے داروغہ تک پہنچا دیا جائے شاید بے چاری کو کوئی کام مل جائے۔" پہرے دار نے ایک نوکر ناگنی کے ساتھ کردیا۔ محل کے داروغہ کی بارہ دری میں محل کے باغ کے کونے میں تھی۔ وہ اپنی بارہ دری میں تہہ خانے کی سیڑھیوں کے قریب آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا اور دو حبشی نوکر اس کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔

"کون ہو تم.....؟" اس نے ناگنی کو دیکھتے ہی رعب سے پوچھا۔ ناگنی نے بڑے ادب اور عاجزی سے سلام کیا اور سارا حال بیان کیا داروغہ نے کہا۔

"جاؤ گودام میں جا کر مال صاف کرو۔"

"شکریہ جناب.....!!" ناگنی نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور نوکر سے گودام میں لے آیا۔

"تم خوش قسمت ہو جو داروغہ نے تمہیں کام دے دیا۔ نہیں تو وہ کسی کو یہاں نہیں لگنے دیتا۔" گودام کالی مرچ اور الائچی کی بوریوں سے بھرا ہوا تھا دوسری طرف خشک پھلوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ناگنی دن بھر یہاں کام کرتی تھی۔ رات کو وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کا بہانہ کر کے شہر میں مز کے پاس آئی اور سارا ماجرا بیان کیا۔

"میں دو ایک روز میں تمہاری بیوی تاج کا پتہ لگالوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔" رات ناگنی نے سوڈانی جادوگر کے محل میں گزاری۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ آدھی رات کو چوری چوری محل کا چکر لگانے اور حالات معلوم کرنے کی کوشش کرے لیکن کچھ سوچ کر اس نے ایسا نہ کیا اور سوگئی۔

صبح اٹھ کر اس نے دوسرے نوکروں کے ساتھ ناشتہ کیا اور کام شروع کردیا۔ گودام میں اس کے ساتھ ایک اور مصری مسلمان مزدور بھی کام کرتا تھا۔ ناگنی نے اس سے باتیں شروع کردیں وہ جادو اور ٹونے کی باتیں کرنے لگی۔ مصری مزدور نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ اس محل میں جادو کی بات کرنے کی مناہی ہے اگر نوکری عزیز ہے تو آئندہ کچھ جادو ٹونے کی بات نہ کرنا۔" ناگنی خاموش ہوگئی خدا جانے کہیں یہ ہی سوڈانی جادوگر کا جاسوس نہ ہو۔ اس سوال کا ناگنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کہ اتنے میں سوداگر کو کیا پڑی ہے کہ وہ جادو ٹونے اور طلسم کے پیچھے بھاگتا پھرے اور پھر ایک عورت پر طلسم کر کے اسے گھر میں ڈال لے؟ اس سوال کا وہ کھوج لگانا چاہتی تھی۔ مز کی بیوی بھی اسے نوکرانیوں اور کنیزوں میں ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کہ کہیں کسی کو اس پر شک نہ پڑ جائے۔ اتفاق سے وہاں ایک ایسا حادثہ ہوگیا کہ جس کی وجہ سے ناگنی کو طلسمی سوداگر کے قریب جانے کا بڑا قیمتی موقع مل گیا۔ سوڈان کے پہاڑی علاقے میں بڑے زہریلے سانپ ہوتے ہیں سوڈانی سوداگر کی بیٹی محل کے باغ میں شام کے وقت سیر کرتے کرتے ندی کی جھاڑیوں کے پاس گئی اور اچانک ایک کالے سانپ نے اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔ محل میں شور مچ گیا۔ سوداگر نے اپنی بچی کو بچانے کے لاکھ جتن کئے طلسم کیا۔ دم جھاڑا کیا مگر بیٹی کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ناگنی نے جب سنا کہ سوداگر کی بیٹی کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو وہ داروغہ کے پاس جا کر کہنی لگی۔

"مجھے سوداگر کے پاس لے چلو۔ میں اس کی بیٹی کی جان بچاؤں گی۔ مجھے سانپ کے کاٹے کا منتر آتا ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔" داروغہ اپنی شان بنانے کی خاطر ناگنی کو سوداگر کی شاہی خواب گاہ میں لے گیا۔ بڑے بڑے قیمتی قالین سوداگر کی شاہی خواب گاہ میں لے گیا۔ بڑے بڑے مخمل کے پردے لٹک رہے تھے سوداگر پریشان بیٹھا تھا۔ ناگنی نے قریب جا کر لڑکی کو دیکھا۔ یہ افریقہ کے سبز سانپ کا زہر تھا۔ جو اس کے جسم میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ سوداگر نے ناگنی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بھلا جہاں اس کا جادو طلسم اور ہر قسم کا علاج ناکام رہا ہو۔ وہاں ایک معمولی نوکرانی کیا کرسکتی تھی۔ سوداگر کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنی بیٹی کے سرہانے اداس بیٹھا تھا۔ ناگنی نے کہا۔

"غم نہ کریں خدا سے دعا مانگیں میں بھی کوشش کر

کے دیکھ لیتی ہوں۔" سوداگر نے ناگنی کی طرف آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"تم کیا کرلوگی بیٹی.....؟ اب کام ختم ہو چکا ہے۔" ناگنی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا کہ۔

"آپ ذرا پلنگ سے پرے ہٹ کر بیٹھ جائیں کیونکہ میں ایک منتر پڑھنے لگی ہوں۔"

"منتر پڑھنے سے کیا کوئی جن آئے گا یہاں۔"

"جن تو نہیں آئے گا لیکن وہ سانپ ضرور آئے گا جس نے آپ کی بیٹی کو کاٹا ہے۔" اس جواب پر سوداگر حیران ہو کر ناگنی کی طرف تکنے لگا۔

"وہ.....سانپ یہاں آکر کیا کرے گا.....؟" ناگنی نے کہا۔

"آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ صرف آپ ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ جائیں۔" سوداگر پلنگ سے ہٹ کر بیٹھ گیا ناگنی نے آنکھیں بند کر کے اس سانپ کو خاموش آواز سے سگنل دیا جس نے لڑکی کو ڈسا تھا۔ یہ سبز زہریلا سانپ سوداگر کی بیٹی کو ڈسنے کے بعد بڑے مزے سے باغ کی جھاڑیوں میں آرام کر رہا تھا۔ کہ اس کے جسم سے ایک سگنل ٹکرایا۔ ایسے سگنل سالوں بعد کہیں ملا کرتے ہیں سبز رنگ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناگنی اسے کہہ رہی تھی۔ فوراً پاس آجاؤ۔ سبز سانپ کی بھلا یہ مجال کہاں تھی کہ عظیم ناگنی دیوی کے حکم کو ٹال سکتا۔ بجلی کی طرح اٹھا اور جھاڑیوں سے نکل کر سوداگر کے محل کی طرف چل پڑا۔

سوداگر چپ چاپ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی بیٹی بے ہوش پڑی تھی۔ اور اس کی آخری سانسیں چل رہی تھیں ناگنی اس کے سرہانے آنکھیں کھولے خاموش کھڑی تھی۔ اتنے میں سوداگر نے ایک پھنکار کی آواز سنی۔ یہ سانپ کی پھنکار تھی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف سے وہ سہم سا گیا۔ خواب گاہ میں شمع دان روشن تھی۔ ہر شے صاف نظر آرہی تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک سبز رنگ کا پانچ فٹ لمبا سانپ دروازے کی دہلیز پر سے ہو کر اندر آرہا ہے۔ سوداگر دہشت زدہ ہو گیا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ناگنی کے قدموں کے قریب آکر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا۔

"میں جانتا ہوں آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے عظیم ناگنی۔" ناگنی نے خاموش آواز میں کہا۔

"تو پھر میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اس لڑکی کے جسم میں ڈالا ہوا اپنا سارا زہر واپس لے لو۔"

"جو حکم دیوی۔" سانپ رینگتا رینگتا پلنگ پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے دم توڑتی لڑکی کی پنڈلی پر اس جگہ منہ رکھ دیا جہاں اسے ڈسا گیا تھا۔ لڑکی کا باپ اور دو کنیزیں سہمی کھڑی یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ سانپ نے لڑکی کے جسم سے زہر نکالنا شروع کر دیا۔ جب لڑکی کے بدن سے سارا زہر نکل گیا تو لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنے باپ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ باپ نے بیٹی کو گلے لگا لیا اور خوشی کے آنسو رونے لگا۔ سانپ ناگنی کے حکم سے واپس جا چکا تھا لڑکی کے باپ نے ناگنی سے کہا۔

"میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو.....؟" ناگنی نے کہا۔

"میں کیا چاہتی ہوں یہ میں تنہائی میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔"

"آؤ میرے ساتھ....." اور سوداگر ناگنی کو ساتھ لے کر باہر بالکونی میں آ گیا۔ جس کے نیچے سنگتروں کے باغ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں آکر سوداگر نے پوچھا۔

"اب بتاؤ تم کیا انعام چاہتی ہو۔" ناگنی نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ ایک شامی عورت جس کا نام تاج ہے اور جو مزمر کی بیوی ہے تمہارے پاس ہے اور تم نے اس پر طلسم کر رکھا ہے بس مجھے وہ عورت چاہیے۔ تاکہ میں اسے اس کے خاوند کے حوالے کر کے آگے روانہ ہو سکوں۔"

سوڈانی سوداگر کا رنگ اتر گیا وہ سر جھکائے کچھ دیر سمندر کی لہروں کو تکتا رہا۔ پھر بولا۔

"مزمر کی بیوی میرے پاس تھی۔ میں نے اسے ایک ہزار اشرفیاں دے کر خریدا تھا۔ لیکن کلاں جادوگر اسے مجھ سے لے گیا اس نے کہا تھا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں لیکن تم نے میری بیٹی کی جان بچائی ہے اور میں نے تم سے انعام کا وعدہ کیا تھا۔ اب خدا جانے کے کلاں جادوگر میرا کیا حشر کرے۔" ناگنی نے پوچھا۔

"کلاں جادوگر کہاں رہتا ہے۔" سوداگر بولا۔

"یہاں سے دور جنگل میں ایک غار ہے وہ اس غار کے اندر رہتا ہے۔ مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم وہاں مت جانا۔ وہ بڑا زبردست جادوگر ہے اور انسان کو ایک پل میں زمین کے اندر غرق کر دیتا ہے۔ اس سے افریقہ کے سارے جادوگر ڈرتے ہیں۔" ناگنی نے کہا۔

"تمہارا شکریہ اب میں کلاں جادوگر کی تلاش میں جاتی ہوں۔ اور ہاں تم بے فکر رہنا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں انشاء اللہ اسے ہلاک کر کے اور مزمر کی بیوی کو واپس لے کر آؤں گی۔" سوداگر نے خشک سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

دوسرے روز ناگنی نے مزمر کو جا کر ساری کہانی سنائی اور کہا کہ "اب وہ کلاں جادوگر سے اس کی بیوی کو آزاد کرانے جا رہی ہے۔" مزمر پریشان ہو گیا۔

"ناگنی بہن کیا تم اتنے بڑے جادوگر کا مقابلہ کر سکو گی۔" ناگنی مسکرائی۔

"کوشش کروں گی۔"

دوپہر کے بعد ناگنی کلاں جادوگر کے غار کی طرف روانہ ہو گئی سوڈان کے جنگل اور میدان بڑے گرم تھے دھوپ بڑی تیز تھی ناگنی نے یہ راستہ کچھ پیدل طے کیا اور پھر وہ سفید عقاب بن کر اڑنے لگی سوداگر کی بتائی ہوئی نشانیاں اسے راستے میں مل رہی تھیں۔ پھر دور اسے ایک پہاڑ دکھائی دیا جس کے اوپر ایک مخروطی چٹان ابھری ہوئی تھی۔ یہی جادوگر کلاں کا غار ہے ناگنی اس پہاڑ کے قریب وادی میں اتر گئی نوکیلی چٹانیں کھڑی تھیں۔ دھوپ اور حبس بہت زیادہ تھی ناگنی ایک کچی پگڈنڈی پر پہاڑ کی طرف جا رہی تھی۔ کہ اچانک جھاڑیوں میں سے ایک سفید سانپ نکل کر ناگنی کے سامنے تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔ اس سانپ کے سر پر چھوٹا سا تاج تھا۔ اس علاقے کے سانپوں کا بادشاہ تھا۔ ناگنی نے اس سے پوچھا۔

"تم کس لئے آئے ہو؟" سانپوں کے بادشاہ سفید سانپ نے عرض کی۔

"مقدس ناگنی دیوی میں جانتا ہوں کہ آپ کلاں جادوگر سے مقابلہ کرنے جا رہی ہیں۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم میری کیا مدد کرو گے؟" سفید سانپ بولا۔

"مقدس ناگنی! آپ کلاں جادوگر کی طاقت کو نہیں جانتی، وہ بڑا خطرناک جادوگر ہے۔ میں آپ کی خدمت میں ایک مہرہ پیش کرنا چاہتا ہوں اس مہرے کو آپ منہ میں رکھ کر لیں گی تو غائب ہو جائیں گی۔ یہ ہمارے خاندان میں ہزاروں سالوں سے چلا آرہا ہے اس طرح سے آپ پر کلاں جادوگر کا اثر نہیں ہوگا۔" ناگنی سفید سانپ کو دیکھ رہی تھی۔ سانپ نے اپنے سر کو جھٹکا تو اس کے تاج میں سے نیلے رنگ کا ایک چمکتا ہوا ہیرا نیچے گر پڑا۔

"عظیم ناگنی یہ وہ مہرا ہے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جب ضرورت ہو اسے اپنے منہ میں ڈال لیں۔ آپ غائب ہو جائیں گی۔" ناگنی نے مسکرا کر سفید سانپ کا شکریہ ادا کیا اور مہرہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

سفید سانپ سلام کر کے واپس چلا گیا۔ ناگنی آگے روانہ ہو گئی۔ پہاڑی کا وہ غار اب بالکل سامنے آ گیا تھا۔ جس کے اندر کلاں جادوگر رہتا تھا۔ اور مزمر کی بیوی قید تھی۔ غار سے دو حبشی باہر نکلے۔ ان کی نظر ناگنی پر پڑی تو وہیں رک کر ناگنی کو تکنے لگے کہ یہ لڑکی ادھر کہاں سے چلی آرہی ہے۔ ناگنی ان کے قریب آ گئی اور بولی۔

"میں جنگل میں راستہ بھول گئی ہوں کیا تم مجھے بتاؤ گے۔ کہ شہر کو کونسا راستہ جاتا ہے۔" دونوں حبشی جادوگر کلاں کے شاگرد اور غلام تھے۔ جادوگر نے انہیں حکم دیا تھا کہ اس علاقے میں اگر کسی انسان کو دیکھیں تو اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ انہوں نے مسکرا کر ناگنی سے کہا۔

"بہن اندر آجاؤ۔ کچھ دیر آرام کرو۔ ہم پھر تمہارے ساتھ ایک آدمی کر دیں گے جو تمہیں شہر پہنچا آئے گا۔" ناگنی خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کہ کسی طرح سے غار کے اندر جائے اور وہاں کے حالات معلوم کرے۔ وہ ان دونوں حبشی جادوگروں کے ساتھ غار میں داخل ہو گئی۔ غار میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ آگے دیوار کے ساتھ ایک جگہ مشعل جل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے روشنی تھی۔ فضا میں حبس اور مردہ لاشوں اور

مشک کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی وہ ناگنی کو ایک چبوترے کے پاس لے جا کر بولے۔

"بہن تم یہاں آرام کرو۔ ہم تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتے ہیں۔" ناگنی سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ گہری سازش ہو رہی ہے لیکن وہ چاہتی تھی کہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے تاکہ یہ لوگ کھل کر سامنے آجائیں دونوں حبشی غار کے اندر ایک شگاف میں داخل ہو گئے ان کے جانے کے بعد ناگنی نے سوچا کہ غائب ہو کر پتہ کرنا چاہیے کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں اس نے جھٹ جیب سے مہرہ نکال کر منہ میں رکھ لیا اور غائب ہو گئی۔ اب وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غائب ہوتی ہی وہ بھی اس شگاف میں داخل ہو گئی اس کے سامنے ایک گول کمرہ تھا جہاں زمین پر شیر کی کھالیں بچھی تھیں ایک تخت پر کلاں جادوگر بیٹھا تھا اور ایک کالی بلی اس کی گود میں تھی، جس کی آنکھیں انسانوں جیسی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی عورت کی خوبصورت آنکھیں ہوں۔

کلاں جادوگر کا سر بہت بڑا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ تخت پر بیٹھا انسانی آنکھوں والی بلی کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے نوکروں نے جب اسے بتایا کہ ایک انسان کو وہ گھیر کر اندر لے آئے ہیں تو وہ خوشی سے مسکرا کر اس کے چوڑے نتھنے جو گینڈے کی طرح کے تھے پھیل گئے۔

"شاباش۔ اسے منتر پڑھ کر بے ہوش کر دو اور پھر اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس کی کھوپڑی توڑ کر اس کا بھیجا خود بھی کھاؤں اور بلی کو بھی کھلاؤں۔" دونوں نوکر جادوگر سر جھکا کر واپس ہو گئے ناگنی ابھی تک وہیں کھڑی تھی کلاں جادوگر کا طلسم بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں نوکر گھبرا کر اندر آئے اور کہا کہ

"جس انسان کو وہ اندر لائے تھے وہ غائب ہے۔"

کلاں جادوگر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور گرجا۔ "اسے تلاش کروں جاؤ۔" وہ خود بھی باہر نکل گیا ناگنی بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی کلاں غار کے ایک شگاف میں گھس گیا۔ وہ جادو کے ذریعے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کا شکار کہاں اور کس جگہ پر ہے شگاف کے اندر ایک گپھا تھی جہاں ایک انسانی ڈھانچہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ کلاں جادوگر نے انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی پر منتر پڑھ کر پھونک ماری اور پوچھا۔ "میرا شکار کہاں ہے۔" کھوپڑی کے ہونٹوں کی ہڈیاں ہلیں اور بولیں۔ "میں اسے اسی غار میں محسوس کر رہا ہوں مگر دیکھ نہیں سکتا۔"

"کیا کہا کیا وہ غیبی انسان ہے؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے وہ کوئی تم سے بھی بڑا جادوگر ہے۔" کلاں پریشان ہو گیا پھر غصے کی حالت میں اس نے انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی پر زور سے مکا مارا اور بلی کی بغل میں دبائے باہر نکل آیا۔ ناگنی دوسری کوٹھڑی میں گئی تو وہاں ایک جادوگر اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا ناگنی نے پیچھے سے جا کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ نوکر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے اسے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ لیکن اسے اپنی گردن پر انسان کا ہاتھ اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔ ناگنی بولی۔

"میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔ اگر نہ دیا تو میں اپنے طلسم کی مدد سے تمہیں اس جگہ جلا کر راکھ کر دوں گی۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں تمہارے جادوگر کلاں سے بڑی جادوگر ہوں۔ اب بتاؤ کہ تاج نام کی جس عورت کو کلاں نے اغوا کیا ہے وہ کہاں ہے؟" نوکر جادوگر سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بڑی زبردست طاقت والا جن بھوت ہے۔ اور اگر اس نے اس کے سوال کا صحیح جواب نہ دیا۔ تو وہ اسے بھسم کر کے رکھ دے گا۔ پھر اسے دولت کا لالچ بھی آ گیا۔ کہنے لگا۔

"تاج نام کی عورت کو کلاں نے کالی بلی بنا کر اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔" ناگنی نے پوچھا۔

"اب وہ کس طریقے سے دوبارہ انسان بن سکتی ہے۔" نوکر جادوگر بولا۔ "اس کا ایک طریقہ ہے کہ کلاں جادوگر کی کھوپڑی کا مغز کالی بلی کو کھلایا جائے جو کہ ایک ناممکن بات ہے۔" ناگنی نے کہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ اس غار سے باہر جنگل میں جا کر میرا انتظار کرو۔ اگر تمہاری اطلاع سچی ہوئی تو میں تمہیں اس کا انعام دوں گی۔" نوکر جادوگر باہر جانے لگا ہی تھا کہ کلاں جادوگر کی آواز گونجی۔

"تم مجھے دھوکہ دے کر یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے۔" اور دوسرے لمحے کلاں نے ایک ایسا منتر پڑھ کر نوکر پر پھونکا کہ اس کے سارے جسم میں آگ لگ گئی۔ وہ بھسم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پھر کلاں نے بلند آواز میں کہا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو.....؟" ناگنی نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ بلی اس کے پاس نہیں تھی۔ اور ناگنی نہیں چاہتی تھی کہ وہ بلی کو نقصان پہنچائے کلاں پھر کر چکر لگا رہا تھا اس نے اپنے سارے منتر پڑھ پڑھ کر پھونکے کہ شاید ناگنی جو غائب ہے اسے دکھائی دے جائے۔ لیکن ناگنی کو وہ نہ دیکھ سکا کلاں نے اپنے سارے جادوگر شاگردوں کو جمع کر کے کہا۔

"کوئی زبردست جن میری کنیز کالی بلی کی تلاش میں یہاں آ گیا ہے، اس کی طرف سے خبردار رہنا اور جہاں میں نے بلی کو چھپا دیا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کیونکہ اس بلی میں میری جان ہے۔" سارے جادوگر غار میں ادھر ادھر پہرہ دینے لگے ناگنی وہیں چل پھر کر بلی کو تلاش کر رہی تھی کہ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی اگر وہ ناگنی بن کر ایک خاص قسم کی بو چھوڑے تو بلی جہاں کہیں بھی ہوگی ایک بار ضرور اس بو پر غرائے گی۔ ناگنی غار کی اس طرف چلی گی جہاں اندھیرا تھا۔ یہاں وہ ناگنی کے روپ میں آئی اور خاص بو منہ سے خارج کی۔ اس کے ساتھ ہی اسے بلی کی غرانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز جیسے زمین کے اندر سے آ رہی تھی۔ ناگنی جھٹ ناگنی سے انسان بن کر غائب ہو گئی۔ اسے خیال آیا کہ کلاں جادوگر جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں سیڑھیاں نیچے جاتی تھی۔ ضرور بلی چبوترے کے نیچے کسی تہہ خانے میں قید ہے وہ بڑے کمرے میں آ گئی۔ تخت پر کلاں نہیں تھا غار میں جاتی سیڑھیوں پر ایک حبشی پہرہ دے رہا تھا۔ ناگنی غائب تھی۔ وہ حبشی کے قریب چلی گئی اور پھر اس کے ہاتھ سے نیزہ چھین کر پرے پھینکا اور کہا۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ نہیں تو میں تمہیں ہڑپ کر جاؤں گی۔" حبشی پہلے جن کا سن کر ڈرا ہوا تھا۔ وہ تو سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ گیا ناگنی قید خانے میں اتر گئی۔ یہاں اندھیرا تھا اس اندھیرے میں بلی کی انسانی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ناگنی بلی کے پاس آئی تو وہ غرانے لگی۔ ناگنی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اٹھا کر قمیض کے اندر چھپا لیا۔ اب بلی بھی ناگنی کے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی۔ ناگنی اسے لے کر تہہ خانے سے باہر نکل آئی۔ کلاں کو اپنے جادو کے زور سے پتہ چل گیا کہ کالی بلی غیبی جن کے قبضے میں آ گئی ہے وہ تو بے حد گھبرا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے کیونکہ غیبی جن بلی کے پھر سے انسان بنانے کیلئے اس کی کھوپڑی ضرور توڑ ڈالے گا۔ ادھر ناگنی کو بھی کلاں جادوگر کی تلاش تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے تھے کلاں نے اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچا اور وہاں جا پہنچا کوٹھڑی کے باہر دائرے کی لکیر تھی۔ اور کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ ناگنی نے وہ لکیر عبور کی تو بلی نے زور سے چیخ ماردی۔ ناگنی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بلی کی چیخ کی آواز کوٹھڑی کے اندر چھپے ہوئے کلاں جادوگر نے سنی تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ ایک بات وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ جو کوئی بھی غیبی انسان یا جن ہے۔ وہ اس سے زیادہ طاقت ور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے خوف زدہ ہے۔ اور اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ اب جو اس نے بلی کی آواز سنی تو کانپ اٹھا۔ سمجھ گیا کہ غیبی جن اسکی کوٹھڑی کے باہر پہنچ چکا ہے۔

کلاں نے اپنے قبیلے کے ایک بہت بڑے جادوگر کی روح کو منتر پھونک کر بلایا اور گڑگڑا کر کہا۔ "سامری کی قسم! میں بڑی سخت مصیبت میں پھنس گیا ہوں میری مدد کرو۔ مجھے اس خوفناک جن سے بچاؤ۔" جادوگر کی روح نے کہا۔

"کلاں افسوس میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے تمہاری موت سامنے دکھائی دے رہی ہے۔"

"تو پھر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" کلاں جادوگر نے چیخ کر کہا۔ روح غائب ہو گئی۔ ناگنی وہیں کھڑی تھی اس نے بلی کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ بلی غرائی اس کی آواز سن کر کلاں پر وحشت سوار ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر جان بچانے کی خاطر بھاگنے لگا۔ اسے جتنے جادو کے منتر یاد تھے۔ سارے پڑھ کر پھونک دیئے مگر ناگنی پر کسی کا اثر نہ ہوا بلی ایک بار پھر غرائی کلاں باہر کو بھاگا ناگنی نے کہا۔

"تم بچ کر نہ جا سکو گے۔ اس بلی کو تمہاری کھوپڑی کے مغز کی ضرورت ہے۔" ناگنی ہوا میں تیرتی

کلاں جادوگر کے ساتھ ساتھ جارہی تھی کلاں غار سے باہر دھوپ میں آ گیا۔ ادھر ایک دریا بہہ رہا تھا۔ جس کا پانی بر سات کی وجہ سے سرخ تھا جیسے خون بہہ رہا تھا۔ بلی بار بار غر ارہی تھی۔ بلی کی آواز کلاں کے جسم کو بے بس کر رہی تھی۔ جیسے اس کے جسم سے جان نکلی جارہی تھی۔ ناگنی نے آگے جا کر ایک بھاری پتھر کلاں جادوگر کی طرف لڑھکا دیا۔ وہ اس سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جلدی سے اٹھا اور پھر دریا کی طرف بھاگا۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دریا پار کر کے فرار ہو جائے گا لیکن ناگنی اسے کب بھاگنے کی اجازت دے سکتی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ جونہی کلاں جادوگر دریا کے کنارے پہنچا اور چھلانگ لگانی چاہی ویسے ہی ناگنی نے اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ کلان نے ایک قلا بازی کھائی اور دوسری طرف کو دوڑا۔ ناگنی سانپ کی شکل میں آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح اس پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا۔ ناگنی ہوا میں غوطہ لگا کر کلاں پر ایک عقاب کی طرح جھپٹی اور اسے گردن سے پکڑ کر ہوا میں پہاڑ سے بھی اوپر فضا میں بلند ہو گی۔ پھر اس نے کلاں کو نوکیلی چٹانوں کے اوپر پھینک دیا۔ انسانوں کی کھوپڑیاں کاٹ کر ان کے بھیجے کھانے والا ظالم جادوگر آخر اپنے انجام کو پہنچا۔ نیچے پتھروں پر گرتے ہی اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ کر الگ ہو گئی۔ کھوپڑی نوکیلے پتھروں سے ٹکرا کر کھل گئی اور اندر سے مغز نکل کر بکھر گیا۔ ناگنی فوراً نیچے آئی اس نے جادوگر کلاں کا مغز رومال میں باندھ لیا اور واپس سرائے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ناگنی وہاں بلی کو اس کا مغز نہیں کھلانا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خواہ مخواہ کسی پر اس کی خفیہ طاقت ظاہر ہو۔ سرائے کے قریب ایک جھاڑی میں آ کر ناگنی نے منہ سے مہر نکال لیا وہ۔ پھر سے انسانی شکل میں آ گئی۔ مہر جیب میں رکھا اور بلی بغل میں دبا سرائے میں آ گئی بلی کا دماغ چونکہ اس وقت تک حیوانی تھا۔ اس لئے اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کون کس طرح سے بچا کر لا رہا ہے۔

مز ناگنی کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ناگنی کے ہاتھ میں بلی دیکھی تو ناراض ہو کر بولا۔ ''اگر مجھے خبر ہوتی کہ تم میرے لئے کالی بلی اٹھالاؤ گی تو میں تمہیں کبھی نہ جانے دیتا اور نہ یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتا۔''

''پھر تم کیا کرتے۔'' ناگنی نے مسکرا کر پوچھا۔ مز بولا۔ ''پھر میں خود اپنی پیاری بیوی کی تلاش میں جاتا اور اسے جادوگر کی قید سے چھڑا کر لاتا۔'' ناگنی نے بلی مز کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''یہ لو اسے سنبھال کر رکھنا۔'' مز پرے ہٹ گیا۔

''خدا کے لیے اس خوفناک بلی کو مجھ سے پرے رکھو۔'' ناگنی نے کہا۔

''تمہیں اس بلی میں کوئی خاص چیز دکھائی نہیں دے رہی۔ غور سے دیکھو۔'' مز نے بلی کو روشنی میں آ کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں کسی عورت کی آنکھیں ہیں اور ان آنکھوں کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اچانک مز کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔

''یہ تو میری بیوی تاج کی آنکھیں ہیں۔''

''ہاں۔ اب تمہیں عقل آئی ہے۔''

''کیا اس ظالم جادوگر نے میری بیوی کی آنکھیں نکال کر اس بلی کو لگا دی ہیں؟ آہ، اب میں اپنی بیوی کو کہاں تلاش کروں گا۔'' مز رونے لگا ناگنی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''روؤ نہیں پاگل۔ یہی تمہاری بیوی ہے۔''

''یہ......؟'' مز چونکا۔ ''یہ بلی میری بیوی ہے......؟ لیکن یہ تو بلی ہے۔''

''ابھی انسان بن جائے گی۔ دیکھتے جاؤ خاموشی سے۔'' اور ناگنی نے جیب سے کلاں جادوگر کا مغز رومال سے نکال کر بلی کے آگے ڈال دیا۔ بلی بڑے مزے سے مغز چٹ کر گئی۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر خر خر کرنے لگی مز اور ناگنی بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، اتنے میں بلی بڑی ہونے لگی۔ وہ پھولتے پھولتے پورے انسان جتنے قد کی ہو گئی اور پھر ایک چیخ ماری کہ سرائے میں سارے مسافر گھبرا کر اپنی اپنی کوٹھڑیوں سے باہر نکل آئے۔ مز اور ناگنی بھی اچھل کر دیوار کے ساتھ لگ گئے چیخ کے ساتھ ہی بلی کی جگہ مز کی خوبصورت بیوی سامنے آ گئی۔ مز نے بیوی کو روتے ہوئے گلے لگا لیا۔ اس کی بیوی بھی خوشی سے رونے لگی۔ ناگنی نے کہا۔

''تمہیں خوش ہونا چاہئے مز۔ اور بہن تاج تم خوش قسمت ہو کہ اس خطرناک جادوگر کی قید سے آزاد ہو گئیں۔'' مز نے کہا۔

''یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ اگر میری ساتھی ناگنی نہ ہوتی تو آج تم میرے پاس نہ ہوتی۔'' مز کی بیوی کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اس نے بھی ناگنی کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے روز وہ دونوں اپنے گھر روانہ ہو گئے اور ناگنی ان کہ جانے کہ بعد شاہان اور شریم کہ بارے میں سوچنے لگی کہ وہ کہاں ہونگے ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ دیوالیہ کی آواز آئی کہ اب تمہارا، شان کا اور شریم کا سفر اب تمام ہوا میں اب تمہیں شاہان شریم کہ پاس بھیج رہی ہو۔ وہاں سے تم اپنی اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ گے اس کہ بعد ناگنی کا جسم ذرات میں تبدیل ہو کر غائب ہو گیا۔

☆......☆......☆

اب ہم شریم اور شاہان کے پاس لے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔ قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ شریم اسپین کے شہر قرطبہ کے ایک پرانے قبرستان میں معصوم لڑکی بیچکا کی تلاش میں گیا تھا۔ جس کی ماں اپنی بیٹی کی جدائی میں بیحد غم زدہ تھی۔ بیچکا کو کہیں سے پتھر کا طلسمی پنجہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے خاندان پر نحوست آ گئی اور بیچکا قرطبہ کے قبرستان میں چڑیل کے قبضے میں تھی۔ چڑیل اسے ایک ہفتے کے بعد چاند رات کو ذبح کر کے کھانے والی ہے۔ کیونکہ اس طرح سے وہ اپنے علاقہ کی ملکہ چڑیل بن سکے گی۔ اس نے بیچکا کو قبرستان کی ایک قبر کے اندر تابوت میں بند کر رکھا ہے۔ شریم لڑکی کی تلاش میں یہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے آگے ایک انسانی ڈھانچہ جارہا ہوتا ہے۔ جس کی کھوپڑی پر دیا روشن ہوتا ہے سرنگ میں پہنچ کر چڑیل اپنے زبردست جادو کے زور پر شریم کو دیکھ لیتی ہے اور پھر اسے گھٹنوں تک پتھر میں منجمد کر کے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ شاہان شریم کی تلاش کرتا کرتا بڑی مصیبتوں کے بعد جب اس قبرستان میں پہنچا تو اس کی طاقت بھی چڑیل کے زبردست جادو کا مقابلہ نہ کر سکی اور چڑیل نے اسے بھی گھٹنوں تک پتھر بنا کر دوسری کوٹھڑی میں دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جس وقت شاہان کو وہاں لایا گیا تو شریم نے اس کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ اس نے شاہان کو آواز بھی دی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی چڑیل نے شریم کو بے ہوش کر دیا۔ دوسری طرف شاہان بھی چڑیل کے نتھنوں سے نکلنے والے تیز بو والے سانس کی وجہ سے پتھر میں گھٹنوں تک گڑھے میں بے ہوش ہو گیا۔ چڑیل نے ایک قہقہہ لگایا شاہان اور شریم دونوں بے ہوش ہو چکے تھے۔ دوسری کوٹھڑی میں تابوت کے اندر بیچکا بے ہوش پڑی تھی۔ چڑیل نے چٹکی بجائی۔ انسانی مردے کا ڈھانچہ اندھیرے میں ستون کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کی کھوپڑی پر دیا جل رہا تھا۔ چڑیل نے اسے کہا ان قید یوں کی نگرانی کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ ڈھانچے کی کھوپڑی نے جبڑا ہلایا اور اس کی ہڈیوں سے کمزور سی آواز نکلی۔

جو حکم ملکہ چڑیل۔ شاہان کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنا جائزہ لیا اسکے دونوں پاؤں پتھر میں گڑھے ہوئے تھے۔ شاہان نے اپنے پاؤں تھوڑا سا زور لگا کر پتھر سے آزاد کرے۔ انسانی ڈھانچے اچانک چونک پڑا، اس نے شاہان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ شاہان نے بھرپور مکا مار کر اس کی گردن اڑا دی۔ اس کی کھوپڑی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ اور دیا زمین پر الٹ کر بجھ گیا۔ شاہان چاہتا تھا کہ وہ اس طریقے سے ڈھانچے پر حملہ کرے کہ وہ کوئی چیخ وغیرہ نکال کر چڑیل کو نہ بلا سکے۔ شاہان بھاگ کر دوسرے دالان میں گیا۔ وہ شریم کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ لگا اس قسم کا ایک چوکور پتھر دیکھا جس میں وہ خود گھٹنوں تک جا سکتا تھا۔ شاہان سمجھ گیا کہ شریم ضرور اسی پتھر میں گڑھا ہوا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ بولتا کیوں نہیں ہے کہیں اسے بھی چڑیل نے بیہوش تو نہیں کر دیا۔ شاہان شریم کے جسم کو چھو بھی سکتا تھا۔ اس نے ہولے ہولے پتھر کے پاس جا کر شریم کو آوازیں دینی شروع کر دیں شریم ابھی تک بے ہوش تھا۔ پھر اس کو ہوش آ گیا۔ اپنے سامنے شاہان کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا اور بولا۔

''شاہان بھائی میں زندہ ہوں صرف بے ہوش تھا۔ تم ٹھیک ہو ناں۔''

''ہاں شریم میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا تھا کہ

اس کم بخت چڑیل نے مجھے پتھر میں گاڑ دیا۔ یہ کوئی بڑی زبر دست چڑیل ہے شاہان اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ تم یہاں بچکا کی تلاش میں آئے تھا ناں۔"

"ہاں ہاں۔ وہ اسی جگہ کہیں کسی تابوت میں بند ہے ہمیں اسے تلاش کرنا ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس پہنچانا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ ایسا ہی کریں گے۔" شریم بولا پہلے مجھے تو اس پتھر کی قید سے آزاد کراؤ۔

شاہان نے پتھر کا چھوٹا سا چوکور چبوترے پر ایک زوردار ہاتھ مارا پتھر کے چھ سات ٹکڑے ہوگئے اور شریم آزاد ہوگیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل کر دوسری کوٹھری میں آگئے۔ یہی وہ کوٹھری تھی جس کے اندر بچکا کا تابوت رکھا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ تابوت کو نہ دیکھ سکے۔ شریم کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا تو اس نے ٹٹول کر اسے دیکھا۔

شاہان اس تابوت کو کھولو۔ یہ ضرور بچکا کا ہی تابوت ہے شاہان نے تابوت کے ڈھکن کو اوپر اٹھایا۔ تو ہلکے ہلکے اندھیرے میں انہوں نے دیکھا کہ تابوت کے اندر دبلی پتلی ہسپانوی لڑکی بچکا بیہوش پڑی تھی۔ یہی بچکا ہے شریم نے کہا۔ شاہان بولا۔

"چلو اسے لے کر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔"

شریم نے کہا۔

"وہ چڑیل ہمارا مقابلہ کرے گی۔ وہ ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دے گی۔" اتنے میں انہوں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی کوئی ان کی کوٹھری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاہان نے شریم سے کہا۔

"شریم دیوار کے ساتھ جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

شاہان ادھر کھلے دروازے کی سائیڈ میں ہوگیا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کہ باہر کون ہے دروازہ کھل گیا۔ شاہان نے دیکھا کہ ایک سفید پوش بزرگ جس کا چہرہ نورانی تھا اور سر کے ارد گرد روشنی پھوٹ رہی تھی اندر داخل ہوئے اور شاہان کی طرف بڑی شفقت سے دیکھ کر بولے۔

"بیٹا شاہان تم اور شریم ایک ماں کی بچھڑی ہوئی بچی کے لئے اتنے دکھ اٹھا رہے ہو۔ یہ ایک نیک کام ہے اسی کے لیے میں تمہاری مدد کو آیا ہوں یہ چڑیل بڑی طاقت کی مالک ہے تم اور شریم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" شاہان نے کہا۔

"آپ کون ہیں بابا؟"

"میں اس قبرستان کا بزرگ ہوں اور میرا مزار اسی قبرستان میں ہے۔ آج سے چھ سو برس پہلے میں اس شہر کا ایک درویش تھا تمہیں پریشانی میں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اپنے مزار سے نکل کر تمہارے پاس آیا ہوں۔" شاہان نے کہا۔

"آپ ہماری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں بچکا کو یہاں سے نکالنا ہے وہ اس تابوت میں بے ہوش ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"میں اس لڑکی کو یہاں سے باہر نہیں نکال سکتا اتنا مجھے اختیار نہیں ہے یہ کام تم ہی کو کرنا ہوگا۔ ہاں میں تمہیں اس چڑیل کے جادو کے اثر سے بچا سکتا ہوں اور اسی لئے میں یہاں آیا ہوں۔" اس کے بعد بزرگ نے اپنے نورانی چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر شریم اور شاہان کے سروں پر ہاتھ پھیرا پھر بچکا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"اب تم لوگوں پر چڑیل کے جادو کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور شریم کی طاقت بھی اس کو واپس مل گئی ہے اب چڑیل اسے نہیں دیکھ سکی گی۔" اتنا کہہ کر بزرگ اچانک دروازے میں سے گذر کر غائب ہوگئے۔ شریم نے شاہان سے کہا۔

"اب ہمیں اپنا کام تیز کر دینا چاہیے۔ کیونکہ چڑیل کا جادو ہم پر نہیں چلے گا۔" شاہان نے تابوت میں لیٹی ہوئی لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور بھولپن سے پوچھا۔

"میں...... میں کہاں ہوں؟" شاہان نے کہا۔

"خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں؟" بچکا بولی۔

"میری ماں......!"

"شی اونچی آواز نہ نکالو۔ ہم تمہیں تمہاری ماں کے پاس ہی لے جا رہے ہیں تمہیں چڑیل نے یہاں قید کر رکھا تھا ڈرنا نہیں چڑیل اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی آؤ ہمارے ساتھ۔" شریم نے بچکا پر اپنا آپ ظاہر نہیں کیا تھا۔

شاہان نے بچکا کو ساتھ لیا اور تابوت والی کوٹھری سے نکل کر ستونوں والے دالان میں آ گیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ یہاں سے گذر کر وہ کنوئیں میں اتر گئے۔ اور پھر سرنگ میں داخل ہوگئے شریم ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ شاہان نے کہا۔

"شریم خبردار رہنا۔" بچکا نے حیرانی سے کہا۔

"تم کسی سے باتیں کر رہے ہو۔" شاہان کو خیال نہیں رہا تھا کہ بچکا کو شریم کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور صرف ہونٹوں سے شی کر کے آگے بڑھتا چلا گیا۔ سرنگ قبر کے اندر جا کر ختم ہوگئی۔ یہی وہ قبر تھی جہاں چڑیل داخل ہوئی تھی۔ جونہی یہ لوگ قبر میں سے باہر نکل آئے ان کے پیچھے چیخوں کا شور مچ گیا۔ مڑ کر دیکھتے ہیں کہ دو سرخ دہکتی آنکھوں والی چڑیل بال کھولے اپنے دونوں لمبے بازو چلاتی شور مچاتی آنکھوں سے شعلے برساتی بھاگی چلی آ رہی ہیں۔ بچکا کے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑی شاہان نے جلدی سے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور شریم سے کہا کہ وہ تیزی سے باہر نکل کر بچکا کو اوپر کھینچ لے۔ اگرچہ انہیں علم تھا کہ ان پر جادو کا اثر نہیں ہوگا پھر بھی خطرہ تھا کہ بچکا لڑکی کو یہ چڑیل اپنے نوکیلی دانتوں سے چیر پھاڑ کر نہ رکھ دے۔ شریم اچھل کر قبر سے باہر نکل گیا اس نے ہاتھ نیچے کئے اور کہا۔

"بچکا کو اوپر پکڑاؤ۔" شاہان نے بچکا کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا ہی تھا کہ کہ چڑیل اس کے سر پر آ پہنچی۔ اس نے ایسی بھیانک چیخ ماری کے بچکا شاہان کے ہاتھ سے گر پڑی۔ چڑیل قبر کے شگاف تک آ پہنچی تھی۔ شاہان اب بے خوف ہوگیا تھا۔ اس کی طاقت واپس آ چکی تھی۔ جادو کا اثر اس پر نہیں ہو سکتا تھا۔ بچکا بے ہوش ہو کر قبر میں اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ شریم قبر کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے بھی چڑیل کی چیخ سن لی تھیں۔ اور اب اسے قبر کے شگاف میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا شریم نے اوپر سے آواز دی۔

"شاہان بچی بچکا کو بچاؤ۔ میں چڑیل سے نمٹ لوں گا۔" اور اس کے ساتھ ہی شریم نے قبر کے اندر چھلانگ لگا دی۔ وہ چڑیل کے بالکل آگے آ کر گرا اور اچھل کر چڑیل کی گردن پر سوار ہوگیا۔ شاہان نے بچکا کو کونے میں ڈال دیا اور خود بھی چڑیل سے گتھم گتھا ہوگیا۔ شریم اس دوران چڑیل کی گردن کے گرد رومال ڈال کر اسے زور سے کس رہا تھا۔ چڑیل کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ شاہان نے ڈر کے بغیر پتھر اٹھا کر چڑیل کے سر پر اس زور سے مارا کہ اس کی کھوپڑی سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ شریم چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔ چڑیل کی چیخوں سے قبرستان گونج اٹھا۔ چڑیل قبر میں گری پڑی تھی۔ اور تڑپ رہی تھی۔ آخر تڑپتے تڑپتے وہ ٹھنڈی ہو کر مر گئی۔ جونہی اس کی جان نکلی اس کی جگہ شاہان شریم کے سامنے ایک مردہ لومڑی پڑی تھی۔ چڑیل مرنے کے بعد اصلی روپ میں آ گئی تھی۔ شریم نے کہا۔

"یہ کوئی لومڑی تھی شاہان اس کو کسی جادوگر نے طلسم کر کے چڑیل بنا دیا تھا۔ پرانے مصر میں لومڑیوں پر زبر دست جادو ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چلو اب بچکا کو تو یہاں سے نکالیں۔ کہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

"تم اوپر چلو شریم۔" اوپر چلا گیا شاہان نے نیچے سے بے ہوش بچکا کو پکڑا دیا پھر شاہان بھی قبر سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے دیکھا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہلکی ہلکی بجلی بھی چمک رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ قرطبہ میں انہوں نے پہلے کبھی ایسا موسم نہیں دیکھا تھا۔ بادلوں میں گرج سنائی دی۔ شاہان نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑی سرد ڈراؤنی رات ہے۔ جلدی چلو شریم بارش آ گئی تو یہ بچی بھیگ جائے گی۔" شریم نے پوچھا۔

"کیا تمہیں اس بچی کے گھر کا پتہ ہے۔"

"ہاں تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ قبرستان سے باہر آ گئے۔ بچکا کو شریم نے اپنے کاندھو پر اٹھا رکھا تھا۔ کیونکہ غائب ہونے کی وجہ سے اسے بوجھ بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ قبرستان کے پرانے دروازے میں گذر کر شریم نے پوچھا۔

"اب کدھر جانا ہوگا۔ شریم بھائی؟" شاہان نے ایک طرف پہاڑی ڈھلان کو دیکھ کر کہا۔

"ہم اس پہاڑی سے نیچے اتر کر قرطبہ شہر سے باہر

چلے جائیں گے وہاں اس بچی کی ماں کا گھر ہے۔ جو اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے۔ دونوں پہاڑی کی ڈھلان پر پیدل ہی قرطبہ شہر کی طرف چل پڑے انہیں خبر ہی نہیں لگی تھی کہ جب وہ قبرستان کے پرانے دروازے سے باہر نکلے تھے تو ایک سایہ قبرستان سے نکل کر ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس سائے کی نہ شریم کو خبر تھی اور نہ شاہان کو دونوں باتیں کرتے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ بادل اب بار بار گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ شریم نے کہا۔

"میں زیادہ دیر تک اڑ نہیں سکتا نہیں تو تمہیں بھی ساتھ لے کر اڑ جاتا تھوڑا دور اڑ کر نیچے اترنا پڑتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں اس کی ضرورت بھی نہیں شریم ہم سامنے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ تو شہر کو جاتی کوئی گھوڑا گاڑی ضرور مل جائے گی۔

مجھے امید نہیں ہے سارا علاقہ سنسان ہے یہاں رات کے دو بجے گھوڑا گاڑی کہاں سے آئے گی بھلا؟ کچھ پتہ نہیں کہ آسمان سے کوئی فرشتہ ہی گھوڑا گاڑی لے کر ہمارے پاس آجائے۔ شریم نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچکا اس کے کندھے پر بے ہوش پڑی تھی۔ سڑک دور تک سنسان تھی دور نیچے وادی میں قرطبہ کا شہر تھا جہاں ایک جگہ بھی چراغ کی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس طرح چلتے چلتے شریم اور شاہان قرطبہ شہر سے باہر ایک ندی کے کنارے بچکا کے والدہ کے گھر پہنچ گئے۔ وہ سو رہی تھی۔ شاہان نے جا کر اسے جگایا اور بچکا اس کے حوالے کر کے کہا۔

"بہن میں تمہاری بیٹی کو بہت بڑی مصیبت سے چھڑا کر لایا ہوں۔ اب اسے گھر سے دور مت جانے دینا۔" بچکا کی ماں نے بچی کو سینے سے لگایا۔ بچکا کو بھی ہوش آچکا تھا۔ وہ ماں سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ شریم ان کے قریب کھڑا خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ شاہان جانے لگا تو بچکا کی ماں نے کہا۔

"رات طوفانی ہے تم یہاں سو جاؤ بیٹا میں سامنے کوٹھڑی میں بستر لگا دیتی ہوں۔" وہ تو جنگل میں بھی رات بسر کر سکتے تھے۔ اور پھر انہیں ناگنی کی بھی تلاش تھی اور قرطبہ کے اس پہاڑی کھنڈر پر جانا چاہتے تھے۔ جہاں انہیں سفید سانپ کے ملنے کی امید تھی۔ وہ اس سانپ سے ناگنی کا حال معلوم کرنا چاہتے تھے سفید سانپ عموماً قرطبہ کے جنگلوں میں آدھی رات کے بعد ہی نکلتا تھا اس نے بچکا کی ماں سے اجازت لی اور مکان سے باہر آگیا۔ شریم بھی اس کے ساتھ ہی مکان سے باہر آگیا۔ شاہان نے شریم کی تیز خوشبو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "شریم تم میرے ساتھ ہو ناں۔"

"ہاں میں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔"

"کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کاش کم از کم تم ہی مجھے دیکھ سکتے شاہان۔"

"ہاں کم از کم مجھے ضرور تمہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں ہم تمہاری خوشبو ضرور محسوس کر لیتے ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔" شاہان اور شریم قرطبہ شہر کی گلیوں بازاروں سے گزر رہے تھے رات اندھیری اور سنسان تھی۔ کہیں کہیں کسی گلی کونے میں چراغ جل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ شہر سے باہر نکل آئے۔ ان کے سامنے ایک باغیچہ تھا وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے..... ابھی دونوں ناگنی کے بارے میں بات ہی کر رہے تھے کہ ناگنی بھی وہاں آن موجود ہوئی۔ دونوں ناگنی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کو اپنے ساتھ گزری سنانے لگے۔

ناگنی کو آئے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ دیویہ کی آواز آئی۔ شاہان ناگنی اور شریم تم تینوں کا سفر اب تمام ہوا۔ اب تم اپنی اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ۔ ناگنی ناگ بھون، شاہان اور شریم اپنی دنیا میں۔ یہ سن کر تینوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

پھر شاہان اور شریم نے ناگنی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر الوداع کہا اور ناگنی کا جسم ذرات میں تبدیل ہو کر غائب ہو گیا۔ یہی حال شاہان اور شریم کے ساتھ ہوا اور دونوں ہی غائب ہو گئے۔ شاہان کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اسی قبرستان کہ باہر پایا۔ جس میں اسے دفنایا گیا تھا۔ شاہان یہی سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب اس کی ماں باپ اور بہن اس کو زندہ حالت میں دیکھیں گے تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ یہ سوچ کر شاہان گھر کی طرف چل پڑا.....

ختم شد

موم کی گڑیا

مریم فاطمہ - کراچی

اچانک دوشیزہ کی فلک شگاف چیخ سنائی دی کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا تھا کیونکہ وہ ایک پل میں اندھی ہوچکی تھی اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

حسد اور جلن کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گی

کیتھرین کو بچپن سے ہی پرانی چیزیں اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ وہ پرانے میگزینز اور اخبارات سنبھال کر رکھتی۔ حتیٰ کہ اس نے بچپن کے کھلونے وغیرہ بھی سنبھال کر رکھے ہوئے تھی۔ اس بات سے اس کی ماں بہت تنگ تھی۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ اس کا نام شرلی تھا۔ شرلی کا مزاج بہت مختلف سا تھا۔ وہ بس چپ چاپ الگ تھلگ رہتی جبکہ دوسری طرف کیتھرین لاڈ پیار میں بہت بگڑی ہوئی تھی۔

کیتھرین کو شرلی سے بڑی چڑ محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اور پر کشش بھی۔ وہ دونوں الگ الگ کلاس میں پڑھتی تھیں۔ شرلی اس سے ایک سال پیچھے تھی۔

ایک روز جب کیتھرین اپنے اسکول سے گھر واپس آرہی تھی تو راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک

نہایت بوڑھی عورت ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ایک لکڑی کا پرانا خوبصورت ڈبہ تھا۔ اس بڑھیا کے چہرے پر نہایت عیاری ٹپک رہی تھی۔

کیتھرین بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ دوپہر کا وقت تھا مگر دھوپ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ بڑھیا نے کیتھرین کو دیکھا تو فوراً بولی۔ ''تمہیں کچھ چاہیے کیا؟ کچھ خریدو گی مجھ سے؟ میرے پاس پرانی چیزیں ہیں۔''

پرانی چیزوں کا نام سن کر کیتھرین خوش ہوگئی۔ اور دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ ''آپ کے پاس کیا ہے؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

بڑھیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر مکاری سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''جادو۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' کیتھرین ہکلاتے ہوئے بولی۔

''میرے پاس جادو کی طاقت ہے۔ اس ڈبے میں ایسی چیزیں ہیں جن کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ انمول ہے۔ لیکن تم بتاؤ کہ تمہیں کیا چاہیے؟''

''پہلے مجھے وہ چیزیں دکھادیں اس کے بعد ہی کچھ فیصلہ کرسکوں گی۔'' کیتھرین بے تابی سے بولی۔

''ہاں ہاں ابھی دکھاتی ہوں لو دیکھو۔'' اتنا کہہ کر بڑھیا نے وہ لکڑی کا بکس کھولا۔ اس میں ایک ٹوٹا ہوا آئینہ رکھا تھا مگر اس کا فریم نہایت خوبصورت تھا۔ ''یہ دیکھو بالوں کا برش۔ اس سے بال کنگھی کرو گی تو بہت گھنے ہو جائیں گے۔'' کیتھرین کو لگا کہ یہ بڑھیا بس یونہی خواہ مخواہ جیسے بالوں کے شیمپو کا اشتہار کرنے لگ گئی ہے۔

کیتھرین نے قدرے بے زاری سے کہا۔ ''یہ نہیں مجھے کوئی کام کی چیز دکھاؤ۔''

''تو پھر یہ دیکھو!'' اتنا کہہ کر بڑھیا نے ایک گڑیا دکھائی۔ یہ موم کی بنی ہوئی نہایت خوبصورت گڑیا تھی۔

کیتھرین نے اسے دیکھا تو بس خوشی سے جھوم اٹھی اور بار بار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ بڑھیا نے اسے اس طرح خوش ہوتے دیکھا تو مکاری سے ہنس دی۔ ''مجھے یہ گڑیا خریدنی ہے۔ کتنے کی ہے؟''

''دو ڈالر کی۔'' بڑھیا کیتھرین کے جواب میں بولی۔ ''لیکن میرے پاس تو اس وقت صرف ایک ڈالر ہی ہے۔ پلیز مجھے یہ ایک ڈالر میں ہی دے دیں ناں۔'' کیتھرین کے لہجے میں التجا در آئی۔

''ہاں..... ہاں لے لو۔ یہ لو گڑیا تمہاری ہوئی۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' کیتھرین نے اس بڑھیا کو ایک ڈالر دیا اور وہ گڑیا اپنے اسکول بیگ میں رکھ لی اور دوبارہ گھر کی طرف تیز تیز قدموں سی چلنے لگی۔

بڑھیا اس کے جانے کے بعد بھیانک قہقہے لگانے لگی۔ گھر پہنچ کر کیتھرین نے اسکول بیگ لے جا کر اپنے کمرے میں رکھ دیا۔ اور سوچا کہ رات کے کسی پہر اسے نکال کر دیکھے گی۔ ورنہ اس کی مام اس کی گڑیا کو کچرے میں پھینکنے کا حکم صادر فرمادیں گی۔

اس کی مام اس سے پہلے بھی زبردستی اس کی کئی چیزیں پھنکوا چکی تھیں۔ اس نے دوپہر کا کھانا خوب مزے لے لے کر کھایا۔ آج تو بھوک بھی کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔

شاید خوشی کی وجہ سے، پھر جب رات کے بارہ بج گئے تو کیتھرین کمبل ایک طرف ہٹا کر بستر سے باہر نکلی اور چلتی ہوئی اپنی رائٹنگ ٹیبل تک آئی اور اپنا اسکول بیگ کھولا۔ اس میں سے موم کی گڑیا باہر نکالی اور میز پہ رکھ دی۔ پھر خود کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔ اور گڑیا کو دیکھنے کے لئے اس نے ٹیبل لیمپ جلایا۔ اس کی روشنی میں اس نے گڑیا کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت گڑیا تھی۔

کیتھرین نے گڑیا کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے کیتھرین کی نظر گڑیا کی کمر پہ پڑی۔ اس پہ لکھا تھا۔ ''اپنی پہلی خواہش کرو۔''

کیتھرین تھوڑا سا ٹھٹکی اسے یاد آیا کہ جس بوڑھی عورت سے اس نے یہ گڑیا خریدی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ''میرے پاس جادو کی طاقت ہے۔''

کیتھرین نے سوچا کہ ''ہوسکتا ہے کہ یہ گڑیا بھی جادو کی ہو۔ اور میں کوئی بھی خواہش کروں اور وہ پوری ہو جائے۔'' مگر پھر اس نے سوچا کہ ایسا تو بچوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ حقیقت میں آج تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور کچھ سوچ کر بولی۔ ''ویسے تو تم ایک بے جان سی گڑیا ہو لیکن پھر بھی خواہش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ میری چوبیس گھنٹے چپ رہنے والی بہن میرے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرے۔ میری دوستوں سے بھی باتیں کیا کرے۔'' اور پھر وہ چپ ہوگئی۔ اس نے گڑیا کو سنبھال کر واپس اپنے اسکول بیگ میں ڈالا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کی مام کمرے کی صفائی کرتے ہوئے کہیں یہ گڑیا کو دیکھ نہ لیں اور اٹھا کر کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیں۔ اس لیے اب اسے اسکول بیگ میں رکھنا ہی محفوظ تھا۔

اگلے روز جب وہ سو کر اٹھی تو کمرے سے باہر نکلتے ہی نجانے شرلی کہاں سے آگئی اور اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ ''کیتھرین میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم اتنی دیر سے اٹھی ہو۔ آؤ دیکھو میں نے تمہارے لیے کیا بنایا ہے۔ گرما گرم نوڈلز۔ تمہارے فیورٹ ہیں ناں۔ چلو جلدی سے کھانا شروع کرو ورنہ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کیتھرین کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے کرسی پہ بیٹھا دیا۔ پھر ایک پلیٹ میں مزے دار نوڈلز لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

کیتھرین مزے لے لے کر کھانے لگی۔ آج اسے اپنی بہن شرلی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد کیتھرین اور شرلی اسکول کے لئے چلی گئیں۔

اور جب اسکول میں بریک کا وقت ہوا تو کینٹین میں بیٹھ کر شرلی کیتھرین کے دوستوں سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب کیتھرین کے بوائے فرینڈ کا دل شرلی نے چرالیا۔ وہ سے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک شرلی کو نجانے کیا سوجھی کہ کیک کا پیس اٹھا کر کیتھرین کے منہ پر پھینک دیا۔

''یہ تم نے کیا کیا بے وقوف۔'' کیتھرین چڑ کر بولی۔ جبکہ شرلی اور کیتھرین کے تمام دوست بوائے فرینڈ سمیت ہنس رہے تھے۔ کیتھرین نے اپنے بوائے فرینڈ مارک کو گھور کر دیکھا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور ہنستا رہا۔

کیتھرین کے لئے اب شرلی عذاب بن گئی تھی۔ وہ خوبصوت تو تھی ہی لیکن اب اس کے ساتھ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ اس وجہ سے اس کے کئی نئے دوست بن گئے تھے۔

کیتھرین کے لئے ایک نئی مصیبت تو تب کھڑی ہوئی جب مارک نے اس سے دوستی چھوڑ کر شرلی کو اپنالیا۔ کیتھرین کا تو مارے صدمے کے برا حال تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کرے، اسے مارک اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ وہ اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس رات شدید سردی پڑ رہی تھی۔ برفباری کئی گھنٹے سے جاری تھی، کیتھرین گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ شرلی تو بالکل چپ رہنے والی لڑکی تھی پھر اچانک اسے کیا ہوگیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ جب سے اس نے اس موم کی گڑیا سے یہ خواہش کی تھی کہ شرلی ہنسنے بولنے لگ جائے اس کے بعد سے ہی شرلی نے سب سے بات کرنی شروع کردی ہے اور تو اور اس کمینی نے اس کے بوائے فرینڈ تک کو اس سے چرالیا ہے۔ اور یہ سب اس کی خوبصورتی کی وجہ سے بھی ہوا ہے۔ پھر کچھ خیال کرتے ہوئے اس نے اپنا اسکول بیگ کھولا اور اس میں سے وہی موم کی گڑیا نکالی۔ اسے غور سے دیکھا۔

اس کی کمر پہ لکھا تھا۔ ''اپنی دوسری خواہش کا اظہار کرو۔''

حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات سے کیتھرین مسکرانے لگی لیکن یہ بڑی شیطانی قسم کی مسکراہٹ تھی۔ کیتھرین نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ میں شرلی سے زیادہ خوبصورت ہو جاؤں۔'' اور پھر اسے یوں لگا جیسے گڑیا مسکرائی ہو، کیتھرین تھوڑا ڈر سی گئی۔ اس لیے گڑیا کو واپس بیگ میں ڈالا اور مزے سے بستر میں گھس کر سو گئی۔

اگلے روز اتوار تھا اسکول سے چھٹی تھی مگر پھر بھی ان کی مام انہیں زیادہ سے زیادہ دس بجے تک اٹھا دیتیں تھیں اور اس دن انہیں بھی اپنے ساتھ کام کرواتیں، کیتھرین اپنے کمرے سے باہر آئی تو اس کی مام نے کہا۔ ''کیتھرین ناشتہ کر لو پھر جا کر واش روم صاف کرو۔''

''اوکے مام۔'' کیتھرین نے بلند آواز سے کہا اور ناشتہ کرتے ہی واش روم صاف کرنے چلی گئی۔ اس نے کیبنیٹ میں سے فلش صاف کرنے کے لئے تیزاب کی شیشی جیسے ہی نکالی تو پتا چلا کہ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اور سارا تیزاب کیتھرین کے چہرے پہ گر گیا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

ساری چیخ و پکار سن کر اس کے مام، ڈیڈ اور شرلی وہاں آ گئے تو دیکھا کہ کیتھرین زمین پر بیٹھی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے چیخ رہی ہے۔ اسے فوری طور سے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں اسے فوری ٹریٹمنٹ دیا گیا۔

ڈاکٹرز نے کہا کہ ''اس کا چہرہ تیزاب گرنے کی وجہ سے بہت زیادہ جھلس گیا ہے۔ اس لیے سرجری کرنی پڑے گی۔'' پھر اس کی سرجری کی گئی۔ اور جب سرجری کے بعد کیتھرین پوری طرح صحت یاب ہونے پر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو وہ شرلی سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔

پھر اسے خیال آیا کہ تکلیف تو بہت برداشت کرنی پڑی مگر میری دوسری خواہش بھی پوری ہو گئی اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، کیوں ناں تیسری خواہش کی جائے۔

کیتھرین نے جلدی سے اپنا اسکول بیگ کھولا۔ اور اس میں سے موم کی گڑیا باہر نکالی، اسے غور سے دیکھا۔ اس کی کمر پہ لکھا تھا۔

''اپنی تیسری اور آخری خواہش بیان کرو۔'' اسی وقت بڑے زور سے بجلی کڑکی۔ ایک لمحے کو کیتھرین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا پردہ سرکا ہوا تھا اور باہر سے بند شیشے کی کھڑکی میں سے تیز بارش ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اس بار آخری خواہش کرنی ہے تو بھلا کیا خواہش کی جائے۔ اس نے گڑیا کو مضبوطی سے تھام لیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا چاہیے۔

وہ مارک کو بے حد پسند کرتی تھی لیکن اس کمینی شرلی کی بچی نے اس سے اس کا بوائے فرینڈ چھین لیا تھا۔ ''لیکن جس طرح میں تڑپی ہوں اب تڑپنے کی باری شرلی کی ہے۔'' اور پھر اس کے ساتھ ہی کیتھرین نے بولنے کے لئے لب کھولے۔

''میری تیسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن شرلی آئندہ مجھے کبھی بھی نظر نہ آئے۔''

اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کیونکہ وہ اندھی ہو چکی تھی۔ اس کے حلق سے دلخراش چیخیں نکل رہی تھیں۔ مگر اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

سچ کہتے ہیں لالچ میں انسان واقعی اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ بس اپنے فائدے کے لئے ہی سوچتا ہے اور یہی کیتھرین نے بھی کیا اور اس کی سزا بھی بھگتی، کیتھرین کو اس وقت اپنے کانوں میں اپنی چیخوں کے ساتھ اس موم کی گڑیا کی ہنسی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

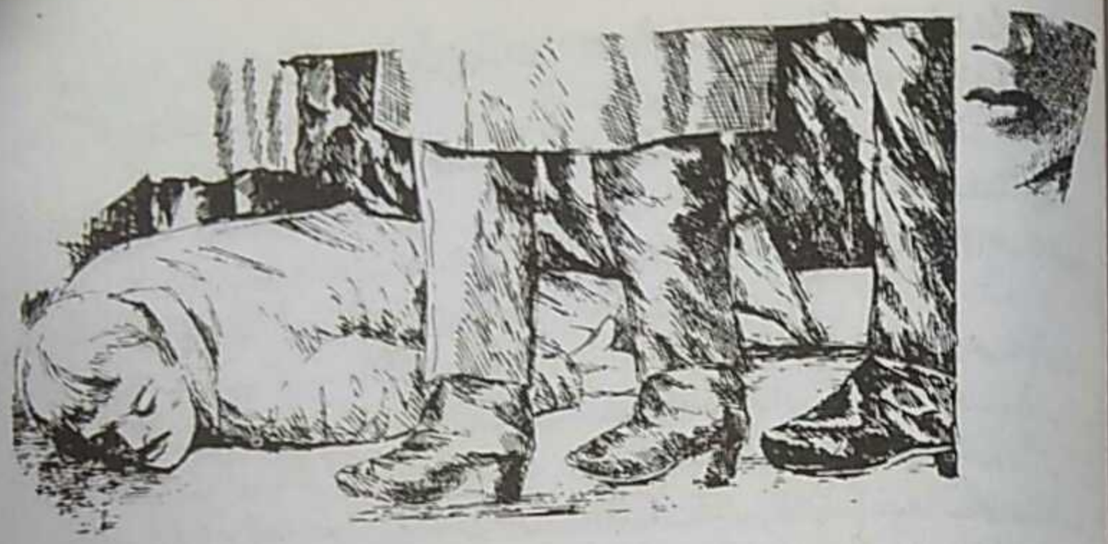

خونی مینار

گلاب خان سولنگی-لاہور

اچانک نوجوان پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا اور دوشیزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی کہ اتنے میں دوشیزہ کا ہاتھ نوجوان کی طرف بڑھا اور چند لمحوں میں نوجوان کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

خودغرضی اور مطلب پرستی کی حیرت ناک داستان.....جس میں سبق.....ہی سبق ہے

دو ہزار میٹر کی اونچائی پر بیٹھے جوڑے کی نظر نیچے شہر کی اونچی نیچی بلڈنگ پر ٹکی ہوئی تھی، وہ آج شہر کے سب سے طویل ٹاور کے ٹاپ پر پکنک پوائنٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''تمہیں اتنی اونچائی سے ڈر نہیں لگتا مارٹن؟''

مارٹن نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ ''ڈارلنگ! مجھے اونچائی سے نہیں پر اونچائی سے گرنے سے ڈر لگتا ہے۔'' اپنے شوہر کا جواب سن کر جولیا ایک دم چونک گئی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

مارٹن نے ایک دفعہ پھر نیچے دیکھا۔ اونچائی سے گرنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں' ہمیشہ میرا تجسس رہا ہے لوگ اونچائی پر پہنچنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، مرڈر، ریپ، ڈاکہ، چوری وغیرہ وغیرہ..... وہ کہتے ہیں ناں کہ جو بوئے گا وہی کاٹے گا جیسی کرنی ویسی بھرنی۔''

مارٹن کا سنجیدہ روپ دیکھ کر جولیا ایک دم گھبرا سی گئی، ''کم آن ڈارلنگ ہم یہاں اتنی اونچائی پر لوگوں سے پرے صرف انجوائے کرنے آئے ہیں اور تم ہو کہ کسی کالج کے لیکچرار کی طرح لیکچر دیے جا رہے ہو۔ دیکھو بادل کے ٹکڑے کتنے نزدیک آ گئے ہیں، موسم کتنا سہانا ہو گیا ہے، میرا مطلب ہے پہلے تو کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔'' مارٹن زیر لب مسکرایا

''سوری ڈارلنگ کچھ کاروباری پریشانیاں تھیں، ویسے ایک راز کی بات بتاؤں مجھے بھی اونچائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ تم نے اصرار کیا اور میں یہاں چلا آیا۔ خیر

چھوڑو ان باتوں کو، ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ کوئی مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں۔"

"اگر یہ شادی تمہارے والدین کی مرضی سے ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔"

جولیا اس مرتبہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "یو آر رائٹ مجھے بھاگ کر یوں شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔" میرا باپ ہمیشہ تمہارے مخالف رہا ہے۔ اس کے مطابق غریب لوگوں پر کبھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا، چونکہ تم غریب تھے اس لئے وہ اس رشتے کے لیے کبھی ہاں نہیں کرتے اس لیے میں نے ہمیشہ کے لیے ان کا گھر چھوڑ دیا اور آج میں تمہاری بانہوں میں ہوں۔"

بارش شروع ہو چکی تھی۔ شام کا وقت تھا لیکن بادلوں کی وجہ سے اندھیرے کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ مارٹن اپنی عادت کے خلاف آج سگریٹ نوشی کچھ کثرت سے کر رہا تھا۔ جبکہ جولیا موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"فرض کرو تم اگر اونچائی سے گر دیا کوئی گرا دے تو کیا محسوس ہوگا؟" اس اچانک سوال پر جولیا چونک سی گئی۔ "یار تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟ یہ بار بار اونچائی سے گرنا، مجھے بھلا اونچائی سے کون گرائے گا؟ اور فرض کرو کسی نے گرا بھی دیا تو تم ہو ناں بچانے والے۔"

مارٹن تھوڑا شرمندہ ہوا، "یار آج میرے پاس بولنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے، تم بور تو نہیں ہو رہی؟"

جولیا مسکرائی۔ "اتنے اونچے پکنک پوائنٹ پر بھلا کون بور ہو سکتا ہے، مگر تمہاری باتیں ضرور بور کر رہی ہیں۔"

کافی دیر کے توقف کے بعد مارٹن بولا۔ "تمہیں نہیں لگتا کہ اپنے باپ کی اتنی ساری دولت ٹھکرا کر تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے؟"

"تو؟" جولیا بولی۔ "تمہیں پانے کے لیے ایسی غلطی بار بار کروں گی اور تم ہی تو کہتے تھے کہ تمہیں صرف مجھ سے غرض ہے میری دولت سے نہیں۔"

مارٹن کے بدلتے تیور دیکھ کر جولیا کافی حیرت زدہ ہو رہی تھی۔ "مگر دولت کی طلب کس کو نہیں ہے، ہر چھوٹا بڑا بچہ اور بوڑھا امیر غریب سب لوگ دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور تم ہو کہ دولت سے بھاگتی ہو، دس از ناٹ فیئر۔" جولیا نے اپنی بانہیں مارٹن کی طرف پھیلا دیں۔ "بٹ آل ان فیئر ان لو اینڈ وار۔"

مارٹن اس کی بانہیں ہٹاتے ہوئے۔ "میڈم یہ اکیسویں صدی ہے۔ تم کس دور میں جی رہی ہو۔ بھلا پیار سے بھی پیٹ بھرتا ہے کیا؟"

شہر کا یہ طویل مرکزی ٹاور سیاحوں اور عام شہریوں کے لئے کھلا رہتا تھا اس لئے عموماً چھٹی والے دنوں میں یہاں اچھا خاصا رش لگا رہتا تھا لیکن اس کے برعکس آج ورکنگ ڈے تھا اس لئے اس نو بیاہے جوڑے کو خاصا وقت مل گیا تھا۔ رات کے سائے مزید گہرے ہوتے جا رہے تھے، نیچے شہر کی رونق تو دیکھنے لائق تھی لیکن دو ہزار فٹ کی بلندی پر آہستہ آہستہ خوف و سناٹے کا راج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"جولیا میں گھما پھرا کے بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے تم سے شادی صرف اس آس پر کی تھی کہ تمہارے باپ کی بے شمار دولت میں سے مجھے بھی کچھ مل جائے گا، لیکن گھر سے خالی ہاتھ بھاگ کر تم نے بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے اور اب اپنے والد سے ترک تعلق کر کے مزید مالی نقصان اٹھا رہی ہو۔"

دیکھو اب بھی وقت ہے اپنے والد سے معافی مانگ لو اور اب ان سے صلح کر لو۔ اب بھی وقت گیا نہیں، وہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور میرا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

جولیا جو کہ اب تک موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی، اس مرتبہ منہ چڑا کر بولی۔ "اس کا مطلب ہے تم میری دولت کی لالچ میں مجھ سے شادی کی.....؟

بے وفا انسان! میں نے تمہاری خاطر اپنا سب کچھ چھوڑا اور آج تم مجھے لیکچر دے رہے ہو؟ لعنت ہے تمہاری زندگی پر۔"

مارٹن کو اب طیش آ گیا اس نے غصے سے تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیئے اور جیب سے پسٹل نکال کر جولیا پر تان لیا۔ "بے وفا! جو عورت اپنے سگے ماں باپ کی نہیں ہو سکی وہ بھلا میری کیا ہو سکے گی، میں آج تیرا کام تمام کرتا

ہوں۔ اب بھی وقت ہے فیصلہ کر لے ایک خوش حال زندگی یا خوف ناک موت، میری شرط مان لے اور اپنی زندگی بچا لے۔ یہاں ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے جو تمہیں مجھ سے بچا سکے دھکا دوں گا تو دھڑام سے نیچے اور سانس اوپر.....!"

جولیا ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ "مارٹن مجھے پتا ہے تم مذاق کر رہے ہو۔ دیکھو میں ایسا مذاق ہرگز نہیں برداشت کروں گی۔"

موبائیل کی بیل بجی مارٹن نے فون اٹھایا ہیلو سر ابھی ڈیل پکی نہیں ہوئی، میں بعد میں آپ سے بات کروں گا۔" پسٹل بدستور اس کے ہاتھ میں تھا اور جولیا کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح ٹاور کے گرل پر ٹیک لگائے خوف زدہ نظروں سے مارٹن کو تکے جا رہی تھی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ مارٹن اس کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ دیکھو مارٹن رات کافی ہو گئی ہے۔ اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی آؤ واپس گھر چلتے ہیں۔"

مارٹن نے دوبارہ غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ "کیسا گھر وہ گھر جو تم چھوڑ آئی ہو اپنے باپ کا گھر اور چھوڑ آئی ہو بے شمار دولت تمہارا جسم میرے کسی کام کا نہیں۔ میں آخری دفعہ تمہیں موقع دیتا ہوں اپنے والد سے صلح کر لو یہ میری بھی خواہش ہے۔"

جولیا بھی غصے سے۔ "اچھا اب میں سمجھی، میرا باپ مجھے شکست دینے کے لیے تمہارے ساتھ مل گیا ہے، اور یہ ڈیل..... لگتا ہے اسی نے مجھے مارنے کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔" مارٹن جھلا کر بولا۔ "بے رحم عورت! کوئی باپ بھی اپنے اولاد سے بدلا لیتا ہے کیا، ہاں تم صحیح سمجھی میری اس کے ساتھ ڈیل ضرور ہوئی ہے مگر تمہیں مارنے کی نہیں پر تمہیں واپس کرنے کی، اس کے عیوض وہ مجھے دولت میں تول دے گا۔ مگر تم نے اپنی اپنا اور جھوٹی ضد پر میرا منصوبہ ناکام بنا دیا ہے، اور اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

جولیا جو کہ اب تک اپنے والد کو دشمن سمجھ رہی تھی اس کی بھلائیوں کو یاد کر کے رونے لگی۔

"ڈیڈ نے ٹھیک کہا تھا تمہارے جیسا غریب اور خود غرض انسان مجھے برباد کر دے گا۔ اور میں نے ڈیڈ سے تمہاری خاطر بغاوت کی، اب مجھے موت کی کوئی پرواہ نہیں ہے، مگر افسوس تم جیسے بزدل اور خود غرض انسان کے ہاتھوں ماری جاؤں گی۔"

"مطلبی عورت خود غرض میں ہوں یا تم جس ماں باپ نے اتنے سالوں تمہیں پالا پوسا اور دکھ دیکھے تم میری خاطر ان کو بھی چھوڑ آئی ہو، کل کسی اور کی خاطر مجھے بھی چھوڑ سکتی ہو۔ مجھے نفرت ہے ایسی عورتوں پر، پتا ہے برسوں پہلے میری بہن بھی اپنے ایک آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور پیچھے میں نے دیکھا تھا اپنے والدین کو روتے ہوئے۔

پل پل مرتے ہوئے، وہ کسی غیر کی خاطر ہمیں آنسوؤں میں ڈوبتا ہوا چھوڑ گئی۔ اس دن سے آج تک میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ گھر سے فرار ہونے والی کسی بھی لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا، اب تک سینکڑوں کو اپنے انجام تک پہنچا چکا ہوں اور آج تیری باری ہے۔" مارٹن نے تیزی سے جولیا کو زور کا دھکا دیا اور چشم زدن میں دیکھا کہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ جولیا کا وجود دو ہزار میٹر کے بلند مینار سے زمین پر گرا اور ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

مارٹن نے کالا چشمہ پہنا اور پھر نیچے کی طرف لفٹ رواں دواں ہو گئی۔

اور پھر اچانک مارٹن کے سامنے جولیا کا وجود نمودار ہوا..... اور مارٹن پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"جولیا تم.....!!"

"مارٹن تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے تھے۔" سوچا کہ میں اکیلی تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گی، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ تمہارے لئے میں نے سب کو چھوڑا..... اور تم مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

مارٹن پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ اور جولیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کہ اتنے میں جولیا کا سیدھا ہاتھ اٹھا اور مارٹن کی گردن کی طرف بڑھا۔ اور پھر چند لمحے میں مارٹن کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر کو ابل پڑیں اور جولیا کی روح اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔

میلا

نثار فاطمہ - بہلول پور

جاگیردار صاحب دوبارہ میلا لگوارہے ہیں۔ ظاہر ہے اب وہ جانتے ہوں گے کہ ایسا کچھ بھی خطرہ باقی نہیں رہا جو پانچ سال پہلے تھا ورنہ میلے کی منادی کیوں کرواتے، اسی لئے سب گاؤں والے سب کچھ بھول کر دوبارہ .....

خوف وہراس کی وادی میں بل کھاتی ہوئی اور دل کو دہلاتی ہوئی حیرت انگیز، تحیر انگیز کہانی

"**آپی** کہاں ہیں آپ۔" حسنین یہ کہتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ "ارے آپی کدھر ہیں آپ۔"

"آرہی ہوں کیوں شور مچا رہے ہو۔" مہتاب یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر آئی اور آتے ہی حسنین سے پوچھنے لگی کہ "کیا بات ہے کیوں شور کررہے ہو؟"

حسنین نے کہا۔ "آپی بات ہی ایسی ہے آپ سنو گی تو خوشی سے جھوم اٹھو گی۔" تب مہتاب بولی۔

"اچھا بھئی اب بتا بھی دو کہ ایسی کون سی خوشی کی بات ہے۔"

تب حسنین نے بتایا کہ "گاؤں میں پھر سے میلا لگے گا۔"

مہتاب یہ سن کر بہت خوش ہوئی اپنے چھوٹے بھائی یعنی حسنین سے پوچھنے لگی۔ "اسے کس نے بتایا کہ گاؤں میں میلہ لگے گا۔" تو حسنین نے بتایا کہ وہ چوک میں اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا تھا تو شرجیل نے بتایا کہ "اس بار گاؤں میں پھر سے میلا لگے گا۔"

"پچھلے 5 سال سے تو گاؤں میں کبھی میلا نہیں لگا، گاؤں کے جاگیردار صاحب نے سختی سے منع کردیا تھا گاؤں میں کوئی میلے کا اہتمام نہیں کیا جائے گا پھر اب کی بار کیسے مان گئے۔" مہتاب نے اپنے بھائی سے کہا اور بولی۔ "تم لوگوں کو ضرور کوئی غلط خبر ملی ہے۔" تبھی انہیں ڈھول کی آواز آئی، ڈھول والا میلے کی منادی کرنے آیا تھا اور پھر کہنے لگا۔ "سنو سنو گاؤں والو گاؤں میں پھر سے میلا لگے گا اور تمام گاؤں والے میلے میں ضرور شریک ہوں میلہ پرسوں جمعرات کے روز سے شروع ہوگا۔

گاؤں والے یہ سن کر حیران رہ گئے اور ہم بہن بھائی بہت خوش ہوئے، تبھی حسنین ڈھول والے کے پیچھے چلا گیا، ڈھول والے کے ڈھول بجانے پر گاؤں کے بچے اس کے پیچھے ڈھول کی آواز سن کر ناچنا شروع کررہے تھے۔ گاؤں میں سب لوگ بہت خوش تھے کہ گاؤں میں پھر سے میلا لگے گا۔ گاؤں میں ہر سال میلا لگتا تھا جس میں دور دور سے لوگ شریک ہونے کے لئے آتے لیکن پچھلے پانچ سالوں سے گاؤں میں میلا لگانے پر پابندی لگادی تھی، گاؤں کے جاگیردار صاحب نے ایک ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے جس نے ہمارے گاؤں والوں کی ساری خوشیاں چھین لیں ڈر اور خوف باقی چھوڑ دیا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" میں یہ آواز سن کر چونک اٹھی۔ یہ میری دوست شازیہ کی آواز تھی میں نے تجھے

میری سوچوں سے آ کر نکالا۔ "کچھ نہیں بس ایسے ہی۔" میں یہہ کر چپ ہوگئی۔

تبھی شازیہ بولی۔ "گاؤں میں میلا لگ رہا ہے کیا تم اس بات سے خوش نہیں۔" میں نے اسے بتایا کہ "میں بہت خوش ہوں اور اس بات پر لیکن....."

میرے "لیکن" کو اس نے اچک لیا اور بولی۔ "لیکن کچھ نہیں بھول جاؤ۔ جاگیردار صاحب دوبارہ میلا لگوارہے ہیں۔ ظاہر ہے اب وہ جانتے ہوں گے کہ ایسا کچھ بھی خطرہ باقی نہیں رہا جو پانچ سال پہلے تھا ورنہ میلے کی منادی کیوں کرواتے، اسی لئے سب گاؤں والے سب کچھ بھول کر دوبارہ گاؤں میں لگنے والے میلے میں شریک ہونا چاہتے تھے اس لئے تم بھی اپنی سوچوں کے دائرے کو بند کردو اور میرے ساتھ کنوئیں پر پانی لینے چلو۔"

میں نے بھی اپنا مٹکا اٹھایا۔ اماں کو بتایا اور شازیہ کے ساتھ کنویں سے پانی لینے چلی گئی۔ کنواں ہمارے گاؤں میں گھروں سے تھوڑا ہٹ کر تھا۔ جہاں سے سب گاؤں والے پانی لاتے، سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت تھے، راستے میں چلتے ہوئے ہم باتیں کرتی جارہی تھیں اور کل میلے میں جانے اور وہاں سے چوڑیاں اور بہت سی چیزیں خریدنے کے منصوبے بنارہی تھیں۔

کنویں سے پانی بھرتے ہوئے ہمیں کسی کی باتوں کی آواز آئی تو ہم دونوں وہیں چھپ کر بیٹھ گئیں اور باتوں کو خاموشی سے سننے لگیں کہ کس طرف سے آرہی ہے اور کون باتیں کررہا ہے۔

تبھی شازیہ نے مجھے بتایا کہ آواز سامنے درختوں کی طرف سے آرہی ہے۔"

ہم نے درختوں کی طرف سے آنے والی آوازوں کو سننا شروع کردیا۔ "دلاور شہباز نے گاؤں آ کر گاؤں میں پھر سے میلا لگوانے کے لئے اعلان کروادیا ہے۔" یہ آواز جاگیردار کے بڑے بیٹے شفاقت کی آواز تھی اور دلاور ان کے گھر میں کام کرتا تھا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ وہ ان کا خاندانی نوکر تھا اور ان کے گھر ہی میں ان کے ساتھ رہتا تھا اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔

شفاقت کے ہر اچھے اور برے کام میں اس کی مدد کرتا تھا، شفاقت بہت گھٹیا اور بری عادت کا انسان تھا جو ہر لڑکی کو بری نظر سے دیکھتا تھا۔ "ہاں صاحب جی۔" دلاور نے کہا کہ "شہباز بابو گاؤں میں میلے پر ہونے والے واقعہ کو نہیں جانتے تھے جاگیردار صاحب

کی بھی بات نہ مانی اور اعلان کروادیا۔ جاگیر دار صاحب تو خود بھی اصل بات سے ناآشنا ہیں کہ آخر اس میلے میں ہونے والے حادثے کی اصل بات کیا ہے، اگر انہیں یا شہباز اور گاؤں والوں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ ماہین کے ساتھ جو بھی ہوا وہ میں نے کیا تھا تو مجھے زندہ درگور کردیں گے۔ سب اور عامر پر جھوٹا الزام لگوا کر ہم نے اسے عمر قید کی سزا دلوادی۔ تمہیں یاد ہے ناں دلاور ماہین نے کیا کہا تھا مرتے ہوئے کہ ''میں پھر آؤں گی اپنی موت کا بدلہ لینے وہ بھی آج کے دن کی طرح میلے کا ہی دن ہوگا۔'' اور گاؤں میں پھر میلا لگ رہا ہے اگر وہ آگئی تو مجھے مار دے گی بلکہ ہمیں مار دے گی۔''

''نہیں بڑے صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا وہ واپس نہیں آسکتی مرگئی ہے، پانچ سال ہوگئے اسے مرے ہوئے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' دلاور نے شفاقت کو تسلی دیتے ہوئے کہا تبھی اچانک سے آوازیں آنا بند ہوگئیں ہم نے اٹھ کر دیکھا تو وہ دونوں شراب کے نشے میں بے سدھ ہوئے پڑے تھے۔ شاید زیادہ نشہ کرلینے سے بے ہوش ہوگئے تھے۔

یہ سب سن کر ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی سب کچھ گھومتا ہوا نظر آنے لگا میں نے شازیہ سے کہا۔ ''چلو یہاں سے چلتے ہیں۔'' ہم دونوں جتنی جلدی وہاں سے بھاگ سکتی تھیں بھاگ کر گھر آگئیں اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ہمیں اب ماہین کے اصل قاتل کا پتہ چل گیا تھا کہ اسے کس نے مارا تھا سارے گاؤں نے مل کر عامر کو جو بے قصور تھا سزا دلوادی جب کہ اصل قاتل گاؤں میں مزے سے گھوم رہا تھا۔ میں نے شازیہ سے کہا کہ ''وہ گھر جا کر ان باتوں کا ذکر کسی سے بھی نہ کرے اگر شفاقت کو پتہ چل گیا کہ ہم اس کی حقیقت کو جان گئے ہیں تو وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے گھر والوں کے ساتھ بھی غلط کردے گا جس طرح ماہین عامر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ کیا۔

شفاقت کے برعکس شہباز بابو اور جاگیر دار صاحب بہت اچھے اور نیک انسان تھے۔ شہباز بابو لندن سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے آئے تھے اور جاگیر دار صاحب ہر لحاظ سے گاؤں والوں کا ساتھ دیتے اور گاؤں والوں کے اچھے اور برے وقت میں ہمیشہ ان کے ساتھ کھڑے رہتے تھے۔

دیر سے گھر آنے پر اماں جیسے پہلے ہی تیار تھی مجھ پر چڑھ دوڑنے کے لئے اور آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کردی، اتنی دیر کیوں لگائی، کہاں رہ گئی تھی کتنی بار کہا ہے کہ جوان جہان لڑکیوں کا یہ کوئی کام نہیں ہوتا کہ دیر تک گھر سے باہر گھومتی رہیں کبھی کھیتوں میں جاتی ہیں کبھی کنوئیں پر اور کبھی بچوں کے ساتھ کھیلنے، گھر میں ماں کا کوئی خیال نہیں کہ کوئی کام ہی ماں کے ساتھ کروادوں۔

اس پر میں نے کہا کہ ''میری پیاری اماں کنوئیں سے پانی لانا بھی تو کام ہے اگر میں پانی نہ لاؤں تو کہاں سے پانی پئیں گے اور کنویاں اتنی دور ہے کہ وہاں تم جا نہیں سکتی، جاتے جاتے بھی پورے تین گھنٹے لگا آؤ۔''

اتنے میں ابا اور حسنین بھی آگئے، شام کے کھانے کے بعد اماں ابا میلے کے متعلق باتیں کرنے لگے اور ہم دونوں بہن بھائی بھی اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے، میں آسمان پر چاند کو دیکھنے لگی جو ستاروں کے جھرمٹ میں بہت خوب صورت لگ رہا تھا، چاند ستاروں کی ایک دوسرے کے ساتھ اتنی محبت دیکھ کر مجھے ماہین اور عامر کی محبت یاد آگئی، ماہین میری اور شازیہ کی دوست تھی، ہم تینوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ سہیلیاں کم بہنیں زیادہ تھیں۔ ماہین کا گھر بھی میرے گھر کے ساتھ تھا۔

ماہین کے ابا اور میرے ابا کھیتوں میں کام کرتے تھے جب کہ شازیہ کے ابا لوہار تھے، عامر کا گھر بھی ہمارے محلے میں تھا، عامر بہت اچھا نیک اور سلجھا ہوا لڑکا تھا، کسی بھی لڑکی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، محلے کی ہر لڑکی کو اپنی بہن کہتا تھا لیکن ماہین کے لئے اس

کے دل میں اٹھتی ہوئی محبت کو ہم نے بھی محسوس کیا تھا، اسکول سے آتے جاتے وہ ہمارے راستے میں کھڑا رہتا تھا، جب کھیتوں میں جاتی تو وہاں ہم سے پہلے ہی پہنچا ہوتا، کنوئیں پر پانی لینے جاتی تو وہاں پر بھی پہلے موجود ہوتا۔

ماہین کے دل میں بھی اس کی محبت کو ہم نے محسوس کرلیا تھا، جو اس کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیتی تھی لیکن ان دونوں نے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔

پھر ایک دن اسکول جاتے ہوئے عامر نے ایک خط ماہین کی طرف پھینکا، جس میں اس نے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا۔

ماہین خط پڑھ کر بہت خوش ہوئی اور خوشی خوشی اس کی محبت کو قبول کرلیا، اور پھر ملاقاتیں اور محبت کی باتیں ہونے لگیں، وہ ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے، دونوں کے گھر والے ان کی شادی کے لئے بھی مان گئے تھے۔

ان دنوں گاؤں میں میلا لگنے والا تھا۔ ماہین نے عامر سے کہا کہ ''وہ میلے کے ختم ہونے کے بعد اپنے گھر والوں کو میرے گھر رشتے کے لئے بھیج دے۔

میلے والے دن ہم تینوں گھر والوں کے ساتھ میلے پر چلی گئیں۔ وہاں بہت مزے کی نئی نئی چیزیں خریدیں، میلے پر بہت مزے مزے کے پکوان بھی تھے بہت سے لوگ دور دور سے میلے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، تبھی ماہین کو یاد آیا کہ وہ گھر میں دادی کو کھانا دینا اور دوائی دینا بھول گئی تھی اور پھر ہمیں یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ کچھ دیر میں ہی آجاتی ہے۔ دادی کو کھانا اور دوائی دے کر۔

ہم نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو چلی جا اور جلدی سے آجا۔'' اور پھر وہ چلی گئی۔

ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہماری پکی سہیلی ہم سے آخری بار مل کر جارہی ہے۔ اور پھر کبھی نہیں آئے گی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ عامر ہمارے پاس آیا اس نے ہم سے کہا کہ ماہین کہیں نظر نہیں آرہی کہاں ہے؟

اسے ہم نے بتایا کہ وہ دادی کو کھانا اور دوائی دینے کے لئے گھر گئی ہے تو وہ اس کے اکیلے جانے پر پریشان ہوگیا اور اس کے پیچھے چلا گیا۔

دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ دلاور شور مچاتا ہوا آیا اور آکر بتانے لگا کہ عامر نے ماہین کی عزت پامال کرنے کی کوشش کی تو ماہین نے اپنے بچاؤ کے لئے خود کو ختم کرلیا۔ یہ سن کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

ماہین کی امی کہنے لگی کہ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عامر ایسا کیوں کرے ان دونوں کی تو ہم شادی کرنے والے ہیں۔''

دلاور بولا۔ ''خود جا کر دیکھ لیں پتہ چل جائے گا۔''

جب ہم سب نے وہاں جا کر دیکھا جہاں پر واقع ہوا تھا جاگیر دار کی حویلی کے باہر والے کمرے میں تو وہاں عامر ماہین کے پاس بے سدھ ہو کر بیٹھا تھا، شفاقت بھی وہاں پر پہلے سے کھڑا تھا، شفاقت نے کہا۔ ''وہ اور دلاور میلے میں آنے کے لئے گھر سے نکلے تھے تو انہیں حویلی کے باہر والے کمرے سے چیخوں کی آوازیں آئیں وہ دونوں جب دوڑتے ہوئے وہاں پر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ عامر ماہین کی طرف بڑھ رہا تھا وہ اسے کہہ رہی تھی۔ ''عامر مجھے جانے دو میں نے تم سے محبت کی تو تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا۔

''وہ عامر کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی، لیکن عامر اس کی طرف بڑھتا چلا گیا جب اس نے اس کے دوپٹے کو ہاتھ لگایا تو ماہین نے وہاں پر پڑی ہوئی ٹوٹی ہوئی شیشے کی بوتل اپنے پیٹ کے اندر گھونپ لی۔

میں جب دروازہ توڑ کر اندر گیا تو بہت دیر ہوگئی تھی۔ ماہین اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی کسی کو بھی اس بات پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ عامر ماہین کے ساتھ ایسا کرسکتا تھا وہ تو اس سے بہت پیار کرتا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا۔

جاگیردار صاحب نے پولیس کو بلوایا، شفاقت اور ولاور کی گواہی پر عامر کو عمر قید ہوگئی، پولیس کے لاکھ سوال پوچھنے پر بھی کہ ”تم نے اس لڑکی کو دھوکہ کیوں دیا اور کیوں اس کی عزت پامال کرنے کی کوشش کی، وہ تو تم سے پیار کرتی تھی اور آخر اس نے تمہاری محبت میں جان دے دی۔“

پولیس والوں کے سوالوں پر بھی وہ کچھ نہ بولتا اور بس ایک ہی بات کہتا تھا کہ ”میری ماہین آئے گی اور آکر خود بتائے گی کہ میرا عامر بے قصور ہے اور اپنے عامر کو بھی ساتھ لے جائے گی وہ مجھے اکیلے نہیں چھوڑ کے جاسکتی وہ آئے گی۔“

پولیس والوں نے عامر کی جب یہ حالت دیکھی تو پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا اور اب وہ پاگل خانے میں کیسا ہے یہ کوئی نہیں جانتا اس کے گھر والوں کو سارے گاؤں والوں نے گاؤں سے نکال دیا۔

شفاقت نے جاگیردار صاحب سے کہا۔ ”اباجی اب گاؤں میں میلا بند کروادیں گاؤں کی بہن بیٹیوں کی عزت محفوظ نہیں رہی، گاؤں کے اوباش لڑکے ایسے موقعوں کا انتظار کرتے ہیں۔“

جاگیردار صاحب نے شفاقت کی رائے سے اتفاق کیا اور گاؤں والوں کے ساتھ بات کر کے میلا بند کروادیا اور گاؤں والوں نے شفاقت کو اپنا محسن مانا کہ اس نے گاؤں والوں کی بھلائی کے لئے یہ قدم اٹھایا، اور وقت کے ساتھ گاؤں والے اپنے کام کاج میں مصروف ہوگئے۔

وقت گزرتا گیا اور سب لوگ اپنے معمول پر آگئے لیکن ماہین کی کمی جن کو تھی ان کے لئے کبھی بھی پوری نہ ہوسکی۔ ماہین اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، اپنی بیٹی کی دردناک موت کا صدمہ اس کے ماں باپ برداشت نہ کرسکے اور جلد ہی اس دنیا سے چلے گئے اور پھر ماہین کے اصل قاتل کا پتہ چل گیا۔

شفاقت کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ماہین سچ میں اپنا بدلہ لینے کے لئے آئے گی، گاؤں کے لوگوں کے مطابق جب انسپکٹر نے انہیں پولیس اسٹیشن عامر کی حالت کے بارے میں بتانے کے لئے بلایا تو وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ماہین واپس آئے گی۔

اور پھر میلے کا دن آ گیا سب لوگ تیار ہو کر صبح ہی صبح اپنے کام ختم کرنے کے لئے میلے کی طرف جانے لگے اور ہم بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ میلے میں چلے گئے، ہمیں ماہین کی کمی آج شدت سے محسوس ہو رہی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں اور اپنی پیاری سہیلی ماہین کو بلاؤں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ماہین ہمارے ساتھ ہے اس کے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

میلے میں میرا اور شازیہ کا بالکل بھی دل نہیں لگ رہا تھا رہ رہ کر ہمیں ماہین کی یاد آ رہی تھی جی چاہ رہا تھا کہ میلہ چھوڑ کر چلے جائیں۔

دوسری طرف شفاقت اپنی حویلی میں اپنے کمرے میں ڈر سے دبکا بیٹھا تھا اور دلاور میلے میں نہیں گیا تھا بلکہ اپنے کمرے میں بیٹھا شراب کے گلاس پر گلاس پیے جا رہا تھا۔

تبھی ٹھیک 2 بجے جس ٹائم پر شفاقت ماہین کو اٹھا کر لایا تھا ٹھیک اسی ٹائم آواز آئی۔ ”شفاقت علی میلے پر نہیں گئے۔“

”کو...... کو...... کون ہے۔“ شفاقت کی ڈری سہمی آواز نکلی۔ ”کون ڈرا رہا ہے مجھے۔“

شفاقت میری آواز کو نہیں پہچانتے بھول گئے تھے کہ میں کیسے چلائی تھی میں تم سے اپنی جان اپنی عزت کی بھیک مانگ رہی تھی اور تم نے میری ایک نا سنی اور اسی نشے میں دھت مجھے اپنی درندگی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی اور میں نے اپنی جان دے دی اور پھر عامر پر جھوٹا الزام لگا دیا، اسے پاگل کروادیا، اس کے گھر والوں کو گاؤں سے نکال دیا، گاؤں والوں کی نظر میں عامر کو اوباش اور پتہ نہیں کیا کیا بنا دیا، تمہیں تمہارے ہر ایک گناہ کی سزا ملے گی جو تم نے کیے ہیں، شفاقت آج تم نہیں بچو گے۔“

ت...... ت...... ت تم مجھے معاف کردو میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔“ یہ کہتا ہوا شفاقت دروازے کی طرف بڑھا۔

”بھاگ شفاقت بھاگ اگر خود کو بچا سکتا ہے تو بھاگ جتنا بھاگ سکتا ہے۔“ شفاقت نے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف دوڑ لگادی، اس کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے، وہ میلے کو جانے والے راستے کی طرف بھاگ رہا تھا اور ماہین کی روح اس کے پیچھے تھی وہ اسے گاؤں والوں کے سامنے لانا چاہتی تھی تاکہ وہ خود اپنی سچائی سب لوگوں کو بتائے اور عامر کو بے گناہ ثابت کر کے اپنی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

میلے میں لوگوں نے جب شفاقت کو اپنی طرف اتنی بری حالت میں بھاگتے ہوئے آتے دیکھا تو پریشان ہوگئے جاگیردار صاحب اور شہباز بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔

”کیا ہوا۔“

تو وہ بولا۔ ”مجھے بچالو اباجی۔ وہ۔ وہ۔ وہ مجھے مار ڈالے گی۔“

کون مار ڈالے گی بھائی آپ کو شہباز بولا۔

”مجھے بتائیں۔“

”وہ ماہین......“

ماہین کا نام سن کر سب گاؤں والے دھک سے رہ گئے خود جاگیردار صاحب بولے کہ۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو ماہین تو مرگئی ہے وہ کیسے واپس آسکتی ہے۔ اسے مرے 5 سال ہوگئے ہیں اور اسے تو عامر نے مارا تھا وہ تمہیں کیوں مارے گی۔“ تبھی ماہین کی روح سب کے سامنے حاضر ہوئی سب اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اتنے میں ماہین کی آواز گونجی۔ بول شفاقت مجھے کس نے مارا تھا، عامر نے یا تو نے۔“ سب شفاقت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جاگیردار صاحب نے پوچھا کہ ”بتاؤ کیا سچ ہے۔“

شفاقت بولا۔ ”میں نے مارا تھا ماہین کو، میلے والے دن میں نے بہت شراب پی رکھی تھی اور باہر حویلی میں بیٹھا تھا، تبھی میں نے ماہین کو وہاں سے اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا ماہین ویسے بھی مجھے بہت پسند تھی عامر کے ساتھ اس کی محبت کا سن کر میرا خون کھول اٹھتا تھا اور اس دن جب کوئی بھی گاؤں میں نہیں تھا میں نے ماہین کو اکیلے آتے دیکھا تو دلاور سے کہہ کر اسے اس کے گھر کے باہر سے اٹھوالیا اور وہ اسے حویلی لے آیا میں اپنے غلط ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسے وہاں لایا تھا۔

ماہین نے مجھے بہت واسطے دیئے، منتیں کیں لیکن میں نے اس کی ایک نہ مانی اور اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ماہین نے وہاں پڑی ہوئی ایک شیشے کی شراب کی بوتل توڑی اور توڑ کر ہاتھ میں پکڑلی اور کہنے لگی۔

”اگر میں آگے بڑھا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔“

میں شراب کے نشے میں دھت تھا اور مجھے کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی اور اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں نے جیسے ہی اس کے دوپٹے کو ہاتھ لگایا تو اس نے شیشے کی بوتل اپنے پیٹ میں گھونپ دی، اس کی چیخ سن کر پتہ نہیں کہاں سے عامر ادھر آگیا اس نے جب اس کو اس حالت میں دیکھا اور پاس مجھے کھڑا دیکھا تو وہ سب سمجھ گیا جب وہ اس کے پاس پہنچا تو وہ آخری سانسیں لے رہی تھیں اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئی۔

”شفاقت میں واپس آؤں گی آج کے دن کی طرح وہ بھی میلے کا دن ہوگا۔“

عامر اس کے پاس بیٹھا اس کا سر اپنی گود میں رکھے کہنے لگا، ماہین۔ں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ ماہین کے منہ سے آخری الفاظ بس عامر نکلا اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ ”ماہین اٹھو تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ اور پھر عامر ایسے چپ ہوگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، میں سمجھ گیا کہ ماہین کی موت کا عامر کو گہرا صدمہ ہوا ہے۔ اسی موقع سے میں نے فائدہ اٹھایا اور دلاور کو میں نے ساری بات سمجھا کر آپ لوگوں کی طرف بھیجا اور پھر آپ لوگوں نے وہی دیکھا جو ہم نے دکھانا چاہا اور عامر

کو عمر قید کروادی۔"

تمام گاؤں والے شفاقت کے اس اقرار پر سکتے میں آ گئے، خود جاگیردار صاحب بھی اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکے اور ایک زوردار تھپڑ شفاقت کے منہ پر رسید کردیا، اس کا گریبان پکڑ کر کہنے لگے۔ "میں نے سوچا تھا کہ تو میرے بعد گاؤں والوں کا خیال رکھے گا ان کی عزتوں کا محافظ بنے گا۔ تیرے اس دن کے فیصلے سے میرا سینہ فخر سے چوڑا ہوگا اور میں نے فیصلہ کیا کہ تجھے گاؤں کا نظام سونپوں گا لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ اس گاؤں کی عزتوں کا سب سے بڑا دشمن تو ہی ہے اور بے قصور عامر کو سزا دلوادی، نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا۔"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا ماہین کی روح بولی۔ تو سب لوگ ماہین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "عامر بھی میرے پاس آ گیا ہے کہ اچانک وہاں پر سفید دھواں اٹھا اور ہر طرف پھیل گیا۔ ہم سب نے اس سفید دھوئیں سے عامر کو نکلتے ہوئے دیکھا اور ماہین کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔

"عامر بیٹا تم۔" جاگیردار صاحب بولے۔

"ہاں میں جب آپ لوگوں کی رائے پر مجھے پاگل خانے بھیج دیا گیا تو انسپکٹر شفاقت کے کہنے پر مجھے روزانہ الیکٹرک شاک دلواتا تھا تاکہ میں مرجاؤں، اور شفاقت کی سچائی جاننے والا میں واحد انسان بھی نہ رہوں، وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جو گناہ اس نے کیا ہے اس کے بے شک سارے ثبوت مٹادیں لیکن انجام سے نہیں بچ سکے گا اور ایک دن مجھے الیکٹرک شاک دے رہے تھے تو اسی وقت میری روح میرے جسم سے جدا ہوگئی اور میں جو اپنی ماہین کے پاس آنے کا انتظار کررہا تھا میرا انتظار ختم ہوگیا اور ہم دونوں مل گئے، کیا ہوا جو ہم دو محبت کرنے والوں کو زمین پر لوگوں نے نہ ملنے دیا اور انصاف نہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات انصاف کرنے والی ہے۔ اللہ نے ہمارے ساتھ انصاف کیا شفاقت سے بدلہ لینے کے لئے ہم دونوں کی روحیں کب سے بے چین تھیں اور آج ہمیں انصاف مل جائے گا۔"

"مار دو اس خبیث کو اس کو انجام تک پہنچادو۔" جاگیردار صاحب بولے۔

"نہیں مجھے معاف کردو میں پھر سے ایسا کچھ نہیں کروں گا۔"

"پھر سے تو تم تب ایسا کرو گے اگر تم ایسا کرنے کے لئے زندہ رہو گے۔" ماہین کی روح بولی۔

ایک دفعہ معاف کردو معاف کردو۔"

"چلو آج تمہیں معاف کر ہی دیتی ہوں شفاقت کیا یاد کرو گے پھر تیز آندھی چلنے لگی ہر طرف مٹی اور دھول نظر آ رہی تھی ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ اور آنکھیں بند کرلیں جب آندھی تھمی اور ہم نے آنکھیں کھولیں تو ماہین اور عامر اپنا بدلہ لے کر جاچکے تھے اور شفاقت کی لاش سامنے پڑی تھی جسے دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ واقعی ماہین اور عامر نے شفاقت کو عبرت کا نشانہ بنادیا تھا۔

دلاور کو پھر کسی نے گاؤں میں نہیں دیکھا اس کے ساتھ کیا ہوا کوئی نہیں جانتا، ہم اکثر کوئی بھی غلط کام یا کسی کا دل دکھا کر یہ سوچ کے بیٹھ جاتے ہیں کہ جو ہونا تھا ہوگیا ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اللہ کی ذات سب کچھ دیکھتی رہتی ہے اور درست وقت کا انتظار کرتی ہے اور پھر وہ وقت ہم پر بھی آجاتا ہے جس کی ہم توقع بھی نہیں کرتے اس لئے ہمیں کوئی کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ کہیں ہمارے ایک غلط قدم ہماری ساری زندگی دے کر نہ چکانا پڑے، شفاقت مرگیا عامر اور ماہین اپنا بدلہ لے کر چلے گئے لیکن ہم سب آج تک خود کو معاف نہیں کرسکے کیونکہ ہم نے ان دونوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی سب جانتے تھے کہ عامر ایسا ماہین کے ساتھ نہیں کرسکتا لیکن کسی نے بھی اس کی حمایت نہ کی۔ اور عامر بے قصور ہونے کے باوجود تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کرکے اس دنیا سے چلا گیا لیکن ماہین اور عامر ہمارے لئے ایک ایسا سبق چھوڑ گئے جو ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

جنم دن

محمد شعیب۔ فیصل آباد

ہوائی مخلوق یعنی جن کی سخت گیر آواز سنائی دی، تمہارے بیٹے نے ہمارے بیٹے کو موت سے ہمکنار کردیا تھا اور آج چاند کے نکلتے ہی تمہارا بیٹا بھی موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔

خون کا بدلہ خون..... حقیقت پر مبنی..... جسم پر کپکپی طاری کرتی..... دل فگار..... کہانی

رات کے بارہ بجتے ہی موسم کے تیور تبدیل ہوگئے۔ چاند ستارے سب بادلوں کی اوٹ میں جا چھپے۔ سیاہ بادلوں نے رفتہ رفتہ پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگل کی خوفناک آوازیں بھی ان بادلوں کا تعاقب کرتے کرتے انجان راستے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج دیکھ کر سب ششدر تھے۔ ہواؤں نے بھی ایسی بے رخی اختیار کی کہ اپنی راہ میں ہر رکاوٹ کو تہس نہس کردیا۔ کہیں درختوں کو جڑوں سمیت اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو کہیں بجلی کے تاروں کو توڑ کر پورے شہر کو اندھیرے میں ڈبو دیا۔ وہ دونوں کھڑکی کے پاس کھڑے اس موسم کی سختی کو دیکھ رہے تھے۔

"لگتا ہے وہ آگیا ہے۔۔!!" تیز ہواؤں کے شور میں اس کی باریک سی آواز سنائی دی تھی۔ یہ سن کر

وسیم کے چہرے پر فکرمندی غالب آگئی۔

''یہ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔۔!!'' اپنے ہاتھوں میں موجود گلاس کو دیوار پر دے مارا۔ مگر گلاس کے ٹوٹنے کی آواز بھی اس ہوا کے طوفان کی نذر ہوگئی

''بیٹا! سارے کھڑکیاں دروازے بند کردو۔۔۔ ایک سوراخ بھی کھلا نہیں رہنا چاہیے۔۔'' بڑی مشکل سے بی اماں اپنے کمرے سے چل کر آئی تھیں۔ ان کے قدموں کو بھی اس ہوا نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

''وکی۔۔ نوشی۔۔۔'' راحیلہ نے آواز دی تو سب اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے۔

''یس مام۔۔۔'' نائیٹ سوٹ میں ملبوس دونوں اپنے اپنے کمرے سے باہر آئے تھے۔ نوشی کی عمر بیس برس تھی جبکہ وکی آج رات بارہ بجتے ہی اٹھارہ سال کا ہونے جارہا تھا۔

''تم دونوں دھیان سے سنو۔ آج رات نہ ہی تم دونوں نے باہر جانا ہے اور نہ ہی کوئی کھڑکی وغیرہ کھولنی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے..... مگر میری بات مت بھولنا۔'' راحیلہ نے دونوں کو کرخت لہجے میں نصیحت کی تھی۔ دونوں بری طرح چونکے تھے کیونکہ آج سے پہلے اُس نے ان سے ایسے بات نہیں کی تھی۔ پھر آج کیسے اُس کے مزاج میں سختی اتر آئی؟ بس وہ اسی بات پر ششدر تھے۔

''لیکن مام؟'' نوشی نے سوال کرنا چاہا تھا۔

''تمہیں سنائی نہیں دے رہا ہے تمہاری مام نے کیا کہا؟ چلو جاؤ اب اپنے اپنے کمروں میں۔'' وسیم نے انہیں ڈانٹ دیا۔ وکی کی پیشانی پر کئی شکنیں ابھریں مگر حالات کا تقاضا خاموشی تھا۔

ادھر گھر کے تمام تر کھڑکیاں دروازے بند کیے جاچکے تھے۔ باہر کی گرج اندر داخل ہونے سے قاصر تھی۔ البتہ بجلی کی چمک وحشت کا سامان پیدا کررہی تھی۔ بی اماں نے باہر کی طرف دیکھا تو غضب ناک بادلوں کو اپنے ہی گھر کی طرف بڑھتا پایا۔

''خدا رحم کر۔'' لب پر خود بخود جاری ہوا تھا۔

وکی اور نوشی زینے کی طرف بڑھے مگر آپس میں معاملے کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔

''میرے خیال سے ضرور کوئی بات ہے؟ جو مام ڈیڈ نے ایسا کرنے کو کہا ہے۔'' نوشی نے انکل کے بھروسے کہا تھا۔

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں..... مگر کیا؟ پتا لگانا ہوگا۔'' وہ عقل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا مگر منزل ابھی تک غائب تھی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہر سال جب بھی وکی کا جنم دن قریب آتا۔ اس پر پابندیاں لگا دی جاتیں۔ ایک ہفتے قبل ہی گھر سے نکلنا، دوستوں سے ملنا جلنا، یہاں تک کے واک پر جانا بھی بند ہوجاتا اور ایسا جنم دن کی رات تک رہتا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''لیکن یہ سب پابندیاں مجھ پر ہی کیوں؟ تمہارا بھی تو جنم دن آتا ہے؟ لیکن مام ڈیڈ نے کبھی تم پر تو پابندیاں نہیں لگائیں اور نہ ہی گھر سے نکلنا بند کیا حالانکہ تم ایک لڑکی ہو۔'' وہ دھڑام سے بستر پر گرا تھا۔ سوچتے ہوئے گہری سانس لی۔

''اب اصل بات بھی تو نہیں بتاتے مام ڈیڈ..... تمہارے سامنے میں نے پوچھنے کی کوشش تو کی تھی نا۔'' اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سہارے کھڑی تھی۔

''جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔'' انہوں نے ضرور کوئی پلان بنایا ہوگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے مشکوک لہجے میں وکی کی جانب دیکھا تو وہ مسکرایا۔

''کہیں تم.....؟'' وہ کہتے کہتے رکی تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی تو جیسے سانسیں ہی رک گئیں۔

''ایسا سوچنا بھی مت..... ورنہ ابھی جا کر مام ڈیڈ کو سب کچھ بتادوں گی۔'' اس نے دھمکی والے لہجے میں کہا تھا۔

''تم میری بہن ہو یا دشمن؟ ایک بات بھی راز

نہیں رکھ سکتی کیا؟'' اس نے خفگی کے ساتھ کہا۔ ایک زبردست گرج ہوئی اور آواز کھڑکی کے شیشوں سے گزرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ دونوں نے پل بھر کے لیے باہر کی جانب دیکھا تو واقعی حالات بہت خراب تھے۔ ایسا طوفان ہر سال اس کے جنم دن پر ہی آتا تھا۔

''میں تمہاری دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی مام ڈیڈ..... ضرور کوئی بات ہے تبھی وہ تمہیں باہر جانے سے روکتے ہیں۔'' اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''لیکن۔'' سلوٹوں کو پیشانی پر جگہ دی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں ابھی مام ڈیڈ کو جا کر بتاتی ہوں کہ تم باہر جانے کا سوچ رہے ہو۔'' یہ کہتے ہی اس نے باہر کا رخ کیا تو وہ ہڑبڑاتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اچھا! معاف کردو..... نہیں جاتا باہر..... اب خوش؟ مت بتانا مام ڈیڈ کو..... ورنہ وہ میرے جنم دن پر بھی ہاتھ اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے۔'' اس نے مزاح والے لہجے میں کہا۔ جس پر وہ مسکرادی اور کچھ سوچتے ہوئے باہر کی جانب جانے کا رخ کیا۔ ابھی وہ دروازہ بند کرنے جا ہی رہا تھا کہ کھڑکی پر زبردست دستک ہوئی۔ کوئی زوروں سے اسے پیٹ رہا تھا۔ نوشی کے قدم بھی وہیں منجمد ہوگئے۔ برجستہ پلٹی تو وہاں ایک عکس کو پایا۔ اندھیرے میں کچھ بھی واضح نہ تھا۔

''کون ہے؟'' وکی نے کرخت آواز میں پوچھا مگر جواب ندارد۔ نوشی نے جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور اس کے ساتھ کمرے کے عین وسط میں آ کھڑی ہوئی۔ دونوں کی نگاہیں کھڑکی کی جانب تھیں۔ جہاں اندھیرے میں ڈوبا ہوا مجسم دیکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہوسکتا ہے وہ؟'' نوشی نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وکی نے آگے بڑھنا چاہا مگر نوشی نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''نہیں..... مام ڈیڈ نے منع کیا تھا۔'' اس کا پور پور خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ دستک دوبارہ سنائی دی۔ اس بار ایک کربناک آواز بھی سماعت میں گونجی تھی۔

''مدد..... مدد۔'' آواز میں ایسا درد تھا کہ وہ اپنے آپ کو نہ روک سکے اور دھیرے دھیرے کھڑکی کی جانب بڑھے۔

''ایک بار پھر سوچ لو وکی..... مام، ڈیڈ نے کیا کہا تھا؟'' اس کے لہجے میں لرزہ تھا۔ ہاتھوں پر بھی کپکپی تھی۔

''لیکن کوئی مدد کے لیے پکارے تو اس کو اکیلا بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔'' اس کے دل میں ہمدردی کا عنصر پیدا ہوا تھا۔ طوفان نے زور پکڑا اور سیاہ بادلوں سے ایک چمکتی ہوئی بجلی کی لکیر زمین کی طرف بڑھی۔ آنکھوں کی روشنی جیسے زائل ہونے کے قریب تھی۔

''کوئی ہے..... مدد چاہیے۔'' درد میں ڈوبی آواز دوبارہ گونجی۔ وکی نے بنا سوچے سمجھے کھڑکی کے پٹ کھولے تو ایک زبردست ہوا کا جھونکا آیا اور ساتھ ہی استہزائیہ انداز میں قہقہہ گونجا۔

سیاہی نے وکی کو اپنے حصار میں لیا تو نوشی کی چیخ نکل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وکی اس اندھیرے میں کہیں

شرابی

ایک شرابی کو پولیس نے رات 3 بجے روک لیا۔

پولیس: اتنی رات کو کہاں جارہے ہو؟

شرابی، میں شراب، سگریٹ نوشی اور ان کے انسانی جسم پر پڑنے والے برے اثرات پر لیکچر سننے جارہا ہوں۔

پولیس: واقعی؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے اس وقت یہ لیکچر دے گا کون؟

شرابی: میری بیوی جناب۔

(ذکا اللہ بھٹی۔ کراچی)

غائب ہوگیا تھا۔

"کیا ہوا؟ تم چیخی کیوں؟" سب وہاں آموجود ہوئے تھے۔ راحیلہ نے اس کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

"وکی کہاں ہے؟" وسیم نے حیرت سے سوال کیا، تبھی نگاہ کھلی کھڑکی کی جانب گئی تو پاؤں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔

"کھڑکی..... کس نے کھولی یہ کھڑکی؟ میں نے منع کیا تھا ناں؟" وسیم کی آواز میں گرج تھی، پورا وجود کانپ اٹھا تھا۔

"وہ..... ڈیڈ....." نوشی کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"وہ اپنے وعدے کا پکا نکلا....." بی اماں کی آنکھوں میں آ آ گئے۔ راحیلہ کا جسم بھی ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

"کہاں ہے وکی؟ بولو نوشی۔" وسیم نے جھنجوڑا اور جب نوشی نے سارا ماجرہ سب کے سامنے رکھا تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خاموشی نے سب کو اپنے حصار میں لے لیا سوائے نوشی کے۔ جس کی ہچکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ طوفان اب بھی اپنے زوروں پر تھا۔ گرج دار آواز سماعت میں اترتی جارہی تھی۔

"میں وکی کو کچھ نہیں ہونے دونگا۔ مجھے جانا ہوگا۔" وسیم ہڑبڑائے اور باہر کی جانب بڑھے۔

"کہاں جارہے ہیں آپ؟" راحیلہ نے پوچھا مگر وہ کہاں جواب دینے کی حالت میں تھے۔

"نہیں چھوڑے گا وہ وکی کو۔ نہیں چھوڑے گا..... وہ بدلہ لے کر ہی دم لے گا۔" بی اماں بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔

نوشی کا دل دھڑک اٹھا۔

"بدلہ..... کیسا بدلہ بی اماں؟" وہ بی اماں کے پاس گئی۔ اب سچائی چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا تبھی حقیقت عیاں ہونے لگی۔

"یہ وکی کی پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ وسیم اور راحیلہ ایک سفر سے لوٹ رہے تھے۔ اس رات بھی موسم ایسے ہی خراب تھا۔ خوب بجلی کڑک رہی تھی۔ بادلوں کی گرج بھی ایسے ہی خوفناک تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ راستے میں ان کی کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ آس پاس کوئی بھی مکینک نہیں تھا۔"

☆.....☆.....☆

"لگتا ہے ہمیں آگے پیدل ہی جانا پڑے گا۔" وسیم نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ بادلوں کی گرج میں آواز بھی معدوم ہوچکی تھی۔

"لیکن موسم بہت خراب ہے وسیم۔" راحیلہ کے چہرے پر فکر کے تاثر ابھرے۔

"تو کیا ہوا؟ اب ساری رات..... یہاں تو رک نہیں سکتے۔ ایسا کرتے ہیں جنگل کے راستے سے چلتے ہیں، یہ شارٹ کٹ بھی ہے اور شاید ہم جلد پہنچ جائیں گھر؟" اس نے اندازہ لگایا تھا۔ راحیلہ نے بھی سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آنکھوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔ وسیم نے راحیلہ کا ہاتھ پکڑا اور جنگل کے بیچ وتاب راستے کی طرف چل پڑے۔

بادلوں کی گرج بڑھتی جارہی تھی۔ موسم پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہوچکا تھا۔ بجلی کی چمک آنکھوں کو چکاچوند کرنے پر تھی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے وسیم۔" مضطر لہجے میں راحیلہ نے کہا۔ وسیم نے حوصلہ دیا مگر رکا نہیں۔ ڈر تو اس کے دل میں بھی بیٹھ چکا تھا۔ جنگل سے گزرتے ہوئے کئی بار ان کا دامن کانٹے دار جھاڑیوں سے الجھا مگر وہ سنبھالتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

تبھی اچانک سے راحیلہ کے سامنے ایک سانپ نمودار ہوا تھا۔

"سانپ.....!" وہ بری طرح چلائی۔ وسیم نے سامنے دیکھا تو وہاں ایک سانپ درخت کی ٹہنی سے جھول رہا تھا۔ سیاہ رات میں چمکتی آنکھیں..... انہیں گھور رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے وسیم کی بھی سانسیں تھم گئیں۔

"ڈرو مت....." وسیم نے حوصلہ دیا اور راحیلہ کو اپنی پشت کے پیچھے کرتے ہوئے ایک ٹہنی اٹھا کر دور سے ہی اس سانپ کو راستے سے ہٹانا چاہا تھا مگر وہ اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ اپنی چمکتی آنکھوں سے ان کو مسلسل گھو

رہا تھا۔

"یہ تو ہٹنے کا نام نہیں لے رہا۔" راحیلہ نے گندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ہم دوسرے راستے سے چلتے ہیں۔" کچھ سوچنے کے بعد وسیم بولا اور پھر دائیں جانب مڑا۔ ابھی انہوں نے دو قدم ہی آگے کی طرف بڑھائے تھے کہ دوبارہ چیخ فضا میں بلند ہوئی۔

وہی سانپ اب یہاں بھی ان کا راستہ روکے ہوئے جھوم رہا تھا۔ راحیلہ کی تو جیسے سانسیں ہی تھم گئیں۔ آنکھوں سے آنسو..... مسلسل بہنے لگے۔

"وسیم..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم..... ڈرو..... مت، میں ہوں نا۔" ہکلاتے ہوئے اس نے حوصلہ دیا تھا۔ اس کے بعد کئی بار انہوں نے راستہ بدلا مگر ہر بار وہی سانپ ان کے سامنے آجاتا۔ اب وسیم کے دل میں بھی ڈر بیٹھ چکا تھا۔

تبھی اس کی نظر ایک پتھر پر گئی۔ بنا سوچے سمجھے اس نے وہ پتھر اٹھایا اور اس سانپ پر دے مارا۔ پتھر لگنے کی دیر تھی کہ پورا جنگل چیخوں سے لرز اٹھا۔ صف ماتم بچھ گئی۔ آہ و پکار سے ان کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ راحیلہ کا پور پور اب بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے مضبوطی سے وسیم کو پکڑ لیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا آدم زاد..... میرے بیٹے کو مار دیا..... اب تمہیں اس کا بدلہ چکانا ہوگا۔" ایک خوفناک آواز سماعت سے ٹکرائی۔ وسیم اور راحیلہ کی پھٹی پھٹی آنکھیں آواز کے ماخذ کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر بولنے والا مجسم سامنے نہیں تھا۔

"کون ہے.....؟ سامنے آؤ۔" وسیم چلایا۔ تبھی ایک سفید دھواں نمودار ہوا اور ایک دیوہیکل شبیہہ نظر آئی۔ راحیلہ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"کک..... کون ہو تم؟" وسیم کی آواز میں لرزہ تھا۔

"ایک غمزدہ جن..... اور جسے تم نے ابھی مارا ہے۔ وہ میرا بیٹا تھا۔ اکلوتا بیٹا۔ وہ تمہارے ساتھ صرف کھیل رہا تھا اور تم نے اسے مار دیا۔ آج چاند کے نکلتے ہی وہ پورے اٹھارہ سال کا ہوجاتا مگر تم نے اسے اپنی مدت پوری کرنے نہیں دی..... اب تمہیں اس کے خون کا بدلہ چکانا ہوگا۔" اس کی گھورتی آنکھیں دونوں کو کچا چبا جانے والی تھیں۔

"تمہارا بیٹا..... جب اپنے اٹھارھویں جنم دن کو منائے گا، تبھی اس کی بھی موت ہوگی۔ وہ بھی اسی طرح ہلاک ہوگا۔ جیسے تم نے میرے بیٹے کو ہلاک کیا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ دھواں ہوا میں تحلیل ہوگیا جبکہ وسیم اور راحیلہ اپنی جگہ پر بت بنے کھڑے رہے۔ اگرچہ اس وقت ان کے ہاں صرف ایک اولاد تھی اور وہ نوشی تھی مگر چند ہی عرصے بعد وکی نے جنم لیا تو ان کی تشویش مزید بڑھ گئی۔

پھر اس کے بعد وکی کے ہر جنم دن پر..... یہی طوفان اٹھتا اور اپنے بددعا کے ہونے کا یقین دلاتا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی کرن نمودار ہوئی تو طوفان نے اپنی سختی ختم کی۔ سب کی نگاہیں دروازے پر تھیں۔ وسیم اور وکی کی کچھ خبر نہ تھی۔ راحیلہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ بی اماں بھی دروازے پر آنکھیں جمائے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ تبھی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب دروازے کی طرف بڑھے۔

"وکی..... وکی آگیا؟" اس کی نگاہ سامنے وسیم پر گئی تو ہیجانی کیفیت میں استفسار کیا مگر وہ جواب دینے کی بجائے آنکھیں چرانے لگا۔

"جواب دیجیے۔ کہاں ہے وکی؟" وہ چلائی۔ تبھی اس کی نگاہ پیچھے گئی۔ جہاں چند آدمی تھے۔ جو اپنے کندھوں پر کسی لاش کو اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہ لاش لاؤنج میں لاکر رکھی تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ وکی کی لاش تھی۔ اسے بھی پتھر مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

"مار دیا انہوں نے ہمارے وکی کو..... مار دیا۔" غیر ارادی طور پر بی اماں کے لبوں سے جاری ہوا تھا جبکہ راحیلہ کے جسم سے جان ہی نکل چکی تھی۔

روحوں کا ملن

رابعہ عباس۔بستی فتے والی

اچانک سامنے کا منظر دیکھ کر نوجوان کو حیرت کے جھٹکے لگنے لگے اس کا ذھن عجیب شش و پنج میں مبتلا ھوگیا کیونکہ جو منظر سامنے تھا اسے یقین کرنا ممکن ھی نہ تھا بلکہ ناممکن تھا کہ پھر اچانک.....

ایک ایسا انوکھا واقعہ جس کو کسی بھی صورت ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت، پر چلنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی لئے میں اکثریت شام کے وقت چہل قدمی کے لئے ساحل سمندر پر آجاتا۔ اور ایسا کرنا میرے بچپن سے چلا آرہا تھا۔ میں جب کبھی اداس اور بور ہوتا تو ساحل سمندر پر آجاتا۔

آج بھی میں ایک کرسی پر تنہا بیٹھا تھا۔ کہ اچانک مجھے اپنے قریب سے مدھم سی آواز سنائی دی۔

''انکل کیا آپ نے میرے ابو کو دیکھا ہے۔''

میں نے ایک دم چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا تو ایک چھوٹی سی گڑیا جیسی بچی بیٹھی تھی۔ جو مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی۔ ''انکل میرے ابو بہت اچھے ہیں۔ وہ میرا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ لیکن پتا نہیں وہ مجھے لینے کیوں نہیں آتے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی مجھے تلاش کر رہے ہو۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔'' مجھے اس بچی پر بہت ہی زیادہ پیار آیا میں نے اس کا گال چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ تو میں بری طرح سے ڈر گیا۔ اور جلدی سے اپنی بائک پر بیٹھا۔ لیکن بچی ایک دم سے رو دی۔ انکل پلیز مجھے اپنے ابو کے پاس جانا ہے، میرے ابو بہت اچھے ہیں، مجھے میرے ابو کے پاس جانا ہے۔ میں ڈرا تو تھا۔ لیکن پھر بھی میں حوصلہ کر کے نیچے اترا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس بچی سے پوچھنے لگا۔ ''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟''

''انکل میرا نام نایاب ہے۔'' اس نے معصومیت سے بتایا۔ ''انکل مجھے تھیلیسیما کی بیماری ہے۔ جس وجہ سے میں بہت زیادہ بیمار رہتی ہوں۔'' اور وہ رو دی۔

''اچھا بیٹی تمہارے ابو تمہیں یہاں کیوں چھوڑ کر گئے؟''

''انکل ایک دن میرے ابو نے کہا۔ آؤ بیٹا میں تمہیں سمندر کی سیر کرواتا ہوں۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں بہت زیادہ خوش تھی رستے میں میری طبیعت خراب ہوگئی۔ اور میرا بورونے لگے۔ تو میں نے پوچھا۔ ابو جی آپ رو کیوں رہے ہیں۔ تو وہ بولے بیٹا میں رو نہیں رہا بلکہ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں کیونکہ ہم سمندر کی سیر کو جارہے ہیں۔''

رات اچھی خاصی بڑھ رہی تھی۔ کچھ تو میں پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے۔ کہ کوئی جن بھوت، ہو اور اس شکل میں آکر مجھے کوئی نقصان پہچانا چاہتا ہو۔ پھر بھی حوصلہ کر کے میں نے آگے کی کہانی جانی۔

''بیٹا پھر کیا ہوا؟ تمہارے ابو تمہیں یہاں کیسے لائے،''

''میں سمندر کی سیر کے لئے بہت خوش تھی، اور خوشی، خوشی ابو کے سینے سے لگ گئی اور ابو نے مجھے سینے سے لگالیا، اور بولے۔ آج ہم سیر کے لئے جارہے ہیں، اور تمہاری امی کی یاد آئی ہے۔''

مجھے بھی اپنی امی کی بہت یاد آتی ہے، جب میری سہیلی اپنی امی کی باتیں سناتی۔ رات کو مجھے اپنے سینے سے لگا کر سوتے، میرے ابو بہت اچھے ہیں۔

بچی کی باتیں لمبی ہوتی جارہی تھیں۔ میں نے بچی سے کہا۔

''بیٹا پھر آگے کیا ہوا۔''

''میرے ابو مجھے سینے سے لگا کر روتے رہے، تو میں نے ابو سے پوچھا۔ ابو آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' تو ابو بولے۔ ''بیٹا تمہارے ساتھ سیر کرنے کا بڑا مزہ آئے گا۔'' پھر ابو نے مجھے موٹر سائیکل کی ٹینکی پر بیٹھایا۔ میں چھوٹی تھی۔ اس لئے ٹینکی پر ہی بیٹھتی تھی۔ اور سارے راستے میرے ابو کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔

اور بار بار مجھے سینے سے لگا لیتے، اور کہتے رہے بیٹا بہت تکلیف دی ہے نا، میں نے آپ کو، مجھے معاف کردیں، جب ہم سمندر پر پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا، میں نے ابو سے کہا۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ہم کشتی میں کیسے سوار ہوں گے۔''

میرے ابو نے مجھے سینے سے لگایا اور بولے۔'' بیٹا ہم سیر بھی کریں گے اور کشتی میں سوار بھی ہوں گے۔''

میرے ابو بار بار مجھے سینے سے لگاتے اور رو دیتے، اور پھر انہوں نے میری کمر کے ساتھ ایک پتھر باندھا اور رسی کی مدد سے مجھے سمندر میں پھینکا اور خود رونے لگے۔ اور بولے۔ ''بیٹا میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔''

''تھوڑی دیر بعد تو مجھے لگا کہ سانسیں لینا مشکل ہوگئی ہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد میں جب باہر آئی تو ابو وہاں نہیں تھے۔ میں نے بہت تلاش کیا، انکل آپ مجھے میرے ابو کے پاس چھوڑ کر آئیں گے۔''

میں نے اس کو یقین دلایا۔ اور گھر آنے کو کہا۔ لیکن اس نے کہا۔ انکل آپ جائیں میں آپ کے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔

میں اپنے گھر کی طرف چل دیا اور دل میں سوچا کہ کوئی بھوت پریت ہے..... جو میرے ساتھ مذاق کر رہی ہے، بھلا مرنے کے بعد بھی کوئی انسان آتا ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر کوئی سفید چیز

اٹھ رہی ہے، میں نے گھر جا کر منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھانے کے لئے بیٹھا مگر میرا ذہن بار بار اس بچی کی طرف ہوجاتا، اچانک وہ بچی میرے سامنے آئی اور بولی۔ ''انکل آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے،'' میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگا، اور نایاب سے وعدہ کیا کہ میں کل اس کے ابو کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا، اور میں صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ اور میں نے نایاب کو زبردستی سونے کے لئے کہا تو وہ بیڈ کے ایک کونے میں لیٹ گئی۔ مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے مدھم سی آواز میں سورۃ الناس کی تلاوت کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ نایاب، دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے سورۃ الناس پڑھ رہی ہے۔ پھر اس نے آیت الکرسی پڑھی۔

میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ پھر بھی میں اس رات سو نہ سکا اور سوچا، یہ بچی کہاں چڑیل ہوسکتی ہے۔ جو خود کو ان چیزوں سے بچنے کے لئے قرآن کی تلاوت کررہی ہے۔

صبح اٹھا کمرے میں، میں نے نماز پڑھی، نایاب بھی اٹھی جو ساری رات وہ بھی نہ سوئی تھی۔

نایاب نے مجھے اپنے ابو کا نمبر دیا۔ جس پر میں نے فون کیا۔ تو نمبر بند تھا۔ تین چار مرتبہ ایسا کرنے پر، ایک مرتبہ بیل بجی، تھوڑا سا دل کو سکون ملا۔ چوتھی بیل پر کال ریسیو کی گئی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا، اور پوچھا۔ ''کیا آپ مسٹر عظیم بات کررہے ہیں،''

''جی آپ کون؟''

''جی میں شاہد فراز بات کررہا ہوں، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''جی کہیے۔''

''کیا آپ اپنی بیٹی سے ملنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف عظیم بہت غصے سے بولے۔

''میری بیٹی اس دنیا میں نہیں ہے۔ آپ اپنی بکواس بند رکھیں۔''

''نہیں پلیز میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہوں، اور آپ سے آپ کی بیٹی کے بارے میں بات کرنی ہے، وہ اس وقت میرے پاس ہے، آپ میری بات کا یقین کریں۔''

عظیم نے مجھے ملنے کا ٹائم بتایا اور کال کاٹ دی، میں نے یہ خوش خبری نایاب کو سنائی، تو وہ خوشی سے اچھلنے لگی۔ ''انکل ابھی چلتے ہیں نا۔''

''نہیں بیٹا۔ آپ کے ابو کام میں بزی ہیں۔ ہم بعد میں جائیں گے۔''

''تو چلو ٹھیک ہے۔''

''میں نے دفتر سے چھٹی لے لی اور عظیم صاحب کے بتائے ہوئے ٹائم پر اور ان کے گھر کی طرف چل دیا، مجھے گھر ڈھونڈنے میں تھوڑی سی مشکل تو ہوئی لیکن جلد ہی مل گیا، وہ کرائے پر 9 ویں منزل پر رہتے تھے، میں نے دروازہ نوک کیا، تو ایک کمزور سے آدمی نے دروازہ کھولا، ''آپ عظیم ہیں؟''

''جی جی، اندر آئیں میری بیٹی کہاں ہے۔''

عظیم نے بڑی بے تابی سے پوچھا اور میں نے کہا۔ اس وقت تک میں آپ کو آپ کی بیٹی سے نہیں ملاؤں گا۔ جب تک آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گے۔

عظیم مجھے اندر لے گئے اور بڑی بے تابی سے پوچھا۔ ''آپ مجھے میری بیٹی سے ملوائیں گے ناں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ضرور.....'' ابھی ہم کوئی بات شروع کرتے کہ لائٹ چلی گئی۔ عظیم مجھے لے کر چھت پر چلے گئے۔

آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ''اگر میری بیٹی ہوتی تو وہ مجھے کبھی بھی یوں رونے نہ دیتی۔''

میں ایک یتیم ہوں، بچپن سے ہی والد اور والدہ کا انتقال ہوگیا، زیادہ پڑھ نہ سکا اور کام کی طرف ہوگیا، میں نے بہت جلد اپنا کاروبار سیٹ کرلیا اور 20 سال کی عمر میں دور کے رشتے داروں نے میری شادی گاؤں کی ایک لڑکی سے کردی۔ جو بہت خوب صورت تھی اور وہ

بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ تین سال بعد خدا نے ہمیں ایک بیٹی سے نوازا، تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

پیدائش کے، چند دن بعد میری وائف کو اچانک ہارٹ اٹیک آنے سے موت ہوگئی۔ میں بہت رویا اور خدا سے شکوے کئے، میں تو ماں باپ کے پیار سے رہا، اور میری بیٹی بھی۔

ایک سال تک جب بھی میری شہزادی روتی، تو میں خود بھی رو دیتا، دن بہ دن نایاب کمزور ہوتی جارہی تھی، میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اور رب سے بہت زیادہ دعائیں کی۔ مگر وہ آسمان سے ٹکرا کر واپس میرے پاس آگئیں، جو گھر کبھی جنت لگا تھا، اب بہت برا لگتا۔ میں بہت پریشان تھا، میں نایاب کو لے کر اسپتال گیا، تو جو خبر مجھے ڈاکٹروں نے سنائی تو میں کھڑا نہ رہ سکا اور چکرا کر کرسی پر گر گیا۔

''آپ کی بیٹی کو تھیلے سیمیا ہے۔'' بس اس میں باقاعدہ خون لگتا ہے، اس میں مریض کو زندہ رکھا جاتا ہے، مگر علاج نہیں ہوتا۔''

اب نایاب کو باقاعدہ طور پر خون لگنے لگا، ایک سال تک یہ سلسلہ رہا۔ سب کچھ ختم ہوگیا، اب صرف ایک گھر بچا تھا۔ لیکن میں اپنی بچی کو تڑپتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور دن رات گھٹ، گھٹ کر روتا رہا، جب بھی خون لگتا، تو بیٹی کو زیادہ تکلیف ہوتی، جسے میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔'' ایک دن نایاب نے رونا شروع کردیا، ابو جان میرے سینے میں بہت زیادہ درد ہورہا ہے،'' مجھ سے نایاب کی تکلیف دیکھی نہ گئی، میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے ڈاکٹر کو فون کیا، اس نے مجھے فوراً اسپتال لانے کو کہا۔ اب تو ناک اور منہ سے خون بہنے لگا، مگر وہ میرے آنسو صاف کرتی رہی، '' ابو جان آپ مت روئیں میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی، مجھے کچھ نہیں ہوگا،'' وہ اتنی تکلیف کے باوجود مجھے دلاسے دے رہی تھی۔

میں نے اپنا گھر بیچ دیا اور نایاب کو لے کر اسپتال چلا گیا، اب نایاب کی حالت دن بہ دن بگڑنے لگی تھی۔ ایک دن مجھ سے میری بیٹی کی حالت دیکھی نہ

ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب کی ہدایات سے لکھی گئی مفید کتاب

دل کی بیماریاں

قیمت -/100 روپے

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی و ہائی بلڈ پریشر، غذائی 5 تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تلخیاں اور ہارٹ اٹیک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ اٹیک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں بچوں میں دل کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیڈ چکن، ایمرجنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوجن، ورم غلاف القلب پیری کارڈائیس، دل کی سوجن، ورم قلب، دل کی عضلہ کی سوجن کارڈائیس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جانئے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفےٰ

دعا بک کارنر نئی سڑک نمبر 5 امین پور بازار فیصل آباد

گئی۔ اس کو جب بھی خون لگتا بہت زیادہ تکلیف ہوتی اور میں کچھ بھی نہ کر پاتا، میرا دل کرتا کہ میں اپنے آپ کو ختم کرلوں، میں اس دن بہت شدت سے رویا، نایاب خود اتنی تکلیف میں ہوتی، پھر بھی مجھے حوصلے دیتی رہتی، ایک ڈاکٹر نے کہا، اس کا علاج اٹلی، میں ہے۔ میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور امید کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر سے پوچھا۔ خرچہ کتنا ہوگا۔ میں تو اپنی بیٹی کے لئے جان بھی دے دوں گا۔

ڈاکٹر نے میرے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی، ''90 لاکھ سے ایک کروڑ کے قریب۔''

میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دیوار کے سہارے نیچے بیٹھ گیا، 90 لاکھ میرے پاس تو اٹلی کا ٹکٹ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں اتنا ہی کرسکتا ہوں۔ آپ کی رپورٹ اٹلی بھیج دیتا ہوں، اگر صحیح جواب ملا تو آپ چلے جانا، میں اتنی رقم حاصل نہیں کرسکتا تھا، میں بھی اپنی بیوی کی طرح مرجانا چاہتا تھا، پھر جب نایاب کو دیکھتا تو میری روح کانپ جاتی کہ اس کا تو کوئی بھی نہیں ہے میرے علاوہ۔

عظیم صاحب شدت سے رونے لگے اور اپنے بال نوچنے لگے، میں اپنی بیٹی کو روز مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، ایک دن میرے ذہن میں خود مرنے کا خیال آیا، مگر میں ایسا نہیں کرسکتا تھا، اتنے دن رونے کے بعد حوصلہ جمع کیا اور سمندر میں پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسی دن نایاب کی طبیعت اچانک پھر بگڑ گئی۔

میں اسے بار بار سینے سے لگاتا، اور معافی مانگتا، رو یہ سوچتے ہوئے کہ روز روز کی تکلیف سے تو بہتر ہے کہ اور میں نے اپنی بیٹی کو مار دیا، اس کے بعد میرے آنسو بھی صاف کرنے والا کوئی نہ تھا، اگر میری بیٹی ہوتی تو وہ مجھے یوں کبھی بھی نہ رونے دیتی۔

اچانک سامنے نایاب آ گئی اور بولی۔ ''ابو جی میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ آپ غلط نہیں ہیں.....''

میں عظیم صاحب کو دلاسے دینے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔

میں پیسوں کی وجہ سے اپنی بیٹی کا علاج نہ کرا سکا، اور وہ مجھ سے اتنا دور چلی گئی، بیماری بھی ایسی غریبوں کو لگتی ہے۔

میں نے انہیں ایسا کہنے سے منع کیا، تو وہ اچانک اٹھے اور بولے۔ میری بیٹی میرے پاس نہیں آسکتی۔ میں تو اپنی بیٹی کے پاس جاسکتا ہوں۔'' اور وہ چھت سے نیچے کود گئے، یہ سب اتنی اچانک ہوا کہ میں سنبھل بھی نہ سکا، اور عظیم صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے، اتنی اونچائی سے نیچے گرنے کے بعد زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

محلے کے چند لوگ جمع ہوئے، جو کہ ان کے حالات جانتے تھے، انہوں نے مالک مکان کو بلایا اور ان کی تدفین کردی۔

کافی دنوں بعد میرا دل بہت اداس تھا، تو میں ساحل سمندر کی طرف گیا اور اسی جگہ پر بیٹھا تھا جہاں پر میں اکثر جاتا تھا، تو مجھے سمندر میں دو ہیولے دکھائی دیئے۔ جو ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

تو وہ سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، پہلے تو مجھے بچی کی بیماری سمجھ نہ آئی، اور عظیم صاحب کے بتانے پر پتہ چلا کہ یہ بچی اتنی بڑی بیماری میں مبتلا تھی۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، شاید ایسے کئی ماں باپ ہوں گے جو اپنے بچوں کا علاج نہ کرا سکنے، کی وجہ سے مارتے ہوں گے۔

اور میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ میں انسانیت کی جہاں تک ہوسکی مدد کروں گا۔ اور آنکھوں میں آنسو لئے گھر کی طرف چل دیا۔

آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں جرأت نہیں
کیسے لڑوں اب اس ظالم دنیا سے
خود کو ہی ہرا دیتا ہوں یہی لگا ہے مجھے رابعہ
دنیا تو بھری ہے لوگوں سے مگر کوئی انسان ملا نہیں

آسیبی کہانیاں

اقراء قریشی - راولاکوٹ

اچانک زور دار آواز سنائی دی، آگے مت بڑھنا ورنہ مارے جائو گے آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر بولنے والا نظروں سے اوجھل تھا کہ پھر چند لمحے بعد ایک دھماکہ ہوا پھر.....

خوف و ہراس کے گرداب میں بل کھاتی عجیب و غریب دل پر ہیبت طاری کرتی کہانی

رابعہ اور انعم دونوں کزنز تھیں اور ایک ہی گھر میں رہنے اور ہم عمر ہونے کے باعث دونوں میں گہری دوستی بھی تھی۔ آج صبح سے وہ دونوں بہت خوش تھیں کیونکہ آج ان کے دیگر کزنز بھی چھٹیاں گزارنے ان کے گھر آرہے تھے۔ رابعہ اور انعم نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور ابھی فارغ تھیں۔

شام تک سب مہمان پہنچ چکے تھے، خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ پھر تمام گھر کے بڑے کھانے کے بعد باتوں میں مصروف ہوگئے۔ جبکہ رابعہ، انعم عائشہ، فرحان اور زید سب کمرے میں چلے گئے۔ سب ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول ہوگئے کہ اچانک زید کہنے لگا۔ ''چلو ایسا کرتے ہیں سب ایک دوسرے کو آسیبی کہانیاں سناتے ہیں۔'' زید کی بات پر فرحان نے بھی پرجوش لہجے میں ہاں کہا۔ اور رابعہ نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جبکہ انعم اور عائشہ کے چہرے پر فوراً ہی خوف کے آثار نظر آنے لگے۔

دونوں ایک ساتھ ہی بول اٹھیں۔ ''نہیں'' ان دونوں کے بولنے پر رابعہ، زید اور فرحان نے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ رابعہ کہنے لگی۔

''یار! اتنا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ صرف کہانیاں ہی سنائیں گے، اور تو کچھ نہیں ہوگا۔'' عائشہ بھی احتجاج کرنے لگی۔ تو زید اور فرحان بھی ان کو منانے لگے۔ جب وہ کسی صورت نہ مانیں تو رابعہ کہنے لگی۔ ''اچھا ایسا کرو تم دونوں مت سناؤ لیکن ہمارے پاس ہی بیٹھے رہو۔'' اتنا اور عائشہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فرحان اور زید بھی خوش ہو گئے۔ رابعہ کہنے لگی۔ ''اب بتاؤ سب سے پہلے کون سنائے گا؟'' فرحان اور زید کہنے لگے۔ ''پہلے تم'' رابعہ بغیر کوئی احتجاج کیے مان گئی اور یوں گویا ہوئی۔ ''یہ واقعہ مجھے ایک سہیلی نے سنایا تھا۔ اور اسے اس کی دادی نے۔ یہ ان کی بھی دادی کے زمانے کی بات ہے ان کی دادی نے کچھ یوں سنایا۔

ہم پہلے بہت دور ایک گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی آباد تھے۔ لیکن مذہب کا فرق کبھی آڑے نہیں آیا۔ تمام لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ ہمارا گاؤں بہت ہی خوبصورت تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ گاؤں میں سب سے بڑی ہماری حویلی تھی۔ بہت سے ملازم حویلی میں ہوا کرتے تھے۔ جو کہ گھر کے کام کیا کرتے تھے۔ جبکہ باغ کی دیکھ بھال کے لیے موہن چاچا تھے وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ابا جان نے کبھی کسی ملازم کے درمیان فرق نہیں رکھا۔ موہن چاچا بہت ہی غریب تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں اور کوئی بیٹا نہیں تھا۔ انہیں ہمیشہ سے بیٹے کی خواہش تھی۔ لیکن قدرت کی مرضی کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ان کی بڑی بیٹی رادھا ہمارے گھر کھیلنے آتی تھی۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہا کرتی۔ ''پتا جی ہم سے پیار نہیں کرتے۔ ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں پیار سے بات کرنا تو دور پیار سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔''

میں ہمیشہ اسے تسلی دیتی اور کہتی۔ ''کوئی بات نہیں رادھا! ہو سکتا ہے وہ تم سے پیار کرتے ہوں لیکن ظاہر نہ کرتے ہوں۔''

لیکن وہ کہتی۔ ''نہیں آمنہ! وہ ہمیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ ماں سے بھی ہر وقت جھگڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو نے مجھے کوئی وارث نہیں دیا۔ بلکہ یہ تین تین بوجھ میرے کندھوں پر لاد دیئے۔ ایک بیٹا ہوتا تو بڑھاپے کا سہارا ہوتا۔ اب ان کے جہیز کے لیے بھی پیسہ جمع کروں۔ یہاں اپنا خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ تو منحوس ہے اور یہ سب بھی۔'' اور پھر رادھا ہمیشہ کی طرح رونے لگتی۔

☆.....☆.....☆

ہر شام کی طرح آج پھر رادھا میرے پاس آئی اور روتے ہوئے بتانے لگی۔ ''پتا جی بہت ظالم ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے تو کم مارتے تھے اب اماں سمیت سب کو مارتے ہیں۔ اور روز رات کو کسی سادھو کے پاس جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ ''دیکھنا اس دفعہ میرا بیٹا ہی ہوگا۔ اس دفعہ دیکھنا میرے بڑھاپے کا وارث آئے گا۔'' ماں بیچاری ہر وقت روتی رہتی ہے۔'' میں نے رادھا کی بات سن کر پھر سے تسلی دی اور کہا۔ ''رادھا میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔ تم صبر کرو۔'' رادھا بیچاری نے سر ہلایا اور گھر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

ایک دن صبح ہی صبح ہمارا ملازم کھیتوں سے واپس آ رہا تھا کہ اچانک اس کو پتہ چلا کہ ہمارے ملازم موہن چاچا کی سب سے چھوٹی بیٹی گم گئی ہے پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب پریشان ہو گئے۔ کیونکہ آج سے پہلے کبھی گاؤں میں ایسی واردات نہ ہوئی تھی۔

موہن چاچا روتے ہوئے ڈھونڈنے لگے۔ گاؤں کے کچھ لوگ بھی موہن چاچا کے ساتھ ساتھ ڈھونڈتے رہے لیکن اس کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ آخر کار تھک ہار کر سب چلے گئے۔ رادھا کی ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ جبکہ اگلے دن چاچا اتنا مطمئن تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کچھ عرصہ تک خاموشی رہی لیکن ایک شام اچانک چاچا کی ایک اور بیٹی غائب ہو گئی۔ ہر بار کی طرح اسے بھی ڈھونڈا گیا۔ لیکن وہ بھی نہ ملی۔ رادھا کے خاندان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ایک دن رادھا پھر مجھ سے ملنے اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے چلی آئی۔ بیچاری دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ رادھا نے بتایا۔ ''آمنہ پتا جی اب روز گھر پر بھی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ اور کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے بس کہتے ہیں کہ دیکھنا بہت جلد میں امیر ہو جاؤں گا اور میرا وارث بھی ہوگا۔'' رادھا نے یہ بھی بتایا کہ ماں بیمار ہے اور امید سے بھی ہے رادھا نے یہ بھی بتایا کہ مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کی بہت یاد آتی ہے۔ پتا جی اب گھر بھی بہت کم آتے ہیں۔ زیادہ تر سادھو کے پاس ہی وقت گزارتے ہیں اور پھر وہ چلی گئی۔

اس دن کے بعد بہت دن ہو گئے رادھا نہ آئی۔ پھر ایک مہینہ ہو گیا لیکن وہ نہ آئی۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ رادھا بھی دونوں چھوٹی بہنوں کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا بیچاری پہلے ہی غموں کی ماری تھی اور اب نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اب چاچا نے بھی ہمارے ہاں سے کام چھوڑ دیا۔ ایک مہینہ ہو گیا۔

ایک دن میں نے خواب میں دیکھا رادھا میرے پاس آئی اور مجھے کچھ بتانے لگی اور بتا نہیں پائی۔ اب تو یہ روز کا معمول ہو گیا۔ مجھے روز رات کو خواب میں رادھا نظر آنے لگی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ پھر تو مجھے چلتے پھرتے بھی رادھا نظر آنے لگی۔ لیکن جب پاس جاؤ تو کچھ نہ ہوتا۔ اب میں ڈرنے لگی تھی۔

رات کو اٹھ جاتی اور چیخنے لگتی۔ گھر والوں نے جب یہ حالت دیکھی تو شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ شاہ صاحب کے سامنے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر ہو گئی۔ انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں۔ وہاں موجود سب لوگ شاہ صاحب کے کچھ بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

بہت دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اور چہرے پر غصہ واضح تھا۔ انہوں نے گھر والوں کو بتانا شروع کیا۔ ''آمنہ بیٹی کو رادھا کی جو جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اس لیے ہے کہ رادھا اب اس دنیا میں نہیں ہے اور وہ رادھا کی روح ہے جو کہ بھٹک رہی ہے۔ رادھا اور اس کی بہنیں جو غائب ہوئی تھیں۔ وہ دراصل غائب نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں موہن نے قتل کیا ہے اور وہ روحیں اس لیے تڑپ رہی ہیں، ان کی لاشوں کو لانا ہوگا اور ان کے دھرم کے مطابق ان کی آخری رسومات ادا کرنی ہوں گی۔'' شاہ صاحب یہ بول کر چپ ہو گئے۔

سب گھر والے شاہ صاحب کی بات سن کر حیران ہو گئے۔ شاہ صاحب نے وہ جگہ بتائی جہاں ان کی لاشیں دفن تھیں۔ سب لوگ شاہ صاحب سمیت ایک جگہ پہنچ گئے جو کہ گاؤں سے بہت دور تھی اور ویران تھی۔ ایک غار بھی بنا ہوا تھا۔ جب لوگ غار میں داخل ہوئے تو دیکھا موہن چاچا اور ایک سادھو ایک بت کے سامنے ہاتھ جوڑے پوجا کرنے میں مصروف تھے، غار میں اتنی گندی بدبو پھیلی تھی کہ وہاں رہنا مشکل تھا اور ایک طرف رادھا اور اس کی چھوٹی بہنوں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔

اچانک ہی سادھو اور موہن چاچا نے آنکھیں کھول دیں۔ انہیں شاید گاؤں والوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ فوراً ہی وہ دونوں اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑے جو کہ غار بند کرنے کے لیے تھا۔ اور ایک بہت بڑا پتھر تھا۔

لیکن ابھی وہ دونوں غار سے باہر نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک غار خود بخود بند ہو گیا اور غار میں اندھیرا چھا گیا۔ پھر صرف غار میں سادھو اور موہن چاچا کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ سب ڈر گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد شاہ صاحب نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ایک بار پھر سے غار روشن ہو گیا۔ اب سادھو اور موہن چاچا معافیاں مانگنے لگے۔ شاہ صاحب نے فوراً کہا۔ ''رادھا بیٹی! بس کر انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔'' اچانک ہی ایک کونے میں رادھا کی روح نمودار ہوئی اور اس نے بتانا شروع کیا۔ ''جب میری چھوٹی بہنیں غائب ہوئیں تو ہمیں کسی پل چین نہیں آ رہا تھا لیکن پتا جی مطمئن تھے۔ پہلے تو کچھ نہ تھا لیکن جب کامنی بھی غائب ہوئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ پتا جی کا کیا دھرا ہے۔

ایک دن پتا جی پھر سادھو کے پاس جا رہے تھے کہ اچانک میں نے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ میں بہت احتیاط سے چل رہی تھی۔ کہ پتا جی کو شک نہ ہو۔ لیکن میری بدقسمتی

کہ غار میں پہنچنے سے کچھ پہلے اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں بہت زور سے گری کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پتا جی فوراً پیچھے مڑے اور مجھے دیکھ کر غصے سے آگ بگولہ ہوگئے۔ میں ابھی اٹھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے غار کی طرف لے جانے لگے۔ ساتھ ساتھ گالیاں بھی دیتے جارہے تھے۔ پھر وہ غصے میں کہنے لگے۔ ”آج تجھے نہیں چھوڑوں گا منحوس ماری اور تجھے بھی تیری بہنوں کی طرح دان کردوں گا۔ آج تیری بھی بلی چڑھادوں گا۔“ میں پتا جی کی باتیں سن کر خوفزدہ ہوگئی اور چلانے لگی۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے غار میں لے گئے اور پھر سادھو کے کہنے پر میری بھی بلی چڑھادی اور میں کچھ نہ کرسکی۔

لیکن میں اپنا انتقام لینا چاہتی تھی اور اس لیے آمنہ کو بار بار دکھائی دیتی تھی تاکہ ان ظالموں کو سزا مل سکے۔“ تنا کہہ کر رادھا خاموش ہوگئی۔ اور پھر اس نے اشارہ کیا اور موہن چاچا اور سادھو معافیاں مانگنے لگے۔ موہن چاچا کہنے لگے۔ ”مجھے معاف کردو میں امیر ہونے اور بیٹا پانے کے چکر میں پاگل ہوگیا تھا۔ مجھے معاف کردو۔“

لیکن رادھا کہنے لگی۔ ”شاہ صاحب! میں انہیں معاف نہیں کرسکتی۔ کل کو پھر یہ سب شروع کردیں گے۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”بیٹی! انہیں اللہ سزا دے گا۔ تم یہ سب چھوڑ دو۔“ رادھا پھر فوراً ہی غائب ہوگئی۔

جبکہ میرے ابا جان نے پولیس کو کال کی اور پولیس ان دونوں کو ساتھ لے گئی اور انہیں عمر قید کی سزا ہوگئی۔ ہم سب نے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگئے اس دن کے بعد مجھے رادھا نظر نہیں آئی۔

کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ جیل میں ہی موہن چاچا اور سادھو نے خودکشی کرلی اور جیل میں بھی انہیں کسی پل چین نہ ملا اور رادھا کی روح انہیں نظر آتی رہی اور پھر انہوں نے تنگ آکر خودکشی کرلی جب کہ رادھا کی ماں کے ہاں پھر بیٹی پیدا ہوئی اور وہ اسی کی آس میں جی رہی ہیں اور اپنا گزارہ کررہی ہیں۔“ رابعہ یہ کہانی سنا کر خاموش ہوگئی۔ فرحان زید، انعم اور عائشہ بھی کہانی سن کر خوش ہوگئے۔ عائشہ اور انعم کے دل سے خوف بھی نکل چکا تھا۔ رابعہ کہنے لگی۔ ”چلو فرحان! اب تمہاری باری۔ اب تم سناؤ۔“

فرحان بولا۔ ”سنو اور سب فرحان کی بات سنتے ہی خاموش ہوگئے اور فرحان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ فرحان کہنے لگا۔ ”بہت سال پہلے کی بات ہے تین دوست احمد، امجد اور نعمان بچپن سے بہت گہرے دوست تھے ہمیشہ ایک ساتھ پڑھائی کرتے۔ کھیلتے کودتے بڑے بھی ایک ساتھ ہوئے۔ کہیں جانا ہوتا تو تینوں مل کر جاتے۔ ایک مرتبہ نعمان کو پتہ چلا کہ فلاں جگہ جو جنگل ہے۔ وہاں پر خزانہ موجود ہے۔ لیکن جب بھی اس جنگل میں کوئی گیا واپس نہ آیا۔ نعمان کو ویسے بھی ایڈونچر کا شوق تھا۔ اسی لیے اس نے وہاں جانے کا ارادہ کرلیا۔ اور پھر امجد اور احمد سمیت وہاں جانے کی تیاری کی اور سفر شروع ہوگیا۔

تین دن بعد وہ جنگل میں پہنچے ضروری سامان ان کے پاس تھا۔ وہ بہت تھک چکے تھے۔ انہوں نے وہیں جنگل میں قیام کیا۔ جنگل بہت ہی گھنا تھا۔ اور ایک عجیب سی بات کہ پورے جنگل میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جنگل دن کے وقت بھی رات کا منظر پیش کررہا تھا۔ تینوں تھک چکے تھے جو کھانا ساتھ لائے تھے۔ وہ کھایا اور پھر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ آرام کے بعد سب مل کر خزانہ تلاش کرنے لگے۔

دوپہر کا وقت تھا لیکن جنگل گھنا ہونے کے باعث اس میں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جنگل میں ہر جگہ مختلف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب ان لوگوں کی چیزیں ہیں جو یہاں خزانے کی تلاش میں آئے تھے۔ نعمان کے پاس نقشہ تھا۔ احمد کہنے لگا۔ ”یار! نعمان ہم کب سے جنگل میں گھوم رہے ہیں ابھی تک ہم بھٹک ہی رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہمیں یہاں کچھ نہیں ملنے والا۔ واپس چلتے ہیں۔“

امجد نے بھی احمد کی تائید کی اور بولا۔ ”مجھے نہیں لگتا یہ نقشہ خزانہ ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرے گا۔“ احمد اور امجد کے چہروں سے بیزاری واضح تھی۔

نعمان ان کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یار! میں

صرف یہاں خزانے کی تلاش میں نہیں آیا بلکہ ان لوگوں کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں جو یہاں آکر غائب ہوگئے۔“ نعمان کے سمجھانے پر وہ دونوں مان گئے۔ جنگل میں گھوم گھوم کر شام ہوچکی تھی۔ انہوں نے واپس خیموں کی جانب قدم بڑھادیے۔

☆.....☆.....☆

رات میں کھانا کھا کر وہ تینوں سوگئے رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک تینوں کی ایک ساتھ آنکھ کھل گئی۔ تینوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں اس وقت ان تینوں کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی تینوں کچھ سمجھنے نہ پائے تھے کہ اچانک خیمے کے باہر ایک سایے کی جھلک دکھائی دی۔ تینوں چوکنے ہوگئے۔ جنگل میں جنگلی جانوروں کی موجودگی کا تو انہوں نے سن رکھا تھا اسی لیے ہتھیار ان کے پاس تھے تینوں ایک ساتھ اٹھے اور بندوقیں لے کر آہستگی سے خیمہ سے باہر نکلے ان کے پاس ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل رات کی تاریکی میں بہت ہول ناک منظر پیش کررہا تھا۔ اور جنگلی جانوروں کی آوازیں انہیں مزید خوفناک کررہی تھیں۔ لیکن تینوں پھر بھی اس سایے کا پیچھا کررہے تھے۔

اچانک ایک جگہ پہنچ کر وہ سایہ رک گیا۔ اور وہ تینوں بھی رک گئے۔ پھر وہ سایہ جیسے ہی ان کی طرف مڑا تو اس کو دیکھ کر تینوں دہل گئے۔ اس خوفناک سایے نے ان پر اپنی اصلیت واضح کردی۔ کیونکہ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جو انہیں گھور رہا تھا۔

وہ تینوں ڈرتے نہیں تھے لیکن اس ڈھانچے کو دیکھ کر انہیں خوف محسوس ہونے لگا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اب تک خوف کے مارے بے ہوش ہوچکا ہوتا۔ لیکن وہ تینوں اب بھی وہیں کھڑے تھے کہ اچانک اس ڈھانچے نے بولنا شروع کردیا۔ ”ہماری مدد کرو۔“ پھر وہ اچانک غائب ہوگیا۔

تینوں جیسے فوراً ہوش میں آئے انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ تینوں سوچ رہے تھے کہ وہ ڈھانچہ ان سے مدد کیوں مانگ رہا تھا۔ نعمان کہنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ واقعی یہاں کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر وہ ڈھانچہ کوئی آسیب ہوتا تو اب تک ہمیں زندہ نہ چھوڑتا۔“

احمد اور امجد بھی نعمان کی بات سن کر کہنے لگے۔ ”ہاں یار! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں پتہ لگانا ہوگا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔“

احمد بولا۔ ”اب تو ہمیں خزانہ ملے نہ ملے لیکن ہم گمشدہ لوگوں کا پتہ ضرور معلوم کرکے رہیں گے۔“ پھر تینوں دوست واپس خیمے میں آگئے اور کل کی صبح کا پلان بنانے لگے۔

اور پھر تینوں صبح ہی صبح ناشتے کے بعد ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ آج انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہو نہ ہو آج تو ہم راز معلوم کرکے ہی رہیں گے۔ تینوں ایک ساتھ جنگل میں آگے بڑھتے جارہے تھے، انہیں جنگل میں گھومتے ایک گھنٹہ ہوچکا تھا۔ کہ اچانک تینوں چلتے چلتے گر پڑے۔ گرنے کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ ہڈیوں کا ڈھیر تھا جو کہ ان کے گرنے کا سبب بنا، وہ سب اتنی زیادہ انسانی ہڈیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

نعمان کہنے لگا۔ ”ہو نہ ہو یہ انہی گمشدہ لوگوں کی ہڈیاں ہیں جو خزانے کی تلاش میں اپنی جان گنوا بیٹھے ہیں۔“ احمد اور امجد نے بھی نعمان کی بات کی تائید کی اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگے۔

اچانک ایک زوردار آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ تینوں جہاں کھڑے تھے وہیں ٹھٹک گئے۔

”آگے مت بڑھنا ورنہ مارے جاؤ گے۔“ آواز تو سنائی دے رہی تھی پر بولنے والا نہیں نظر آرہا تھا۔

تینوں ساتھ بول پڑے۔ ”کون ہو؟ سامنے آؤ۔“ ان کے یہ کہتے ہی وہی آواز دوبارہ آئی۔ ”میں وہی ہوں جسے تم لوگوں نے رات کو دیکھا تھا۔ میں دن میں نظر نہیں آسکتا۔ میں تم لوگوں کو کچھ نہیں کہوں گا، بس تم لوگ میری اور جتنے بھی لوگ یہاں آکر مرچکے ہیں ان کی مدد کرو۔“

نعمان نے فوراً پوچھا ”کیسے؟“ اور یہاں جو لوگ مرے ہیں ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ پھر سے خاموشی چھا گئی اور تھوڑی دیر بعد آواز سنائی دی۔

"جو بھی شخص خزانے کی تلاش میں یہاں آیا۔ وہ اس جگہ سے آگے نہیں جاسکا۔ تم لوگوں کی قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے کیونکہ یہ خزانہ بہت ہی ظالم و جابر شخص کا ہے۔ جو کہ کالے علم کا ماہر تھا۔ اس کے حریف نے اس کا خزانہ لوٹنے کی کوشش کی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن وہ شخص مرتے وقت بھی جادو سے اس جنگل میں خزانہ منتقل کر گیا اور ایک ان دیکھا جال بچھا گیا جو کہ کسی کو نظر تو نہیں آتا لیکن جو بھی اس جگہ سے آگے آتا ہے مر جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ خزانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اور لوگوں کو اس جنگل کی حقیقت سے مطلع کرو تاکہ پھر سے کوئی اور شخص اس جنگل میں نہ آئے۔ اور ہماری ہڈیوں کو لے جا کر اسے تمام رسومات ادا کرنے کے بعد دفنا دو۔ تاکہ ہماری بھٹکتی روحوں کو سکون مل جائے۔" اور پھر ڈھانچے کی آواز آنا بند ہو گی۔

احمد، امجد اور نعمان جو بیگ یہاں سے خزانہ لے جانے کے لیے لائے تھے۔ اب وہ اس میں تمام مرے ہوئے لوگوں کی ہڈیاں بھر کر لے گئے اور ان کی اجتماعی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد انہیں قبرستان میں دفنا دیا اور حکومت کے ذریعے لوگوں کو اس جنگل میں جانے سے منع کر دیا گیا اور اس جنگل والے راستے کو بند کر دیا گیا۔

اور وہ ڈھانچے ایک بار خواب میں آ کر نعمان اور اس کے دوستوں کا شکریہ بھی ادا کر کے گئے۔ اس طرح جنگل کا راز سب کو معلوم ہوا۔ فرحان کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔

سب ایک بار پھر کہانی میں کھو چکے تھے، فرحان کے جھنجھوڑنے پر ہوش میں آئے اور کہنے لگے۔

"واہ! کمال کی کہانی سنائی ہے فرحان چلو اب زید کی باری ہے۔" سب ایک بار پھر سے زید کی طرف متوجہ ہو گئے زید بولا۔

"ارسلان ایک دور گاؤں میں رہتا تھا۔ ابھی وہ میٹرک میں تھا۔ روز شام کو دوستوں کے ساتھ گاؤں کے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلتا تھا۔ وہ بچپن سے یہی سنتا آیا تھا کہ مغرب کے بعد گھر میں ہی رہنا چاہیے کیونکہ شام کو مغرب کے بعد آسیب وغیرہ نکل آتے ہیں۔ لیکن احمد یہ باتیں ہنس کر سنتا اور انہیں جھوٹ سمجھتا۔ وہ آسیب اور چڑیلوں پر یقین نہ رکھتا اور گھر والوں کی باتوں کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتا۔ گاؤں والے آسیب وغیرہ پر یقین رکھتے ہیں۔ جو کہ شہر والوں کو سائنسی باتیں لگتی ہیں۔

ارسلان گاؤں میں رہنے کے باوجود ان سب باتوں پر یقین نہ رکھتا اور نہ ہی انہیں کوئی اہمیت دیتا بلکہ وہ تو دوستوں کے ساتھ مل کر جن بھوت اور آسیب وغیرہ کا مذاق اڑاتا۔ سب دوست اسے منع بھی کرتے لیکن وہ باز نہ آتا۔ وہ کہتا۔ "ان سب چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔" اسی طرح وہ ہمیشہ دوسروں کو بھی شرارت کر کے ڈراتا رہتا۔

ایک مرتبہ اس کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ۔" اس گاؤں سے 40 کلو میٹر دور ایک جگہ ہے جو کہ جنات کے مسکن کے طور پر مشہور ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں جاتا اور جو ایک بار چلا جائے۔ واپس لوٹ کر نہیں آتا۔

پہلے تو یہ بات سن کر ارسلان قہقہے لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"اچھا! اگر ایسا ہے تو میں ادھر جا کر دکھاؤں گا۔ اور واپس زندہ سلامت لوٹ کر بھی آؤں گا۔" پہلے تو اس کا دوست علی اسے منع کرتا رہا۔ پھر اس کے اصرار پر مان گیا اور ایک تیسرے دوست عبداللہ کو بھی تمام واقعے سے آگاہ کیا اور اسے بھی جانے کے لیے راضی کر لیا۔

ارسلان، علی اور عبداللہ گھر والوں کو گھومنے پھرنے کا کہہ کر نکلے اور دو دن بعد آنے کا کہا۔ شام تک تینوں اس جگہ پہنچ چکے تھے ہر طرف جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور سامنے ہی ایک بہت ہی بوسیدہ حویلی دکھائی دے رہی تھی وہ بہت بڑی حویلی تھی اپنے وقتوں میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔

لیکن اب بہت خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ عبداللہ اور علی ساتھ ساتھ چل رہے تھے ان کے چہروں پر خوف کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ ارسلان ان کی حالت کو دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ جب کہ وہ دونوں اب بھی اسے منع کر رہے تھے۔ لیکن وہ نہ مانا۔

اندھیرا چار سو پھیل چکا تھا۔ علی اور عبداللہ کہنے لگے۔

"واپس چلتے ہیں ارسلان۔" لیکن ارسلان نے منع کر دیا۔ وہ سب اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹارچ روشن کر چکے تھے۔ ہر طرف جھینگروں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ساتھ لمبے لمبے درخت اور جھاڑیاں ماحول کو خوف ناک بنا رہی تھی۔ پھر ارسلان اندر جانے لگا اور دوستوں کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن وہ نہ مانے اور پھر ارسلان اکیلا اندر جانے کو تیار ہو گیا اور حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

عبداللہ اور علی نے ارسلان کو روکنے کی آخری ناکام کوشش کی۔ لیکن ارسلان اندر چلا گیا جب کہ وہ دونوں ڈرے سہمے باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بہت خوفزدہ تھے۔

جبکہ ارسلان نے آگے بڑھ کر حویلی کا دروازہ کھولا جو کہ زبردست چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اور اچانک ہی بہت سی چمگادڑیں چیختی ہوئی باہر کی جانب اڑ گئیں۔

عبداللہ اور علی کے دل مارے ڈر کے حلق میں آ گئے۔ جبکہ ارسلان بنا ڈرے اندر داخل ہوا۔ حویلی مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ارسلان نے ٹارچ روشن کی اور آگے قدم بڑھا دیے۔ وہ ایک راہداری سے گزر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی چیزوں کا جائزہ بھی لے رہا تھا کہ اچانک اسے مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ چونک کر رک گیا۔ پھر دوستوں کی شرارت سمجھ کر نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ کوئی چل رہا ہو۔ اس نے زور سے کہا۔

"علی اور عبداللہ کر لو جتنا تنگ کرنا ہے۔ ڈرا لو لیکن میں ڈرنے والوں میں سے نہیں....." اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ اب وہ ایک جانب بنے کمروں کی طرف بڑھا اور ایک کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ارسلان نے ٹارچ کی روشنی میں پورے کمرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہر چیز بوسیدہ ہو چکی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے یہ کمرہ کسی کی آرام گاہ ہو۔ ارسلان ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ارسلان فوراً پیچھے مڑا۔ لیکن پیچھے کا منظر دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اور پرا اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

کیونکہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ کمرے کے اندر ہر طرف خوفناک شکل کے لوگ کھڑے تھے۔

ارسلان جو کہ بہت بہادر تھا اور جن بھوتوں کو نہیں مانتا تھا اتنی خوفناک شکلیں دیکھ کر آج وہ واقعی ڈر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ پاؤں وہیں جم چکے ہیں کچھ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ پھر وہ تمام خوفناک لوگ اس کی جانب بڑھنے لگے۔ ارسلان خوف کے مارے بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

اچانک ایک جانب سے روشنی کا ہالہ دکھائی دیا اور تمام بدروحیں چیختی ہوئی غائب ہو گئیں اور اب روشنی کی جگہ ایک باریش بزرگ کھڑے تھے۔ وہ ارسلان کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "بیٹا! آج تو تمہاری جان بچ گئی۔ لیکن آئندہ خیال رکھنا۔ جس طرح انسانوں کا وجود اس دنیا میں ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی دوسری مخلوقات بھی اس دنیا میں اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اور جنات وغیرہ بھی حقیقت میں موجود ہیں۔ اب آئندہ کبھی اس طرف مت آنا۔ اور جلدی جاؤ، باہر تمہارے دوست پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

ارسلان جو کہ جان بچ جانے پر خوش تھا، وہاں آج اسے جنات کے اور دوسری مخلوقات کے وجود پر یقین آ گیا تھا اور اس نے آئندہ ان کا مذاق اڑانے سے توبہ کر لی، بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور باہر کی جانب چل پڑا۔

جیسے ہی وہ باہر نکلا علی اور عبداللہ فوراً اس کے قریب آئے اور اس کے زندہ سلامت واپس آنے پر اسے گلے لگا لیا۔ ارسلان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور پھر تینوں گاؤں کی جانب بڑھ گئے۔"

زید اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ آمنہ اور انعم ڈر کے ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھیں۔ پھر کمرے میں رابعہ کی امی داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔ "بہت رات ہو گئی ہے چلو شاباش سو جاؤ۔" سب نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

آرزو ہے کہ اسے غور سے تکتا جاؤں
سانس رک جائے مری اس کی عبادت کرتے
اس کی زلفیں لب و رخسار تھے اور مرے ہاتھ
کٹ گئے وصل کے لمحے یوں شرارت کرتے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

دل کے کونے سے ایک آواز آتی ہے
ہمیں ہر پل آپ کی یاد آتی ہے
دل پوچھتا ہے بار بار جنہیں ہم یاد کرتے ہیں
کیا انہیں بھی ہماری یاد آتی ہے
(تانیہ شیر خان.....ٹنڈوآدم)

وہ دیکھو دروازے پر دستک کس کی ہے
اگر ہو عشق تو کہنا یہاں کوئی دل نہیں رہتا
(ڈاکٹر ندیم ساگر.....مقصود ورند سندھ سے)

بظاہر جو غبارے بیچتے ہیں
پس منظر میں وہ اپنی سانسیں بیچتے ہیں
(محسن عزیز حلیم.....کوٹھا کلاں)

سجناں جے توں ہاسے دیتے
دکھ وی اچھے خاصے دیتے
لوکاں نے تے گل ای کیتی
توں تے کھول خلاصے دیتے
(حلیم بھٹی.....کوٹھا کلاں)

تھے عزیز جنہیں ہم زندگی کی طرح
آج وہ پاس سے گزرے اجنبی کی طرح
(محمد بوٹا.....گجرات)

وہ جلدی جلدی میں ''آج ضرور آؤں گا'' کہہ کر چلا گیا
'اور ہم بیوقوف' انتظار میں ہی رات چوکھٹ پر گزار دی
(افتخار احمد.....پھلریاں، تلونڈی)

ستم گروں کی روش ہے نہ قاتلوں کی ادا
یہ کس سے سیکھی ہے ظالم یہ ہے کہاں کی طرح
اگر تم آؤ تو دل سے ابھی نکل جائے
وہ آرزو کہ جو رہتی ہے مہماں کی طرح
(مہر پرویز احمد دولو.....میاں چنوں)

ہم سے تو ماضی کی ایک بھی تحریر مٹ نہ پائی
کسی بے وفا کی دل سے جو تصویر مٹ نہ پائی
ہم اپنے دل کی حسرتوں سے کرتے کیا بغاوت
ہم سے تو تیرے وعدے کی زنجیر مٹ نہ پائی
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

تم کو تو معلوم ہے سب کچھ تم تو میرے ہمسائے ہو
بیل تو کب کی سوکھ چکی اب کلیاں ڈھونڈنے آئے ہو
(محمد حنیف شاکر.....ننکانہ صاحب)

بنے ہو مصور تو اپنا حق ادا بھی کرو
کھڑے ہو کیوں مجرموں کی طرح فیصلہ بھی کرو
(اقبال مدنی.....کراچی)

زندگی محتاج نہیں منزلوں کی
وقت ہر منزل کو دکھا دیتا ہے
کوئی مرتا نہیں کسی سے جدا ہو کر
وقت سب کو جینا سکھا دیتا ہے
(عثمان غنی.....پشاور)

سمندر بھی نہ سہ سکے گا میرے اشکوں کے دھارے
کہ درد میں ڈھل کے نکلے ہیں دل کے ارمان سارے
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

شرط وفا نبھاؤں تو نبھاؤں میں کس طرح
حالات میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے
(عارف عمر دراز.....نوابشاہ)

گرنے سے پہلے میں بھی قابل پرواز تھا
بے وفائی اس نے کی جس کی وفا پہ بڑا ناز تھا
(فیروز.....کھڈرو ضلع سانگھڑ سے)

نہ ہی وہ پیار رہا نہ ہی وہ ایثار ہے
اکیسویں صدی کے شروع میں پیار بھی بیوپار ہے
(ذکا اللہ بھٹی.....کراچی)

نہ تیرا نام شمع ہوتا نہ میں تیرا پروانہ ہوتا
نہ تو ٹیوشن پڑھنے آتی نہ میں تیرا دیوانہ ہوتا
(چوہدری افتخار علی.....تلونڈی)

☆☆

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع، خار کوت فانوس تھا
مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر، یارب! ہلاک حسرت پابوس تھا
حاصل الفت نہ دیکھا، جز شکست آرزو
دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لب افسوس تھا
کیا کہوں، بیماری غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل، بے منت کیموس تھا
(انتخاب: الیس حبیب خان)

بچھڑ جائیں اگر تو پھر گلہ نہیں رہتا دوست
چلے تیز ہوا شجر کے ساتھ کوئی پتہ نہیں رہتا
ہو کیسے اس کی پھر مجھ پہ عنایت کیسے
آندھیوں میں پھر کوئی چراغ جلتا نہیں رہتا
سفر کے درمیان دشوار مرحلے بھی سہی
درد میں آنکھ سے کوئی آنسو مچلتا نہیں رہتا
روز کسی سے ملنے کا یہ صلہ ملا ہے ہمیں
خزاں میں مہرباں پھول کوئی کھلتا نہیں رہتا
تیز ہوا کے جھونکوں نے جلادیا سب کچھ
آج اس سے ملنے کا ہمیں کوئی یارا نہیں رہتا
مفلسی میں بھی کیا کیا رنگ دکھائے زمانے نے جاوید
ملے اگر خوشی تو انساں کا پہلے سا چہرہ نہیں رہتا
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

ساتھ تو اک پل کا تھا پھر کیوں مجھے یاد آتے ہو
عکس کی طرح میرے دل پہ کیوں چھا جاتے ہو تم
دلبر بھی نہیں ہو میرے ہمدم بھی نہیں ہو میرے
یہ راستے پیار کے مجھے پھر کیوں دکھا جاتے ہو تم
تبھی ہم ملے تھے تو اک اجنبی کی طرح
میری راتوں کی نیند پھر کیوں اڑا جاتے ہو تم
ہواؤں سے ہمارا پتہ پوچھتے رہے
کچھ اس طرح سے اپنا دیوانہ بنا جاتے ہو
ساتھ تو اک پل کا تھا پھر کیوں مجھے یاد آتے ہو تم
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

کرب کا سمندر ہے جسم و جان کا اب عالم
دہشت زیست پر میری اس طرح سے برسا غم
اپنا غم ہی لگتا ہے بیش سب کو سچ یہ ہے
داغ داغ ہے دل دل، آنکھ آنکھ ہے پرنم
شاخ گل سے پھولوں کا گرنا رنگ لایا ہو
کیا عجب کہ آنسو ہوں سارے قطرۂ شبنم
معرفت ہوئی آخر کہ زخم اہل دنیا کی
اسے پیش منظر میں اپنا کیا کریں ماتم
کان بھر دیئے کس نے جا کے ہر تعلق کے
ایک ہوگیا سب کی بے وفائی کا عالم
ساز باز میں یکتا توڑ جوڑ میں ماہر
عہد حال میں لیکن آدمی ہے انسان کم
حسن و رنگ تابع ہے کیف طبع کے واجد
کوئی شے نہیں بھاتی گر مزاج ہو برہم
(پروفیسر واجد نگینوی.....لاہور)

جب تیرا نام لب پہ آتا ہے
دل میرا ڈوب جاتا ہے
اک قیامت سی ٹوٹ جاتی ہے
جب کوئی حال دل سناتا ہے
میں تو سب کچھ لٹا کے بیٹھا ہوں
اور کیا مجھ کو آزماتا ہے
میں سناتا ہوں حال دل جس کو
کس لئے مجھ سے خوف کھاتا ہے
دل تڑپتا ہے دیکھ کر صورت
زخم سینے پہ جب لگاتا ہے
پہلے چھوڑے تھے جو محبت کے
نقش اب کس لئے مٹاتا ہے
سن کے یارو شہزاد کی باتیں

حسن کیوں مجھ سے خوف کھاتا ہے
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

کچھ چنچل سی کچھ صوبر سی
ایک تتلی جیسی لگتی ہے
عجب طرح کی لڑکی ہے وہ
کبھی شوخ تو کبھی گم سی رہتی ہے وہ
پل میں تولہ پل میں ماشہ
جانے کتنے رنگ بدلتی ہے
کبھی انجان ہے وہ جگ سے
تو کبھی اپنی اپنی لگتی ہے
کچھ چنچل سی کچھ صوبر سی
ایک تتلی جیسی لگتی ہے
دیکھے جب تکلیف میں کسی کو
تو آتی ہے وہ کام بہت
دل میں اپنے بزرگوں کا
رکھتی ہے وہ احترام بہت
دل میں اپنے درد چھپائے
سب کے دکھ میں روتی ہے
کچھ چنچل سی کچھ صوبر سی
ایک تتلی جیسی لگتی ہے
باتیں اس کی پیاری پیاری
دلکش سہانی لگتی ہیں
کبھی فقیہ سی کبھی ناداں سی
دل کو کتنی بھاتی ہیں
کبھی تو ہے وہ سمجھدار بہت
تو کبھی عقل سے پیدل لگتی ہے
کچھ چنچل سی کچھ صوبر سی
ایک تتلی جیسی لگتی ہے.....!!!
(شاعرہ: ایڈووکیٹ نیتا خان.....کراچی)

اک اجنبی کو دیکھتے ہی میں نے اپنا دل
ہار دیتا تھا، اپنا سب کچھ اسے مان لیا تھا
میں اس کے ساتھ نہ صرف جذبات و احساسات سے
بلکہ ہر معاملے میں پر خلوص تھا!
مجھے نہ معلوم تھا کہ وہ میرے خلوص کو
اک وقتی جذبے اور کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا!
وہ مجھ سے اور میرے خلوص سے اک ستم گر کی طرح
بے ڈر ہو کے کھیلتا رہا اور میں کٹھ پتلی بنا
اس کے اشاروں کو اس کا خلوص سمجھ کر ناچتا رہا!
اپنی اہمیت گھٹاتا رہا!
جب اس کا دل مجھ سے کھیل کھیل کے
مجھے اپنے اشاروں پہ نچا نچا کے اکتا گیا تو
وہ مجھے لاوارثوں کی طرح چھوڑ گیا!
مجھے غم جدائی دے گیا ہے!
بے خوف اجنبی تھا وہ آفرین
جاتے جاتے ساتھ تو چھوڑ ہی گیا ہے مگر
ساتھ ہی میرے شیشے جیسے شفاف دل کو
بے داغ محبت بھرے، بے حد چاہنے والے
اس کے لئے ہر پل، ہر وقت اور ہمیشہ فکر مند ہونے والے
دل کو بھی بے دردی اور بڑی بے رحمی سے توڑ گیا ہے
(شاعرہ: رابعہ آفرین امانت.....لاہور)

جب
دل کے سنگھاسن پر
کوئی مہان دیوی
براجمان ہے ہوتی
تو
دل ہوش و خرد سے ہو جاتا ہے بیگانہ
پھر
محبت کا آسیب
دل و جان سے جاتا ہے لپیٹ
اور
دل ہے کہ
ان
ساعتوں کے ہونے اور
کرتا ہے دعائیں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

جب ہنسنا غم سے بوجھل ہو
اور یاد کسی کی آئی ہو
تب بند کمرے میں بند ہو جانا
اور چپکے چپکے رو لینا
جب آنکھیں گیلی ہو جائیں
اور یاد میں کسی کی بہہ آئیں
پھر خود کو دھوکہ مت دینا
اور چپکے چپکے رو لینا
جب پلکیں قرب سے موندی ہوں
اور سن سمجھے کے تم سوئے ہو
تب تکیہ منہ پر رکھ دینا
اور چپکے چپکے رو دینا
تم سب کے سامنے چپ رہنا
اور کچھ بھی کسی سے نہ کہنا
تنہائی میں تم جب ہو کبھی
اور چپکے چپکے رو دینا
(عثمان غنی.....پشاور)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں
لوٹ کر اب کبھی نہ آئے گا تیرے پاس
ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں
تیرا نام لے کر تڑپاتی ہیں مجھے تیری یادیں
جب کبھی بجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا
مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں
فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو
ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں
(فلک زاہد.....لاہور)

اس لئے موت کا اب کوئی طلبگار نہیں
لوگ کج فہم ہیں سب کوئی سمجھدار نہیں!
دشمنو آؤ مجھے آج مسخر کر لو!
کوئی ہمدرد مرا کوئی وفادار نہیں!

اوڑھ رکھی ہے تیری یاد کی چادر میں نے
دن جدائی کے مجھے باعث آزار نہیں
وقت نے زخم لگائے کچھ ایسے ہم نے
زندگی مجھ سے محبت کی طلبگار نہیں
غم دنیا کا تسلط ہے دلوں پر سب کے
اب کوئی عشق و محبت کا سزاوار نہیں!
آبلے پاؤں کے رفتار بڑھا دیتے ہیں
دل میں جذبہ ہو تو منزل کوئی دشوار نہیں
(حکیم خان حکیم۔کامل پور موسیٰ، اٹک)

میرے شہر کے گلستاں میں لگی آگ کو بجھا دو
بچے ہوئے پھولوں کو جلنے سے بچا دو
ہر روز ہے اک نئی داستان خون میں ڈوبی ہوئی
قاتل کب تک رہیں گے نامعلوم اتنا تو بتا دو
کون مرا کس نے مارا پوچھتے ہیں لوگ آتے جاتے
تھک چکے ہیں ہاتھ لاشے اٹھاتے اٹھاتے
کب ختم ہوگی ظلم کی یہ سیاہ رات بابر
مجھے میرا پہلے والا شہر کراچی لوٹا دو
(بابر علی رند بلوچ.....ساہیوال)

پیارا و دلکش ہے کوئٹہ کا منظر
دھرتی نے اوڑھ لی سفید چادر
روئی کے گالوں کی سی ہے برف باری
آنکھوں کو لگتی ہے بہت پیاری
ہلکی ہلکی ہوا بھی ہے در آئی
سردی کی لہر جسم میں اتر آئی
برف کے گولے بچے اچھال رہے ہیں
مجسموں میں برف کو ڈھال رہے ہیں
برف باری کا ہنہ میں ہے طلسم چھایا
پورا شہر یہاں آج امڈ آیا
ہر طرف ہے ٹھنڈا و خوب صورت سماں
ہر چہرہ ہے خوشی سے شاداں
(ساحل ابڑو۔ڈیرہ اللہ یار بلوچستان))

☆☆

ایک صدی بعد

فیصل ندیم ساحل۔شیخوپورہ

اور پھر عین وقت پر اذان فجر ہونے لگی تو سرگرداں روح وہاں سے بھاگنے لگی کہ پھر اچانک اس کے قدم زمین میں دھنس گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ روح زمین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھنس گئی۔

رگوں میں لہو منجمد کرتی، ہر طرف خوف پھیلاتی ایک روح کی خوفناک دیدہ دلیری

کب سے دروازے پر دستک ہو رہی تھی لیکن کوئی کھول ہی نہیں رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو ایک عور ت باہر آئی اور پوچھا۔

"جی فرمایئے آپ کون، کس سے ملنا ہے آپ کو.....؟" ایک شخص جو اس عورت کو گھور کر دیکھ رہا تھا کچھ لمحے بعد بولا۔

"میرا نام غلام حسین ہے میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں مجھے اصرار بیٹے سے کچھ ضروری کام تھا کیا وہ گھر پر ہے.....؟" وہ عورت بولی۔ "نہیں اصرار تو گھر پر نہیں ہیں وہ کسی کام کے سلسلے میں باہر گئے ہیں آپ پیغام دے دیجیے میں انہیں بتادوں گی آپ کے بارے میں۔"

"جی نہیں شکریہ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے جب وہ واپس آئے گا تو میں خود ہی اس سے مل لوں گا اچھا خدا حافظ۔" غلام حسین نے جیسے ہی اپنے قدم آگے بڑھائے تو اچانک آنے والی آواز نے اس کے پاؤں وہیں روک دیئے غلام حسین نے جونہی پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا ایک کتا دروازے کی طرف منہ کر کے زور زور سے بھونک رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا اس نے دروازے میں کھڑی عورت کی جانب دیکھا تو وہ اس سے ڈر رہی تھی اس نے اس بات کا کوئی مطلب نہ لیا اور اسے اتفاق سمجھ کر اور یہ جان کر چل دیا کہ اکثر کتے انسانوں پر بھونکتے ہیں ہوسکتا ہے یہ بھی اس عورت کو انجان سمجھ کر ہی بھونک رہا ہو کیونکہ وہ گاؤں میں نئی جو آئی ہے۔

غلام حسین کے جانے کے بعد اس عورت نے فوراً دروازہ بند کیا اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ لیکن کتا باہر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ شام کو جب اصرار گھر آیا تو وہ کتا اس عورت کو دیکھ کر پھر سے بھونکنے لگا اور لگاتار بھونکتا ہی رہا۔ کتے کے اس طرح اچانک اتنا زیادہ بھونکنے سے اصرار چونک گیا اور اپنے گھر میں ٹھہری ہوئی اس عورت سے پوچھنے لگا۔ "رقیہ یہ کتا تمہیں دیکھ کر بھونک رہا ہے یا مجھے دیکھ کر.....؟"

وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔ "شاید یہ آپ کو دیکھ کر بھونک رہا ہے پہلے تو چپ چاپ بیٹھا تھا۔" "لیکن رقیہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پہلے کبھی یہ کتا مجھے دیکھ کر نہیں بھونکا آج اتنا زیادہ پتہ نہیں کیا بات ہے.....؟"

رقیہ جھٹ سے بولی۔ "ارے ایسے ہی اس نے کچھ دیکھ لیا ہوگا چھوڑیں آپ بھی کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئے، ابھی آئے ہیں تھک گئے ہوں گے آپ پہلے کھانا کھالیں۔" رقیہ کھانا لے کر آئی اور اصرار کے سامنے رکھ کر کہا۔ "لیجیے کھانا تیار ہے کھالیں۔"

اصرار کھانا کھانے ہی والا تھا کہ اس نے رقیہ کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ "رقیہ تم نے کھانا کھالیا ہے کیا.....؟"

رقیہ بڑے پیار سے بولی۔ "نہیں آپ کھالیں میں بعد میں کھالوں گی۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی چلو ہمارے ساتھ چل کر کھانا کھاؤ اور ایک بات یاد رکھنا اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔"

دونوں ساتھ ہی کھانا کھانے لگ گئے کہ اصرار نے پانی مانگا رقیہ نے اسے گلاس میں پانی ڈال کر پیش کیا۔

اصرار نے ابھی ایک گھونٹ ہی پانی پیا ہوگا کہ اس نے پانی کا گلاس دور پھینک دیا۔ رقیہ یہ دیکھ کر جھٹ سے بولی۔ "ارے کیا ہوا.....؟"

اصرار خوف کے سائے میں بولا۔ "اس..... اس ..... پانی میں..... لال بیگ تیر رہا تھا پتہ نہیں کہاں سے آ گیا اچانک۔"

"ارے شکر ہے کہ آپ نے عین وقت پر دیکھ لیا اور پانی پھینک دیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

کھانا ختم ہونے کے بعد رقیہ نے غلام حسین کے بارے میں بتایا تو اصرار کہنے لگا۔

"ارے وہ ہمارے کھیتوں کا کام سنبھالتے ہیں بہت اچھے انسان ہیں انہیں کوئی کام ہوگا شاید تب ہی آئے ہوں گے اور ہاں تمہارے بارے میں انہیں پتہ نہیں ابھی تمہیں دو دن ہی تو ہوئے ہیں آئے ہوئے آہستہ آہستہ سب سے جان پہچان ہو جائے گی تمہاری بھی۔"

اسی دوران پھر سے دروازے پر دستک ہوئی۔ "مجھے لگتا ہے غلام حسین چچا ہی ہوں گے میں دیکھتا ہوں۔"

"ارے نہیں آپ بیٹھے میں دیکھتی ہوں دروازے پر کون ہے؟" رقیہ نے سر پر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا اور دروازے کی جانب چل پڑی۔

"اگر غلام چچا ہوں تو انہیں اندر ہی بلا لینا۔"

رقیہ نے دروازہ کھولا تو غلام حسین کو کھڑا پایا۔

"بیٹی اصرار آ گیا کیا۔"

رقیہ نے کہا۔ "جی ہاں سامنے بیٹھے ہیں آپ اندر آ جایئے۔"

رقیہ نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ دروازے سے تھوڑا دور بیٹھا کتا ایک جھٹکے سے اٹھا اور دروازے کے قریب آ کر پھر سے زور زور سے بھونکنے لگا۔ غلام حسین ایک نظر کتے کی جانب ڈالی اور دوسری رقیہ کی طرف اور پھر حیرانی سے کچھ سوچتے ہوئے اندر آ گئے۔ اصرار کے پاس جا کر اس کا حال احوال پوچھا تو اس نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں چچا آپ کیسے ہیں اور کیسا چل رہا ہے کھیتوں کا کام مسئلہ تو نہیں ہے ناں.....؟"

غلام حسین نے کہا۔ "بیٹا کوئی مسئلہ نہیں ہے تم سے اس لئے ملنا چاہتا تھا کہ فصل پر کیڑے مار اسپرے کروانا ہے اس لئے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے اور تم تو جانتے ہو مجھے کہ میں ہمیشہ اپنا کام بروقت کرنے کا عادی ہوں۔"

اصرار مسکرایا اور بولا۔ "ہاں چچا میں جانتا ہوں اور یہ

بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنا کام پوری محنت اور ایمانداری سے کرتے ہیں۔" اسی دوران اصرار نے رقیہ سے کہا۔

"ذرا اندر سے کچھ پیسے لاکر چچا کو دے دو۔" تو رقیہ اندر سے پیسے لینے چلی گئی تب ہی غلام حسین نے اصرار سے ایک سوال پوچھا۔

"بیٹا اصرار یہ تمہارے گھر میں عورت کون ہے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا اسے تمہارے گھر میں میں نے.....؟"

اصرار نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ "چچا اس کا نام رقیہ ہے بے چاری بے سہارا تھی اس کے ماں باپ ناگہانی اموات کے باعث مارے گئے اس لئے یہ اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئی اور یہاں آ گئی پھر اس سے بھیک مانگتے ہوئے میری ملاقات ہوئی اور میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔"

"ارے بیٹا یہ کام تو تم نے بہت نیکی کا کیا ہے لیکن بیٹا یہ کچھ۔" ابھی غلام حسین اپنی بات پوری کرنے ہی والے تھے کہ رقیہ پیسے لے کر آ گئی اور کہا۔ "یہ لیں پیسے۔"

غلام حسین نے پیسے لئے اور ایک نظر غور سے رقیہ کی جانب دیکھا پھر اصرار کی جانب دیکھتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے۔ "اچھا بیٹا اب میں چلتا ہوں اپنا بہت خیال رکھنا۔" پھر رقیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بھی کہا۔

"بیٹی تم بھی اپنا خیال رکھنا خدا حافظ۔"

غلام حسین دروازے کے پاس پہنچے اور دروازہ کھول کر باہر نکلے تو وہ کتا وہیں دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا مگر بھونکا نہیں لیکن جیسے ہی رقیہ دروازہ بند کرنے کے لئے آئی تو کتا دوبارہ سے بھونکنے لگا۔ غلام حسین نے یہ دیکھ لیا تھا رقیہ نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور واپس کمرے میں چلی گئی لیکن غلام حسین کی سوچ انہیں اس عجیب رویے پر سوچنے پر مجبور کر رہی تھی اور یوں وہ سوچتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے پیسے اپنے گھر پر رکھے اور وہاں سے سیدھا رحمت بابا کے گھر کی راہ لی۔

رحمت بابا گاؤں میں ایک ایسے بزرگ تھے جن کی سو سال سے زیادہ عمر تھی اور ابھی تک صحت مند تھے انہیں چلنے پھرنے میں تھوڑی بہت دشواری پیش آتی تھی۔

غلام حسین رحمت بابا کے پاس بیٹھے اور ان کا حال احوال دریافت کیا۔

رحمت بابا نے کہا۔ "میں تو ٹھیک ہوں غلام حسین تم اپنی سناؤ کیسے ہو اور کیسے یاد آ گئی آج میری.....؟"

غلام حسین نے آس پاس نظر دوڑائی اور جب کسی کو قریب نہ پایا تو رحمت بابا کے نزدیک ہو کر بولے۔ "بابا تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی آج اس لئے آیا ہوں۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے گاؤں میں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو مجھے اس سوال کا جواب دے سکے یا اس کے بارے میں مجھے بتا سکے کچھ۔"

"ارے غلام حسین بھئی کچھ بتاؤ گے بھی یا نہیں بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہے اتنے پریشان کیوں ہو تم بولو۔"

"بابا دراصل بات یہ ہے کہ آج میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا ہے جس کی مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی اپنا اصرار ہے ناں اعظم بشیر کا بیٹا آج دوپہر کو جب میں اس کے گھر کسی کام سے گیا تو میں نے دیکھا اس کے گھر میں ایک عورت ٹھہری ہوئی ہے اصرار نے بتایا ہے کہ وہ بے سہارا تھی اس لئے اسے سہارا دیا ہے اور اپنے گھر پر ہی رکھ لیا ہے اسے۔

لیکن بابا جو حیرانی کی بات ہے وہ یہ ہے کہ میں دوبار اصرار کے گھر گیا آج پہلے تو وہ گھر پر نہیں ملا تھا پھر شام کو گیا تو گھر میں موجود تھا دوپہر کو جب اس عورت نے دروازہ کھولا تب اسے دیکھ کر ایک کتا مسلسل بھونکنے لگا میں سمجھا شاید مجھے دیکھ کر بھونک رہا ہے لیکن شام کو جب پھر میں اصرار کے گھر گیا تو اس عورت کے دروازہ کھولنے پر دیکھا کتا پھر سے بھونکنے لگا اور کافی دیر تک بھونکتا رہا پھر جب میں وہاں سے واپس ہونے والا تھا تب بھی میں نے دیکھا اور غور کیا وہ کتا اس عورت کو دیکھ کر بھونک رہا تھا اور وہ عورت بھی کچھ عجیب قسم کی لگی مجھے خدا جانے کیا معاملہ ہے۔" بابا رحمت کچھ دیر تک گہری سوچ میں گرفتار رہے اور پھر دوسرے ہی لمحے بولے۔

"تو وہ آ گئی..... اس کا مطلب ہے اس نے سچ

کہا تھا اور وہ آ گئی آخر....."

"بابا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہے ہو کون آ گئی.....؟"

"غلام حسین جو تم نے بتایا ہے اگر وہ سچ ہے تو سمجھو وہ آ گئی وہی چڑیل جس نے آج سے ساٹھ سال پہلے اصرار کے دادا بشیر احمد کی حویلی میں قیام کیا تھا تب بھی وہ ایک عورت کی طرح لگتی تھی لیکن حقیقت میں عورت نہیں بلکہ ایک چڑیل ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت بھی اس عورت کے روپ میں چڑیل سے جانور ڈرتے تھے، کتے اکثر اسے دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔

اس بات کا علم جب اصرار کے دادا بشیر احمد کو ہوا تو وہ کافی پریشان ہوئے لیکن انہوں نے ہمت کر کے کسی نہ کسی طرح اس چڑیل کی چوٹی کاٹ ڈالی اور پھر اسے زمین میں دبا دیا۔ چوٹی کے زمین میں دبتے ہی وہ چڑیل اپنے اصلی روپ میں سب کو دکھائی دی، زمین کے اندر دھنستے ہوئے۔ پھر جیسے ہی وہ ساری کی ساری زمین کے اندر دھنس گئی تو بشیر نے اوپر سے وہاں دم کیا ہوا پانی چھڑک دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے نیچے ہی رہ گئی لیکن اس نے جو کہا تھا شاید وہ سچ نکلا غلام حسین۔"

"بابا کیا کہا تھا اس نے جو سچ نکلا ہے بتاؤ ناں.....؟"

اس چڑیل نے زمین کے اندر دھنسنے سے قبل کچھ باتیں کی تھی کہ "بشیر احمد تم نے مجھے مار کر اچھا نہیں کیا میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئی تھی یہاں اب دیکھنا تمہاری نسل کو کس طرح مارتی ہوں میں۔

بشیر احمد میں ایک صدی گزرنے کے بعد پھر سے زندہ ہو کر آؤں گی اسی روپ میں تیری نسل کا نام و نشان مٹا دوں گی۔"

"ایک صدی مکمل ہو چکی ہے غلام حسین اگر میری بڑ گوئی ٹھیک ہے تو وہ ضرور اصرار کو مارنے آئی ہے یہاں کیونکہ اصرار ہی اب بشیر احمد کی نسل کا واحد فرد باقی بچا ہے اس کا باپ اور ماں تو اس کے پیدا ہوتے ہی کسی انجانی بیماری سے ہلاک ہو گئے تھے۔"

"لیکن بابا ہم کیسے یقین کر لیں کہ وہ عورت نہیں چڑیل ہی ہے کیونکہ وہ بظاہر تو بالکل عورت جیسی دکھائی دیتی ہے۔"

"ہاں مگر یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی تھی آج میں نے اس کے سر پر بال نہیں دیکھے وہ اپنے سر سے دوپٹہ ہٹنے نہیں دیتی ہشاید اپنی چوٹی چھپا رہی ہوگی بابا۔"

"تم نے ٹھیک کہا غلام حسین وہ اپنی کٹی ہوئی چوٹی چھپائے گی تاکہ کسی کو حیرت نہ ہو دیکھ کر اور دوسری بات اگر تمہیں پتہ لگانا ہے تو سب سے پہلے یہ جان لو کہ صرف کتا ہی اسے دیکھ کر بھونکتا ہے یا باقی جانور بھی اور ہاں یاد رکھنا غلام حسین چڑیل کی یہ پکی نشانی ہوگی کہ جانور اس سے موت کی طرز سے ڈریں گے اس کی شکل عجیب سی ہوگی اسے دیکھتے ہی بھونکنے گیں وہ ہر ہفتے والے دن کی رات کو قبرستان جائے گی اور جب وہ زمین پر چلے گی تو اس کے پیروں کے نشان نظر نہیں آئیں گے۔"

"بابا میں اس سچائی کا پتہ چلا کر ہی رہوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اسے اس طرح سے اصرار کو مارنے نہیں دوں گا۔ بہت بہت شکریہ بابا کہ تم نے میری الجھن سلجھا دی اب میں چلتا ہوں کل آؤں گا تمہارے پاس پھر سے کچھ نئے شواہد لے کر اور یہ جان کر کہ ایسا سچ میں ہے یا نہیں جیسا تم نے بتایا ہے اس کے بارے میں۔"

"ٹھیک ہے غلام حسین خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔" غلام حسین وہاں سے گھر آئے اور صبح ہوتے ہی اصرار کے گھر چلے گئے پھر شام کو گھر آ کر کھانے سے فارغ ہو کر بابا رحمت کے پاس چلے گئے اور بتایا۔

"بابا میں نے دیکھا ہے باقی جانور بھی اس کے پاس جانے سے کتراتے ہیں اور چلتے ہوئے اس کے پاؤں کے نشان نظر نہیں آتے لیکن میں نے دیکھا ہے بابا آج اچانک ہوا کے جھونکے سے اس کا دوپٹہ ہٹ گیا سر سے تو اس کی چوٹی واقعی میں کٹی ہوئی تھی آدھی اور باقی کی آدھی کسی سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔"

"بابا آج ہفتہ کی رات ہے آج اگر رات کو وہ قبرستان جاتی ہے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ تم نے سچ کہا

ہے اس کے بارے میں۔"

رات ہوئی اور غلام حسین قبرستان جانے والے راستے پر چھپ کر بیٹھ گئے اور اس عورت کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔

دوسری طرف وہ عورت اصرار کے گہری نیند میں سونے کا انتظار کر رہی تھی جب اسے یقین ہوگیا کہ اصرار اب سو گیا ہے تو اس نے چپکے سے کالی شال اوڑھی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ٹھیک اسی لمحے پاس میں موجود کتے نے بھونکنا شروع کر دیا لیکن وہ عورت جو حقیقت میں چڑیل تھی بے خوف قبرستان کی طرف چل پڑی غلام حسین بھی چھپتے چھپاتے اس کے پیچھے ہولئے اور قبرستان کے پاس جا کر رک گئے۔

کیا دیکھتے کہ وہ چڑیل اپنے اصلی روپ میں آئی اور ہوا کی طرح ایک قبر میں چلی گئی یہ منظر غلام حسین کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھا۔ خوف کے باعث غلام حسین پر لرزہ طاری تھا لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے سیدھا بابا رحمت کے گھر کا رخ کیا اور بابا رحمت کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

بابا رحمت نے کہا۔ "غلام حسین اصرار کو بچا لو اب کسی طرح وہ اسے ضرور مارنے والی ہے وہ چاند کے پورا ہوتے ہی اصرار کو اپنے ساتھ لے جائے گی قبرستان میں اور پھر اس کی روح نکال کر اپنے جسم میں اتارے گی یوں اس کی طاقت اور بڑھ جائے گی اور اس کی چوٹی پوری ہو جائے گی پھر وہ اپنی طاقت کو بحال رکھنے کے لئے ہر چاند کی چودہ تاریخ کو کسی نہ کسی انسان کی روح نکال کر اپنے جسم میں اتارے گی اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا..... لیکن اس کا اس اصل اور سب سے پہلا مقصد جو اسے یہاں کھینچ لایا ہے وہ اصرار کو مارنا ہے اور بشیر احمد کی نسل کا خاتمہ کرنا ہے بس۔"

"لیکن بابا پورے چاند کی رات تو کل ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ کل اصرار کو مار دے گی۔"

"نہیں نہیں بابا ہمیں کچھ کرنا ہوگا کچھ سوچنا ہوگا اصرار کو بچانا ہوگا۔" غلام حسین نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"تو اس کا پھر ایک ہی حل ہے غلام حسین کہ کسی طرح اصرار کو یہ باور کروا دو کہ اس کے گھر میں جو عورت رہ رہی ہے وہ ایک خونی چڑیل ہے اور اس کا مقصد صرف اسے مارنا ہے پھر دیکھنا وہ خود ہی سنبھل جائے گا۔"

"اس طرح وہ ہماری بات نہیں مانے گا اور اگر اس بار وہ اصرار کو مارنے میں ناکام رہتی ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی پھر کبھی زندہ نہیں ہو پائے گی وہ....."

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بابا میں ابھی جا کر اصرار کو بتا دیتا ہوں تا کہ اسے پتہ چل سکے۔"

"ہاں ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔"

غلام حسین فوراً اصرار کے گھر پہنچے دروازہ کھلا ہوا تھا فوراً سے جا کر اصرار کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ بھی کہا کہ چڑیل کو کسی صورت پتا نہ ہونے پائے کہ ہم اس کی اصلیت جان چکے ہیں۔"

اگلے روز دونوں بابا رحمت کے پاس آئے تو انہوں نے بھی اصرار کو بتایا۔ "یہ سچ ہے بیٹا تمہاری جان کو خطرہ ہے اس لئے آج رات تمہیں اس کی نظروں سے اوجھل رہنا پڑے گا اور اس کے لئے سب سے اچھی جگہ مسجد ہے تم مسجد میں رہو گے رات بھر۔"

ساری حقیقت اصرار کے سامنے تھی۔

دن بھر رقیہ اصرار سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی اور اپنا یقین اس پر بڑھاتی رہی لیکن رات ہوتے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آ گئی اور اصرار سے کہنے لگی۔

"چلو میرے ساتھ آج تمہاری روح کی ضرورت ہے مجھے۔"

اصرار نے وہاں سے مسجد کی جانب دوڑ لگا دی اور چڑیل کی گرفت سے قبل مسجد میں آ کر بیٹھ گیا۔

وہ چڑیل باہر چیختی چلاتی رہی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

پھر عین وقت پر اذان فجر ہونے لگی تو وہ چڑیل وہاں سے بھاگ گئی اور ہمیشہ کے لئے زمین میں دھنس گئی اور اس طرح اصرار کی آنے والی نسل چڑیل کے انتقام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی۔

موت کا انتظار

عمیر علی-لاہور

بزرگ نے جیسے ہی اپنی لاٹھی بدروح کی طرف کر دی تو لاٹھی سے زبردست شعلہ نکلا اور روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو روح کی کربناک چیخیں قرب و جوار کو دہلانے لگیں اور پھر وہ روح.....

ایک بدروح کی دیدہ دلیری کہ ہاتھ دھو کر وہ نوجوان کے پیچھے پڑ گئی تھی، خوفناک کہانی

گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد میں گاڑی سے اترا اور اس گھر کو دیکھنے لگا۔ امی نے کتنے خواب دیکھے تھے ابو نے کتنی محنت کی تا کہ میں کچھ بن جاؤں۔ اور آج جب میں ایک کامیاب کاروباری آدمی تھا اور سالوں کی محنت کے بعد اپنا گھر خریدنے میں کامیاب ہو گیا تھا تو آج وہ ہستیاں ہی میرے ساتھ نہیں تھیں جنہوں نے مجھے یہاں پہنچانے میں انتھک محنت کی۔ اداسی ملی خوشی کے جذبات لیے میں اپنے نئے گھر میں پہلا قدم رکھا۔ گو گھر دیکھنے کے لئے بھی ایک دو بار آ چکا تھا لیکن اس وقت یہ گھر میرا نہ تھا۔ تو اس مناسبت سے یہ میرا اپنے گھر میں پہلا قدم تھا۔

"صاحب آپکا سامان آ گیا ہے"۔ اس آواز پر میں چونکا تو ٹرک ڈرائیور جسے میں اپنا سامان اس گھر میں لانے کو کہا تھا وہ موجود تھا۔ "ٹھیک ہے اندر لے آؤ، مزدور لائے ہونا"۔ میں نے پوچھا۔ "جی صاحب"۔

سامان گھر میں لگوانے کے بعد تھکاوٹ سے ایسے نیند آئی کہ مجھے رات کے کھانے تک کا ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

اچانک کسی کھٹکے سے آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا لیکن ایک مانوس سی خوشبو فضا میں محسوس ہو رہی تھی۔ جبھی دروازے کی چرچراہٹ ہوئی اور ایک سفید آنچل لہرا کر غائب ہو گیا۔ میں جلدی سے بستر سے نکلا اور اس طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی میں باہر نکلا ایک نسوانی سراپا خراماں خراماں چال چلتا ہوا باہر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں تیز بھاگا لیکن پھر بھی اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر پایا۔ اور وہ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں جلدی سے دروازہ کھول کر گلی میں نکلا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔

"حمیرا۔ حمیرا، کہاں ہو تم"۔ میں زور سے چلانے لگا۔ اچانک روشنی کا تیز جھماکا ہوا اور میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ میری زندگی سے تو چلی گئی لیکن میرے خیال و خواب میں ابھی بھی اسی کا بسیرا تھا۔

☆☆☆

دن گزرنے کے ساتھ میں گھر میں اکیلے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے فلیٹ میں جن دوستوں کا ساتھ رہتا تھا۔ وہاں ہم خوب ہلہ گلہ مچائے رہتے تھے۔اسی لیے میں نے آج اپنے پرانے دوستوں کو اپنے گھر پر رات کے کھانے کی دعوت دی۔ یوں تو سب دوست ہی میرے جگری تھے لیکن کامران وہ تھا جو میرے سب سے قریب تھا۔ بن کہے سب سمجھ جاتا۔

"بہت اکیلا محسوس کرتا ہے نا۔ لیکن ہم روزانہ تو یہاں نہیں آسکتے نا۔ میری مان تو شادی کرلے سمیر"۔اس نے گویا ایک جملے میں میری کیفیت بھی بیان کردی اور وہ مطالبہ بھی کردیا جو وہ ہر بار کرتا آیا تھا۔اور میں ہر بار کی طرح اب بھی خاموش رہا۔

"یار اب تمام عمر تو ماضی کے سہارے کیسے جی سکتا ہے۔ پرانی یادیں بھلا کر اب آگے بڑھنا ہوگا"۔

دوستوں کے جانے کے بعد میں کامران کی باتوں پر سوچنے لگا لیکن میرے لیے یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ اپنی مرحوم بیوی حمیرا کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح زندگی میں واپس آتو گیا لیکن دل کا وہ کونہ جو حمیرا کے نام کردیا تھا اس میں کسی اور کو جگہ نہ دے سکا۔ گئے وقت کے صحرا میں جانے کب تلک میں تشنہ آرزؤں کو لیے گھومتا رہا اور پھر نیند کی وادیوں میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح حسب عادت چہل قدمی کے لئے نکلا تو واپسی پر اپنے گھر سے دو گھر پہلے اچانک چھت پر نظر گئی اور پھر وہیں جم گئی۔اپنی عادت کے برخلاف میں اسے دیکھتا چلا گیا۔ مجھے اس کے چہرے پر چھائی سوگواری اور اس کی ذات سے پھوٹتے خالی پن نے اسکی طرف ایسا متوجہ رکھا کہ مجھے اندازہ بھی نا ہوا کہ میں کتنی غلط حرکت کررہا ہوں۔ میری نظروں کی تپش سے وہ اچانک چونکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہڑبڑا کر نظریں بدل لیں، کچھ دیر بعد دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

دفتر سے واپسی پر بھی میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کے بارے میں سوچتا رہا اور جانے کب میرے قدم چھت کی جانب اٹھتے چلے گئے وہ کوئی طاقت تھی جو مجھے چھت پر لے گئی ۔ وہ صبح کی طرح عین اسی مقام پر موجود تھی۔ یک ٹک ایک جانب دیکھتی ہوئی وہ کسی اداس بھری تصویر کا مکمل شاہکار دکھائی دے رہی تھی۔اچانک صبح والا منظر دوہرایا گیا اس نے اچانک میری جانب دیکھا، میں نے نظریں چرائیں اور کچھ لمحوں بعد وہ وہاں موجود نہ تھی۔

جس قدر وہ اپنا سونا پن مجھ سے چھپانا چاہتی تھی میں اسی قدر اسکی کیفیت اور شخصیت کے سحر میں جکڑتا چلا گیا۔اور پھر یہ معمول بننے لگا اور اب اس نے بھی شاید میری ذات کو کسی نہ کسی طرح قبول کرلیا تھا۔اب وہ میرے آنے پر بھاگتی نہ تھی۔ بلکہ اپنی سونی سونی آنکھوں کا رخ میری جانب کیے بس دیکھتی رہتی۔ میں بھی اسکی آنکھوں کے سحر میں ایسا جکڑا جاتا کہ گویا تمام کائنات بھلا دیتا۔پھر اچانک وہ آنکھوں سمیت منظر سے غائب ہوتی اور میں چونک کر اسے تلاش کرنے لگتا۔ پھر ایک دن تمام ہمت مجتمع کرکے میں نے اسے پکارا۔ "سنیے"

وہ یک دم چونک پڑی لیکن جواب دیا۔ "جی"۔

"آپ اتنی اداس سی کیوں رہتی ہیں"۔

"آپ سے مطلب؟" اس نے وہ سوال کر ڈالا جس کا جواب میں خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ وقت نے رفتار پکڑی اور ہم کچھ قریب آنے لگے گھلنے ملنے لگے۔ایک دن میں گھر میں سو رہا تھا کہ زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز نے جگا دیا۔گھڑی میں دیکھا تو ابھی چھ بجے کا وقت تھا۔جھنجلاتے ہوئے اٹھا اور پوچھا کون ہے۔

"اللہ کے نام پر دے دے بابا"۔ چھ بجے ایک فقیر کی یوں کھلی بدمعاشی پر غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کرتے ہوئے محض اتنا ہی کہا۔ "معاف کرو بابا"۔

"سوالی کو خالی نہیں بھیجتے بیٹا"۔ فقیر نے کہا۔

بکھرے کمرے میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا بٹوہ کھولا اور اس میں سے دس روپے نکال کر باہر کی طرف

نکلا۔دروازہ کھول کر پیسے فقیر کی طرف بڑھائے۔

"لو بابا"۔ایک چولا سا پہنے پیروں میں ٹوٹی پھوٹی چپل لیے وہ مفلوک الحال فقیر مجھے دیکھ کر اچھل پڑا۔جیسے اس نے بجلی کے کسی ننگے تار کو چھولیا ہو۔ جھٹک کر میرے پیسے اس نے میری طرف پھینکے اور خوفناک آواز میں چلایا۔ "نہ کررررر" "نہ کررررر"

"یہ کیا کررہا ہے تو، تباہ ہوجائیگا۔ چھوڑ دے، چھوڑ دے گا تو بچ جائیگا۔ رکھ اپنے پیسے۔ نہ کررررر"۔

اول فول بکتا ہوا فقیر یہ جا وہ جا اور میں اس کا ایک بھی لفظ نا سمجھ پایا۔اسی الجھن میں دوبارہ سونا محال ہوچکا تھا۔اور ویسے بھی صبح کی سیر کا وقت بھی ہوچکا تھا۔

دفتر سے واپسی پر میں سوچ رہا تھا نورین جو میری نئی محبت ہے جس نے حمیرا کے بعد میرے دل میں جگہ بنائی، اس کے لیے کوئی اچھے سے رنگ کا جوڑا لے جاوں۔ جب دیکھو اداس صورت بنائے سفید لباس میں گھومتی رہتی ہے۔ میرے لاکھ کہنے روٹھنے منانے پر بھی اس کا انداز نہ بدلتا۔ انہی خیالوں میں دوکان کی طرف بڑھا لیکن اسی جلالی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔

"نہ کرررررررررر"

"بول رہا ہوں نا، نہ کر،،،،، وہ جو ہے وہ نہیں ہے جو تو سمجھ بیٹھا ہے"۔ "نہ کررررررررررر"

"بابا کیا مسئلہ ہے، لو سو روپیہ"۔اپنی دانست میں سمجھا کہ بابا زیادہ مال بنانے کے چکر میں کچھ اداکاری کر رہا ہے۔لیکن وہ یہی الفاظ کسی ورد کی طرح کرتا ہوا چلا گیا۔

"نہ کررررررررررر" ، "نہ کررررررررررر"، "نہ کررررررررررر"

پھر یہ کچھ دن تک متواتر ہونے لگا۔ وہ اچانک کسی نہ کسی کونے سے نمودار ہوتا، عجیب بے ربط جملے کہتا جن کی مجھے سمجھ نہ آتی اور یونہی بکتا جھکتا نکل جاتا۔ میں اسے نیم پاگل سمجھ کر توجہ نہ دیتا اور پھر یہ سوچ کر نورین چھت پر منتظر ہوگی گھر کی جانب روانہ ہوجاتا۔

☆.....☆.....☆

"نورین، میرا خیال ہے ہمیں شادی کرلینی چاہیے"" کیسے کریں گے سمیر"

"تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو، جیسے سب کرتے ہیں"" باتیں تو تم عجیب کرتے ہو سمیر، ہم ویسے تھوڑی کرسکتے ہیں"" کیوں نہیں کرسکتے"" بس نہیں کرسکتے"

ایسے میں مجھے وہ اسی فقیر کی مانند لگتی جس کی باتیں میرے سر سے گزر جاتیں۔ "آخر بتاؤ تو کیوں نہیں کرسکتے میں تمہارے والدین سے بات کرونگا"

"وہ ایسا نہیں چاہیں گے، میری اس حالت کے ذمہ دار بھی وہی ہیں"۔ وہ اکثر ایسی باتیں کرتی اور جب میں وجہ پوچھتا تو ٹال جاتی، جب بھی اسکے گھر جاکر والدین سے بات کرنے کو کہتا وہ نہ صرف ٹال دیتی بلکہ کئی دن ناراض رہتی۔ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہ قصہ نمٹ جانا چاہیے اور میں نورین کو بتائے بغیر اس کے دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دی۔

"کون ہے" ایک نحیف سی آواز آئی اور اسی کے ساتھ دروازہ کھلا۔ پہلے ایک استخوانی سا جھریوں زدہ ہاتھ دکھائی دیا اور پھر ایک بڑھیا دکھائی دی۔

"جی میرا نام سمیر ہے میں آپ سے دو گھر چھوڑ کر نیا آیا ہوں"۔ "آجاؤ بیٹا اندر آجاؤ"۔اس نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔اندر داخل ہوا تو ایک بوڑھے کو جو چارپائی پر لیٹا ہوا تھا بالکل نورین کی طرح ایک طرف تکتے ہوئے پایا۔ شاید اس پورے گھر کو ایک ہی اداسی نے گھیرا ہوا تھا۔نورین کہیں دکھائی نہ دی۔

"کیسے آنا ہوا بیٹا"۔ بڑھیا نے پوچھا۔

"جی میں نورین کو پسند کرتا ہوں"۔ اتنا سن کر وہ چونک پڑی اور نورین کے باپ کو گویا کوئی دورہ پڑ گیا، غوں غوں کرتے وہ چارپائی پر اچھلنے لگا، بڑھیا نے بھاگ کر اسے پانی پلایا اور دونوں رونے لگے۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور دنیا کا باسی ہوں۔

تقریبا آدھ گھنٹے کے بعد میں جب اس گھر سے نکلا تو میرے چودہ کی بجائے اٹھائیس طبق روشن ہوچکے تھے اور میرے چہرے پر آنے جانے والے رنگوں کی رفتار اتنی تھی کہ کسی تیز رفتار ٹرین کی بھی کیا ہوگی۔ایسا کیوں نہ

ہوتا جو میں سن کر آیا تھا وہ مجھے اندر تک ہلا دینے کیلیے کافی تھا۔ جسے سن کر کسی بھی مظبوط سے مظبوط انسان کا کانپ جانا یقینی تھا۔ مجھے فقیر بابا کے جملے یاد آنے لگے۔

"نہ کررررررررررر""بول رہا ہوں نا، نہ کر،،،، وہ جو ہے وہ نہیں ہے جو تو سمجھ بیٹھا ہے"۔

"نہ کررررررررررر" قارئین آپ یقین نہیں کرینگے میں اب تک جس سے ملتا آیا، جس سے محبت کرتا آیا، جس کے سنگ مستقبل کے سپنے سجائے تھے وہ کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہیں بلکہ ایک روح تھی۔

جی ہاں نورین کی روح۔ جس پر اس کے ماں باپ نے اپنی مرضی تو تھوپ دی، جو اس نے قبول بھی کر لی لیکن اپنے آپ کو خوش نہ رکھ پائی۔ کسی سے گئے وعدے اسے اندر ہی اندر کسی گدھ کی مانند نوچتے رہے۔ کھوکھلے درخت کی مانند سوکھتے سوکھتے وہ ایک دن ریزہ ریزہ ہوگئی۔ شاید وہ تا قیامت اسی طرح بھٹکتی رہتی لیکن میری محبت اسے دوبارہ زندگی کی جانب لے آئی۔ کیسا عجیب جملہ ہے۔ کسی روح کا زندگی کی طرف لوٹنا۔ شاید محبت بھی ایسے کئی عجیب جملوں کا مجموعہ ہے۔ وہ دنیا میں واپس تو نہیں آسکتی تھی اور نہ ہی اس کی تشنہ آرزوئیں اسے دنیا سے مکمل ناطہ توڑنے دیتیں۔ لیکن پھر میں اسکے اور دنیا کے درمیان ایک رابطہ بن گیا۔ اسکی نظروں کے سحر میں کئی باتیں جو پہلے میرے دماغ میں نا آسکیں اب وہ سانپ بن کر کلبلا رہی تھیں۔

شروع کے دنوں میں ہمارے درمیان دو گھروں کا فاصلہ ہونے کے باوجود ہم با آسانی بات کر لیتے۔ اس کا ہمیشہ ایک ہی لباس میں ملبوس رہنا۔ میرے اس کے گھر جانے کا کہنے پر سیخ پا ہو جانا۔ یہ ایسے سوال تھے جو میرے سامنے تھے مگر میں کبھی ان پر غور نہ کر پایا۔ اور اب ایک اور سوال جو میرے من میں کلبلا رہا تھا کہ، آخر وہ پوری دنیا میں مجھے ہی کیوں دکھائی دی۔ شاید ہم دونوں ہی وقت کی ستم ظریفی کا شکار تھے۔ ہم دونوں نے ہی اپنی عزیز ترین ہستیوں کو کھویا تھا۔ ہاں وہ سانجھا دکھ ہی تھا جس نے دو ہستیوں کو، دو الگ الگ دنیاؤں کی دو ہستیوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ میں انہیں سوالوں میں گم تھا جب مجھے لگا کوئی سایہ سا کھڑکی سے گزرا ہو۔ میں نے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اچانک لگا جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑا ہو ڈر کے مارے مڑ کر دیکھا تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ میرا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

دالان کی طرف سے مجھے اسکے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ میں ڈرتے ڈرتے اس طرف بڑھا کہ اچانک دالان کی بجائے اوپری کمرے کے دروازے میں ایک سایہ سا کھڑا دکھائی دیا۔

"ک ک کون؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

جواب میں محض سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ "نورین" سسکیاں بڑھنے لگی۔ عجیب پر اسرار سا ماحول وہاں بن گیا۔ اندھیری رات میں ایک سایہ وہاں موجود تھا میں نیچے اندھیرے میں اس طرف دیکھے جا رہا تھا اور چاروں جانب سسکیاں گونج رہی تھیں۔ اس کی حقیقت جان لینے کے بعد ایک خوف میرے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس نے میری کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز گھنٹہ بھر آتی رہی اور پھر وہ ایک جھونکے کی مانند میرے وجود سے ٹکراتے ہوئے نکل گئی اور میں جو کہ اب تک وہاں بت بنا کھڑا تھا دھڑام سے قریبی صوفے پر گر گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح دفتر جانے کیلیے نکلا تو گھر میں اسکی مہک ابھی تک موجود تھی جس سے ایک خوف کی جھرجھری سی آ گئی۔ دفتر کے باہر فقیر بابا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ "بابا، بابا، میری مدد کرو بابا۔"

میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ کہتے ہوئے میں اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میرے ہلانے پر اس نے نظریں اٹھائیں اور ایسی خالی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے وہ مجھے جانتا ہی نہ ہو۔ میرے لاکھ بلانے پر بھی اس نے دوبارہ مجھے نہ سنا، میں بوجھل قدموں سے دفتر کو چل دیا۔

آج گھر جانے کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ لیکن جاتا بھی تو کہاں جاتا۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں قدم رکھا۔ اسکی مہک بھی اب فضا سے معدوم ہو چکی تھی۔ کھانا کھا کر کسی طرح خود کو سونے کیلیے آمادہ کیا اور خوف کے باوجود کسی طرح سو

گیا۔ آدھی رات کا وقت ہوگا جب اس کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میری آنکھ کھل گئی۔

وہ میری جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کے لمبے بال لہرا رہے تھے جب کہ وہاں ہوا کا نام و نشان نہ تھا۔ فضا کل کی طرح سسکیوں سے گونج رہی تھی۔ عجیب سوز تھا عجیب آہ و زاری تھی جو مجھے مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔

"نورین تم یہاں"، میں بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

اس نے مڑ کر نہ دیکھا لیکن اس کی سسکیوں کی گونج میں اضافہ ہوتا گیا حتی کہ مجھے لگا میرے کانوں کے پردے پھٹ جائینگے۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں میچ لیں۔ کچھ دیر بعد ہاتھ ہٹائے اور آنکھیں کھولیں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میں خوف کے مارے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ کھڑکی کی جانب سے ایک ورق دائیں بائیں جھومتا ہوا آیا۔ اندھیرے کے باوجود وہ اپنے ساتھ عجیب سی روشنی لا رہا تھا۔ پھر وہ زمین پر گرا اور ہر طرف گہرا اندھیرا ہو گیا۔ میں ہمت کر کے اٹھا کمرے کی بتی جلائی اور اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"میں نے کسی کو بہت چاہا، لیکن اسے مجھ سے دور کیا گیا، میں اس وقت مجبور تھی سمیر، رواجوں میں جکڑی ہوئی ایک بے بس کمزور لڑکی۔ سماج کے آگے سر جھکا لیا لیکن اپنی آرزوؤں کو نہ دبا سکی۔

لیکن اب، اب میں کمزور نہیں ہوں، اور کوئی بندش بھی نہیں، اب میں ہار نہیں سکتی سمیر تمہیں اب میرا ہونا ہوگا۔ اور اس کیلیے تمہیں اپنی زندگی کی قربانی دینی ہوگی۔ لیکن فکر نہ کرو ہم ہمیشہ کیلیے ایسی دنیا میں ایک ہو جائینگے جہاں بہت سکون ہوگا"۔

میرا حلق سوکھنے لگا، ورق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ قارئین اس دن مجھ پر ایک چشم کشا لیکن تلخ حقیقت کا ادراک ہوا، ہم کسی کو کتنا بھی چاہیں کتنے بھی جینے مرنے کے عہد و پیماں کریں لیکن یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ ہمارے ایسے اکثر دعوے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں اور یہ عموما جذباتیت پر مبنی کھوکھلے دعوے ہوتے ہیں۔ مجھے کسی رسالے میں پڑھی وہ سطریں یاد آنے لگیں۔

"کچھ لوگوں کو کھو دینے کے بعد ہم سوچتے ہیں ہم مر کیوں نہیں گئے۔ لیکن پھر ہم جیتے چلے جاتے ہیں اور دنیا میں کھو جاتے ہیں"۔ مجھے بھی اس پل زندگی سے بے انتہا محبت محسوس ہوئی اور میرے جسم میں موت کے خوف سے سنسناہٹ ہونے لگی۔ نورین سے محبت پر میرے جینے کی خواہش غالب آنے لگی لیکن مجھے اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آتا۔ "فقیر بابا"

اچانک یہ نام میرے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا۔ کیونکہ صرف وہی ایک تھا جو نہ صرف اس معاملے کو مجھ سے پہلے ہی جانتا تھا بلکہ مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ بھی کرتا رہا۔

دن چڑھا تو میرا دفتر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن فقیر بابا کی آس میں تیار ہو کر دفتر چل دیا۔ دفتر کے باہر پہنچا تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کئی بار میں نے باہر آکر دیکھا تو لیکن اس کا دور دور تک کوئی نشاں نہ تھا۔ شاید قدرت بھی میری مدد کو آمادہ نہ تھی اور میرے دن ضرور گنے جا چکے تھے۔ میرا دل ڈوبتا چلا گیا۔ دفتر سے واپسی پر میں سوچا میں گھر جانے کی بجائے کامران کی طرف چلا جاؤں۔

کچھ ہی وقت کے بعد میں اس کے در پر تھا۔ دروازہ کھولتے ہی حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے میرا خیر مقدم کیا لیکن پھر اچانک چونکتے ہوئے بولا۔

"یار سمیر تمہیں کیا ہوا ہے؟ بیمار ہو کیا۔ یار کچھ بتایا تک نہیں اپنا چیک اپ وغیرہ کروایا"۔

"کچھ نہیں یار، بس کام کی تھکاوٹ ہے آج کل سوچا آج تجھے اور بھابھی کو تنگ کروں"۔ میں کشمکش میں تھا کہ اسے بتانا مناسب ہوگا یا نہیں۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے میری کیفیت کو دیکھتے ہوئے مجھے مہمان خانے میں سونے کیلیے بھیج دیا۔ رات خیریت سے گذری اور ابھی میں اطمینان کر ہی رہا تھا کہ بستر کے دائیں جانب پڑے اس پرچے پر نظر پڑی۔ "بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے سمیر، تم بھول گئے ہو میں اب حدوں کی قید میں نہیں۔ بہتر ہے ہم دونوں ایک

ساتھ اپنے گھر میں رہیں تا کہ تمہاری وجہ سے دوسروں پر
برا وقت نہ آئے"۔

یقیناً میرے پاس اب اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں دوسروں کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کی بجائے اپنے گھر میں اپنی آنے والی موت کا انتظار کروں۔ اسی ادھیڑ بن میں دفتر پہنچ گیا بجھے قدموں سے دفتر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ قہقہوں کی آواز نے قدم روک لیے۔ "ہاہاہاہا،

"مجھے ڈھونڈتا ہے، جب میں کہتا تھا تب سنتا نہیں تھا، اب مجھے ڈھونڈتا ہے۔"

مجھ پر یقین آ گیا، لیکن اس پر یقین نہیں کیا؟
جس کے ہاتھ میں ڈور ہے،
جا اسی کے پاس جا،
صرف وہی تیری مدد کر سکتا ہے جا چلا جا"
بابا اچانک نمودار ہوتے ہی گرجنے لگا۔
"بابا لیکن مجھے راستہ دکھاؤ"۔ میں گڑگڑایا۔
"سب رستے اسی کو جاتے ہیں کم عقل، چلنے کی کوشش تو کر، قدم تو آگے بڑھا۔

اتنا کہہ کر وہ ایک طرف چل دیا اور میں دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا۔ سب لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگے جو سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک اول جلول سے فقیر کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اگلے موڑ سے بابا دائیں مڑا تو میں بھی بھاگ کر اسی جانب لپکا لیکن دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ میری کیفیت بالکل ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی ماں کے چاروں بیٹے ایک ہی حادثے میں دنیا سے چلے گئے ہوں پھر وہاں لوگوں نے ایک سوٹڈ بوٹڈ سمجھدار دکھنے والے آدمی کو بیچ چوراہے پر گھٹنوں کے بل روتے دیکھا۔

جانے کب میں سنبھلا کب چپ ہوا، دفتر کا کیا ہوا، گھر کب آیا، میری دیوانگی پر بننے والے قصوں کا کیا ہوا، جیسے سب ایک فلم کی طرح گزر گیا۔

آنکھ کھلی تو پانچ بجے سہ پہر کا وقت تھا اور دور کہیں موذن اذان عصر دے رہا تھا۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر" "اللہ اکبر، اللہ اکبر"

اور جب موذن نے کہا، "حی الفلاح"
تو میرے دماغ میں بابا کے جملے گونجنے لگے۔
جا اسی کے پاس جا، صرف وہی تیری مدد کر سکتا ہے
جا چلا جا" "سب رستے اسی کو جاتے ہیں کم عقل، چلنے کی کوشش تو کر، قدم تو آگے بڑھا"

جب مسجد میں داخل ہونے لگا تو سر ندامت سے جھکا ہوا تھا، ندامت گناہوں سے زیادہ اپنی مطلب پرستی کی تھی، جب اس نے مجھے بھوکا رکھا میں اس سے مانگنے کی بجائے شکوہ کیا، جب اس نے مجھ سے میرے والدین لیے اس وقت بھی میں اسے خوب کوسا، اسے الزام دیا۔

لیکن جب اس نے مجھے نعمتیں دیں، کاروبار دیا، گھر دیا اسے میں نے اپنی قابلیت جانا یہ کبھی نہ سوچا کے جو لیتا تھا دیا بھی تو اسی نے۔ اور آج میں زندگی کی بھیک لینے اسکے در پر کھڑا تھا۔ میرا قدم اس کی نرم آغوش کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ اپنا دکھ بانٹ کر میں ہلکا پھلکا ہو گیا، عجیب سکون کی کیفیت میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ باہر نکلا تو فقیر بابا کو گلی کے قدرے ویران حصے میں مست کھڑے پایا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا اور اس سے پہلے کے کچھ بولتا وہ خود گویا ہوا۔

" کرے گا، ہاں وہ تیری مدد کریگا،

مطلب سے گیا نا اس کے پاس، ضرورت سے گیا،
پر اسے تو بس مانگنے کی ادا پسند ہے، تو نے مانگا وہ دے گا، بلائے گا وہ تجھے، چلا جانا، وہ تیرے ساتھ ہوگا"

اتنا کہہ کر بابا ایک جانب چل دیا، اور میں اس بار اسکے پیچھے بھاگنے کی بجائے جانے کیوں وہیں رکا رہا، جیسے میرے من کو معلوم ہو کہ ہاں بابا اپنا کردار نبھا رہا ہے اب مجھے اپنا کردار نبھانا ہے۔ اور وہ کردار ہے، "توکل اللہ"۔

☆.....☆.....☆

رات کے تیسرے پہر اس کی خوشبو نے ایک دھوئیں کا گولا بن کر مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وہ خود کمرے کے اندھیرے کونے میں کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن میں جانے کیسے اس کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے کی سوگواری، بہتے آنسو، سفید جوڑا، بکھرے بال، وحشت

ناک آنکھیں، جیسے وہ مکمل روشنی میں مجھ سے دو ہاتھ کے فاصلے پر ہو۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"سمیر تم نے بہت غلط راستہ اختیار کر لیا ہے،

اس سے پہلے کہ ہمیں جدا ہونا پڑے، اب مجھے کچھ کرنا ہوگا، اور جلد کرنا ہوگا۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی، اس سے پہلے کے معاملہ میرے اختیار سے نکل جائے۔ چلو اٹھو"۔ اس کے لب نہ ہلے مگر ایک ایک لفظ میرے کانوں نے سن لیا، ایک خوف نے مجھے اپنی جگہ منجمد کر دیا، پسینے کے قطرے میری پیشانی اور جسم سے بہہ بہہ کر بستر کو بھگونے لگے، وہ مجھے بلا رہی تھی اور میں بس اسے خوف زدہ سہما سہما دیکھے جا رہا تھا۔ جبھی میرے اندر سے جیسے میرا عکس مجھے چھلنی کرتا ہوا نکلا اور بستر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی روح کو جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ یکلخت میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن دوسرے ہی پل روشنی ہو گئی لیکن اب میں خود کو بے بس بے جان لیٹا ہوا اپنی روح کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے کھینچ کر لے جا رہی تھی اور میں اپنی تمام تر قوت صرف کر کے بھی خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔

نورین ہوا میں معلق میرے آگے اڑنے لگی اور میں کسی نظر نہ آنے والی ڈور کے سہارے اسکے ساتھ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ مجھے لیے وہ گھر سے نکلی، گلی ویران پڑی تھی جیسے تمام علاقے کو سانپ سونگھ گیا ہو یا کسی آسیب نے سب کو سلا دیا ہو۔ عجیب وحشت کا عالم تھا۔ اس کا رخ شہر کے باہر کی طرف ہوا تو مجھے لگا شاید میرے رب کی یہی مرضی ہے، شاید میرے گناہوں کی یہی سزا ہے، کہ مجھے کلمہ تک نصیب نہ ہوا، دعائیں رد ہونے کے احساس نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔ لیکن دعائیں جو دل سے مانگی جائیں رد نہیں ہوتیں۔ اس اندھیری رات میں ویران جگہ پر ایک بکھرے بالوں والا شخص لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اسکی آنکھوں میں جلال عروج پر تھا۔ ہاں ہاں، اس نے میری مدد کو میرے مسیحا کو بھیج دیا تھا۔ نورین ٹھٹھک کر رک گئی اور میں بھی اور دل سے ایک ہی آواز نکلی۔ "فقیر بابا"

نورین کبھی دائیں کبھی بائیں سے نکلنے کی کوشش کرتی لیکن جانے اپنی جگہ خاموش کھڑا فقیر بابا ایسی کیا کرامت رکھتا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتی کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا جاتی۔ "تجھے کسی کی زندگی لینے کا اختیار کس نے دیا، تیری زندگی اچھی تھی یا بری، تو نے جی لیا،

چل جا چلی جا اپنی دنیا میں" فقیر بابا نے اسے حکم دیا۔ نورین پھر خوفناک انداز میں سسکنے لگی۔ وہ بھیک مانگنے کے انداز میں بولی۔ "مجھے زندگی میں کچھ نہ ملا، اب میں خالی ہاتھ نہیں جاؤنگی" وہ بے بس ہوتے ہوئے بھی اپنی ضد پر اڑی تھی۔

"تو ہوتی کون ہے اس کے کاموں میں دخل دینے والی، جا چلی جا" بابا کی جلالی آواز جیسے پورے علاقے میں گونج اٹھی۔ "دنیا جیسی گئی سو گئی، اب آخرت کو چل، جا اپنے ٹھکانے پر چلی جا، مہلت دے رہا ہوں تجھے"

دو انجانی ماورائی طاقتوں کے مابین یہ رسہ کشی کا منظر مجھے دہلائے دے رہا تھا۔ جبھی نورین جھنجھلاتے ہوئے بابا کی طرف بڑھی جسکی وجہ سے بابا کو وہ فیصلہ کرنا پڑا جس نے مجھے بھی کانپنے پر مجبور کر دیا۔ بابا نے اپنی لاٹھی سامنے کی طرف اور منہ میں جانے کیا ورد کرنے لگا تو نورین کی روح چھلنی ہونے لگی۔ تکلیف کی شدت سے اسکی چیخیں چاروں طرف گونجنے لگیں۔ اور وہ جو زندہ ہوتے ہوئے بھی کرچی کرچی ہوئی، آج اسکی روح بھی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے ذرے ہوا میں معلق ہو کر غائب ہو گئے لیکن اسکی چیخیں دیر تک مجھے سنائی دیتی رہیں۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہاں میں صرف اکیلا ہوں، بابا نہ جانے کب وہاں سے چلا گیا تھا۔ اور پھر میرے حواس بوجھل ہوتے ہوتے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ صبح اذان کی آواز سے آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھا۔ رات کا منظر مجھے ہو بہو یاد تھا، میں جلدی سے اٹھ کر وضو کیا اور مسجد کی جانب چل دیا۔ "آج میرا سجدہ کسی مفاد کی وجہ سے نہ تھا، آج میں بندگی و عاجزی سے بھرپور وہ پہلا سجدہ کرنے نکلا اور میرے قدم اللہ کی جانب اٹھنے لگے۔

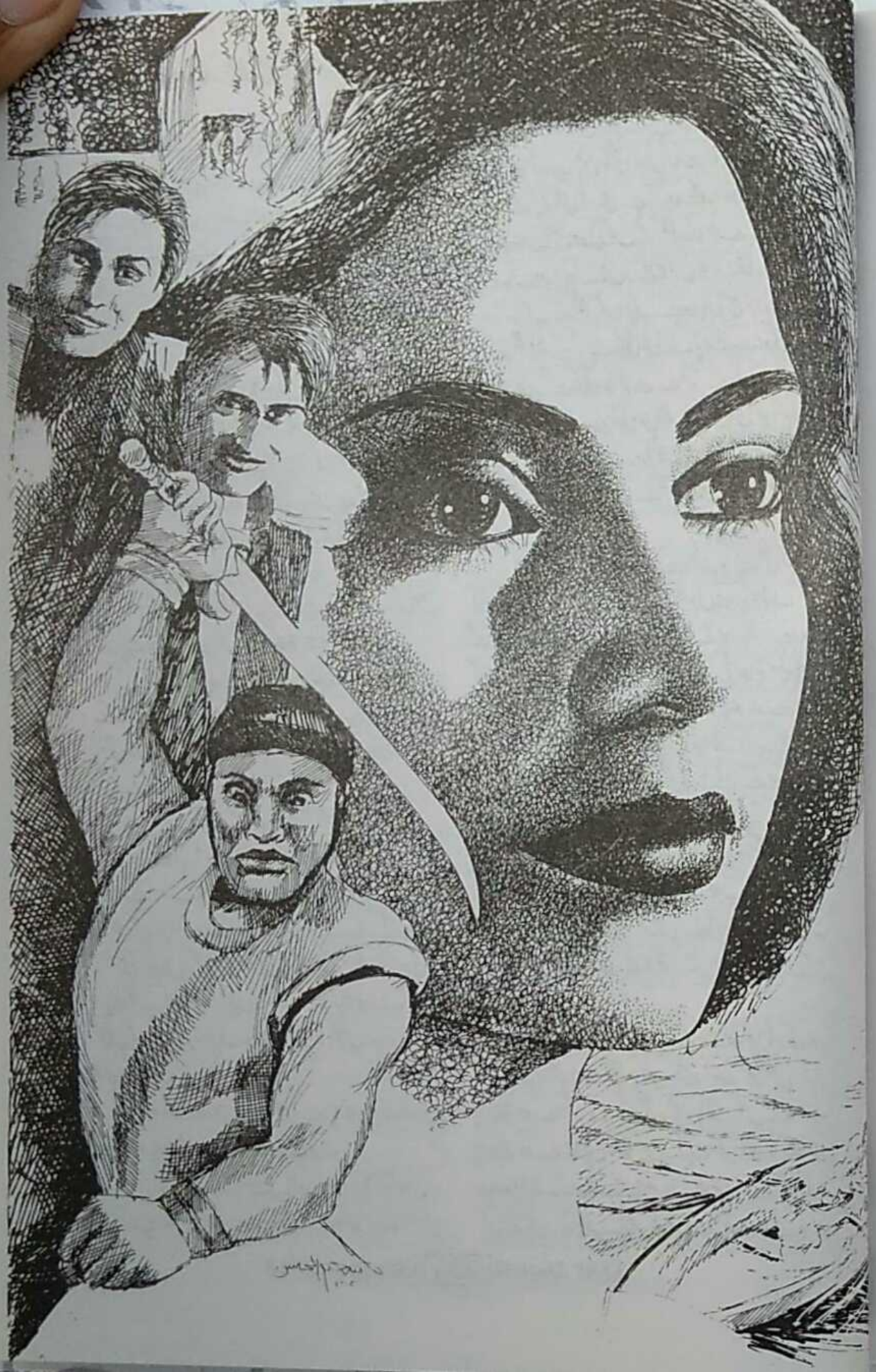

برفانی چڑیل

شہزادہ چاندزیب عباسی

دیدہ زیب لڑکی کی آواز سنائی دی، مادہ ریچھ ایک درندہ ہے مگر کم ظرف انسان سے کہیں بہتر ہے جس نے ایک معمولی احسان کے بدلے ایک بچی کو پال پوس کر بڑا کیا.....

ایک چڑیل کی.....خوفناک دیدہ دلیری جو پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

اس روز میں ایک دوست کی پارٹی میں شریک تھا۔ پارٹی کا اختتام رات کے دس بجے کے قریب ہوا۔ ابھی میں راستے میں ہی تھا کہ موسم کے تیور اچانک بدل گئے۔ بادل خوب گرج کر برس رہے تھے۔ بارش اس قدر شدید تھی کہ میں لمحوں میں بھیگ گیا۔

شومئی قسمت کہ بائیک بھی چلتے چلتے جھٹکا کھا کر رک گئی۔ فیول بھی کم نہ تھا اور بظاہر بائیک میں بھی کوئی خرابی نہ تھی کہ ابھی حال ہی میں تو میں نے یہ اسپورٹس بائیک لی تھی۔ کچھ دیر اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ناکامی پر بائیک گھسیٹتے ہوئے پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ جہاں بارش کے رکنے تک پناہ لے کر مزید بھیگنے سے بچ سکوں کہ موسلا دھار طوفانی بارش کے ساتھ ساتھ سرد ہوائیں رگوں کو کاٹ رہی تھیں۔

رات کے اس پہر طوفانی بارش کے باعث سڑک پر اکا دکا گاڑیاں نظر آرہی تھیں اور میں اس ویران اور سنسان سڑک پر جائے پناہ کی تلاش میں بائیک گھسیٹتا چلا جارہا تھا۔ چلتے چلتے میری نگاہ سڑک کنارے موجود چند مکانوں پر پڑی۔ ان میں سے ایک مکان کے باہر ایک چھوٹا سا پارک موجود تھا۔ پارک میں محفوظ سائبان چھت کی صورت دیکھ کر بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر کے میں پارک میں داخل ہوا۔

پارک میں سیمنٹ کی بنچ پر اپسرائی حسن کی مالک ایک نوجوان دوشیزہ آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

تھکن کے باعث اب ویسے بھی کھڑے ہونے کی مجھ میں سکت نہ تھی۔ کھنکھار کر لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ گردوپیش سے بے خبر اسی طرح آنکھیں موندے بیٹھی رہی جیسے گہری نیند میں ہو۔

رات کے اس پہر اتنی شدید بارش میں گھر سے باہر اس سنسان پارک میں اس کی موجودگی اور پھر اس قدر گہری نیند مجھے حیرت میں مبتلا کررہی تھی۔ کچھ دیر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے کے بعد میں اس سے قدرے ہٹ کر اسی بنچ پر بیٹھ گیا کہ اب اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ اسرد ہواؤں کے باعث بدن کپکپانے لگا تھا۔ ویسے بھی رات کافی ہوچکی تھی۔ نیند سے پلکیں بوجھل ہورہی تھیں۔ نیند کو بھگانے کے لئے میں نے ایک دوبار سر جھٹکا۔ پھر بارش برساتے نیلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں بارش کے رکنے کے

دور دور تک آثار نہ تھے۔ بیٹھے بیٹھے اکتا کر میں بنچ سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

تبھی ایک مترنم نسوانی آواز ابھری۔ ”کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ بیدار ہو چکی تھی اور بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پارک میں نصب پیلے بلب کی مدھم روشنی میں میں اسے مبہوت دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی سحر انگیز نگاہوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میں نظریں نہ پھیر سکا۔

”نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس بار شوخ لہجے میں کہا گیا۔

”سوری۔“ میں نے نادم لہجے میں معذرت کی۔ ”دراصل بارش بہت تیز تھی۔ اور پھر بائیک میں نہ جانے کیا خرابی ہوئی کہ اچھی بھلی چلتے چلتے رک گئی اور میں مزید بھیگنے سے بچنے کے لئے اس پارک میں چلا آیا۔ آپ کو مخاطب بھی کیا۔ مگر شاید آپ گہری نیند میں تھیں۔“

وہ ایک ادا سے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولی۔

”اچھا تو پھر کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھیں ناں؟“

میں پہلے ہی کی طرح اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”آپ شاید میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ جو رات کے اس پہر گرجتی برستی بارش میں پارک میں اس طرح سے بے خبر سو رہی ہے۔“ اس نے گویا میری سوچ پڑھ لی تھی۔

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو۔“

وہ بولی۔ ”دراصل پارک کے ساتھ والا پہلا مکان ہمارا ہے۔ سب ہی سو رہے تھے مجھے نیند ویسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ بارش سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہاں آ بیٹھی، یہاں کچھ ایسا سکون ملا کہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی۔ ویسے آپ کرتے کیا ہیں۔ آپ نے اپنا تعارف بھی تو نہیں کروایا۔ خیر تعارف تو میں نے بھی نہیں کروایا۔ مجھے ثانیہ کہتے ہیں۔“

وہ مجھ سے اس بے تکلفی سے بات چیت کر رہی تھی کہ گویا ہماری برسوں کی جان پہچان ہو۔

”میں ادیب رضوی پہاڑوں پر کمند ڈالتا ہوں۔ یعنی کوہ پیما ہوں۔ بہن بھائی کوئی نہیں، والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور فی الحال اس دنیا فانی میں اکیلا ہوں۔“ میں نے مختصر الفاظ میں اپنا تفصیلی تعارف کر ڈالا۔ ہمارے بیچ کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران بارش تھم چکی تھی۔ ”اچھا تو اب میں چلتی ہوں رات بھی کافی ہو چکی ہے اور مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔“ وہ مجھے الوداع کہہ کر خراماں خراماں چلتی ہوئی گھر کے کھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔ اب میرا پارک میں رکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

پارک سے نکل کر بائیک سے دوبارہ طبع آزمائی کی تو حیرت انگیز طور پر بائیک پہلی ہی کک پر اسٹارٹ ہو گئی۔

ثانیہ سے پہلی ملاقات نے میرے دل پر انمٹ نقش چھوڑے تھے۔ وہ پہلی ہی نظر میں دل کی گہرائیوں میں جا بسی تھی۔ میں ایک رومانٹک گیت گنگناتا ہوا گھر پہنچا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی ثانیہ کے تصور میں کھوئے کھوئے سو گیا۔

اگلے روز میں کافی دیر سے اٹھا۔ ویسے بھی تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہوئے یہ میرا معمول بن چکا تھا۔ اکثر مجھے سوتے سوتے رات کے دو بج جاتے اور دوسرے روز گیارہ بارہ بجے بمشکل اٹھتا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا تو سلیمان ناشتہ لا چکا تھا۔ اٹھارہ سالہ سلیمان گزشتہ چند ماہ سے میرا ملازم تھا۔ وہ بھی دنیا میں میری طرح تنہا تھا۔ اس لئے اس کی رہائش بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ ناشتے کے بعد میں وقت گزاری کے لئے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔

ایک چینل پر اس وقت میری پسندیدہ انگلش مووی لگی ہوئی تھی۔ مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ ثانیہ بار بار میرے تصور میں آتی رہی۔ تنگ آ کر میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ اب میرا ارادہ ثانیہ سے ملنے کا تھا۔ میں اسے حال دل کہنا چاہتا تھا۔

بائیک میں نے پارک کے سامنے کھڑی کی اور پارک میں داخل ہوا۔ بنچ پر اس وقت ایک معمر شخص اخبار پڑھتے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے اخبار پڑھتے ہوئے نگاہیں اٹھائیں۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور دوبارہ اخبار کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اسے نظر انداز کر کے میں نے ثانیہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ جہاں گیٹ

پر لگا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ ”سر یہ کہاں گئے ہیں؟“ کچھ دیر بعد میں نے ہمت کر کے اس معمر شخص کو مخاطب کیا۔

”کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو برخوردار۔“ اس نے اخبار سے نگاہیں ہٹا کر میری طرف دیکھا تو میں نے ثانیہ کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں کوئی نہیں رہتا۔“ اس نے خشک لہجے میں جواب دیا اور دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”مگر کل ہی تو میں ثانیہ سے اس پارک میں ملا تھا، وہ میری نگاہوں کے سامنے اس مکان میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

تو اس نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے میری ذہنی کیفیت پر شبہ ہو۔ ”خبردار یہ گھر برسوں سے خالی ہے اور دروازے پر برسوں سے تالا ہے اور تم کہہ رہے ہو تم ثانیہ سے ملے تھے اور وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے اس مکان میں داخل ہوئی تھی۔ ویسے یہ ثانیہ ہے کون؟ اس مکان میں تو کیا اس پورے محلے میں ثانیہ نام کی کوئی لڑکی نہیں رہی۔“ اس نے قدرے ناگوار لہجے میں جواب دیا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

عجیب بے مروت شخص تھا۔ اس کے رویے کی وجہ سے مزید اس سے کچھ پوچھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ مگر اس کی باتوں سے میں ذہنی طور پر الجھ چکا تھا۔ کل میں اسی پارک میں ثانیہ سے مل چکا تھا۔ اور وہ میرے سامنے اسی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اور بوڑھا کہہ رہا تھا کہ اس مکان میں برسوں سے تالا ہے۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں وہاں سے روانہ ہوا، میں ذہنی طور پر اس قدر الجھا ہوا تھا کہ ایک موڑ مڑتے ہوئے سامنے سے اچانک نمودار ہونے والی ہنڈا اکارڈ کو نہ دیکھ سکا۔ سڑک بریکوں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھی۔ بالکل آخری لمحات میں اس تصادم سے خود کو بچانے کی کوشش کے باوجود بائیک ہنڈا اکارڈ سے ٹکرائی۔ اور میں بائیک سمیت ارٹا ہوا سا نیچے گرا اور ہوش و خرد سے محروم ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو خود کو نرم و گداز بیڈ پر پڑے ہوئے پایا۔ LED پر کوئی انگلش مووی چل رہی تھی۔ سامنے بیٹھی خوب صورت خدوخال کی مالک لڑکی انہماک سے فلم دیکھ رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے اپنی نگاہیں TV اسکرین سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ ”شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔“

”میں کہاں ہوں؟“ میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔

”اب یہ مت کہنا کہ میں کون ہوں؟ میں کہاں ہوں۔ جیسے فلموں میں ہیرو چوٹ لگنے سے بے ہوش ہوتا ہے اور ہوش میں آتے ہی یہی ڈائیلاگ دھرتا ہے۔ تم اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئے تھے۔ اس وقت تم بے ہوش تھے۔ میں تمہیں اسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ مگر ڈرائیور انکل کا کہنا تھا کہ تمہیں کوئی خطرناک چوٹ نہیں لگی۔ اسپتال لے جانے سے پولیس کی تفتیش شروع ہو جائے گی اور ڈرائیور انکل کو ڈیڈی کی ڈانٹ سننا پڑے گی۔ اس لئے میں تمہیں اپنے گھر لے آئی۔ فیملی ڈاکٹر نے بھی یہی کہا کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہیں لگی صرف سڑک پر گرنے سے سر پر چوٹ لگی تھی جو خطرناک نہیں تھی۔ انہوں نے تمہارے سر کی بینڈیج کی اور انجکشن لگا کر کہا کہ تمہیں جلد ہوش آ جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔“

”میں آپ کی اس ہمدردی کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔“ میں اس کا شکریہ ادا کر کے جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ اس نے صوفے سے اٹھ کر میرا دایاں ہاتھ تھاما۔

”ارے بھئی اب ایسی بھی کیا بے مروتی، خالی خولی شکریہ پر ٹرخا کر جا رہے ہو۔“

بیٹھو وہ میرا ہاتھ تھامے صوفے کے قریب آئی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

”میرا نام صوفیہ ہے۔ اب تم اپنا تعارف کرواؤ۔ کیا مشاغل ہیں تمہارے۔“ وہ خاصی بے تکلفی سے مجھ سے مخاطب تھی اور پہلی ہی ملاقات میں تو تڑاک پر اتر آئی تھی۔

”ادیب میں کوہ پیما ہوں۔ مگر یہ میرا پیشہ نہیں شوق ہے۔“

”ویسے آپ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔“

"ارے نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "ہم تین افراد ہیں۔ مجھ سے سال بھر بڑے بھائی طارق، ڈیڈی اور میں، مما کی پچھلے سال ڈیتھ ہوچکی ہے۔ ویسے میرے ڈیڈی بھی ماضی میں کوہ پیمائی کے پیشے سے منسلک رہ چکے ہیں۔ انہوں نے دنیا کی بہت سی خطرناک چوٹیاں سر کی تھیں۔ پھر برسوں پہلے ایک حادثے کی وجہ سے وہ کوہ پیمائی کے پیشے سے دست بردار ہوگئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس حادثے میں ان کا دوست اور چند دیگر ساتھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ صرف ڈیڈی ہی زندہ بچے تھے۔"

باتوں کے دوران وہ کرید کرید کر مجھ سے میری نجی زندگی کے بارے میں سوالات کرتی رہی۔ اس کے انداز اور باتوں سے اتنا تو میں اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ بلاشبہ وہ خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی، لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک تھی۔ مگر میں تو پہلے ہی کسی کو دل دے بیٹھا تھا۔ ہاں اگر میں ثانیہ سے پہلے نہ مل چکا ہوتا تو شاید میں بھی اسے پسند کرلیتا۔ میں نے ایک بار پھر اٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ چہک کر بولی۔ "ایک شرط پر جانے کی اجازت دوں گی۔ پہلے تمہیں میرے ساتھ لنچ کرنا ہوگا۔ ویسے بھی کھانے کا وقت ہوچلا ہے۔" اس نے ایک طرف رکھا بلیک بیری اٹھایا اور غالباً کسی ملازم کو کھانا لگانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

اجازت ملنے پر ایک باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ اور مودبانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بی بی جی کھانا تیار ہے۔" صوفیہ کے ہمراہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ سامنے کی دیوار پر آویزاں بڑے سے فریم میں موجود تصویر پر پڑی۔ تو میں ششدر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ ثانیہ کی ہی تصویر تھی۔ اس کے بائیں طرف ایک چار پانچ سالہ بچی کھڑی تھی جب کہ دائیں طرف ایک گھنی مونچھوں والا ہینڈسم نوجوان مسکرا رہا تھا۔ میری اس تصویر میں دلچسپی بھانپ کر وہ بولی۔ "ایسی کیا خاص بات ہے اس تصویر میں جو اس قدر غور سے اسے دیکھ رہے ہو۔"

"ثانیہ کی تصویر تمہارے گھر میں کیسے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کون ثانیہ؟" اس نے تحیر زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "یہ لڑکی! اس سے میں پچھلے روز مل چکا ہوں۔"

"کیا؟" وہ حیرت زدہ لہجے میں جیسے چلائی۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ ڈیڈی کے دوست اور ان کی فیملی کی تصویر ہے جو برسوں پہلے اپنی فیملی سمیت ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ جسے تم ثانیہ کہہ رہے ہو یہ ان کی بیوی ہے۔"

اس کی بات سنتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں خود ثانیہ سے مل چکا ہوں۔" میری آواز گویا جیسے گلے میں پھنس رہی تھی۔ قدموں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔

میں بمشکل ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا۔ صوفیہ خود میری اس بدلتی کیفیت سے پریشان سی ہوگئی تھی۔ میں نے بمشکل چند نوالے ہی کھائے اور صوفیہ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر اس نے آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجھے میرے گھر اپنی گاڑی میں چھوڑنے آئی۔ میری ذہنی کیفیت اتنی منتشر تھی کہ میں نے اسے رسماً بھی اندر آنے کو نہیں کہا۔ اور دروازے سے ہی خدا حافظ کہہ کر گھر میں داخل ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

میرے ذہن میں اس وقت ان گنت سوچوں کی یلغار تھی۔ صوفیہ کا کہنا تھا کہ "ثانیہ برسوں پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوچکی تھی۔ وہ ایک شادی شدہ عورت اور بچے کی ماں بھی تھی۔" مگر میرا ذہن اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں بذات خود نہ صرف ثانیہ سے مل چکا تھا بلکہ اس سے کافی دیر باتیں بھی کی تھیں۔ کہیں سے بھی تو نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جیتا جاگتا وجود نہیں اور اگر صوفیہ کی بات سچ تھی تو وہ چند گھنٹے میں نے ایک روح کی سنگت میں گزارے تھے۔ میں اسی طرح بستر پر لیٹا سوچتا رہا۔ دن سے رات ہوگئی اسی دوران سلیمان نے دو تین بار کھانے اور چائے کا پوچھا بھی مگر میں نے انکار کردیا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے نہ جانے کس وقت آنکھ لگی۔

صبح جاگا تو بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ بخار کی شدت سے میں مدہوش سا ہو رہا تھا۔ نہ جانے کس وقت سلیمان نے صوفیہ کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے صوفیہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور پھر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ اسٹینڈ پر لٹکی ڈرپ کے ذریعے قطرہ قطرہ محلول میری رگوں میں سرایت کر رہا تھا۔ قریب ہی نرس اور ڈاکٹر موجود تھے جب کہ صوفیہ میرے سرہانے اداس سی صورت لئے موجود تھی۔ "ہیلو ینگ مین کیسے ہو؟" مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر آگے بڑھا اور میرا معائنہ کرنے لگا۔ "تھینکس گارڈ کہ اب تمہارا بخار بہت کم ہے۔ جس وقت مس صوفیہ تمہیں یہاں لائیں۔ تمہارا بخار 103 سے اوپر جا رہا تھا۔ اگر یہ تمہیں بروقت اسپتال نہ لاتیں تو شاید" ڈاکٹر نے الفاظ ادھورے چھوڑے۔

میری نگاہیں صوفیہ کی طرف اٹھیں اور وہ مسکرا اٹھی۔ ڈاکٹر میرا معائنہ کرکے نرس سمیت جاچکا تھا۔ "کیا ماجرا ہے تم جب بھی مجھ سے ملتے ہو بے ہوش ہوجاتے ہو۔" صوفیہ نے شوخ لہجے میں کہا تو میں ہنس پڑا۔ وہ آگے بڑھی اپنے نرم و گداز ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے اس روز اس تعویز کو دیکھ کر تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔ اور تم ڈیڈی کے دوست کی بیوی کو ثانیہ کہہ کر پکار رہے تھے۔" صوفیہ دور جدید کی ماڈرن لڑکی تھی۔ مگر اس کے لہجے میں خاص قسم کی اپنائیت تھی اور پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں بار اس نے خلوص دل سے میری مدد کی تھی۔ میں نے اس سے کچھ چھپانا بہتر نہ سمجھا اور بتایا کہ کس طرح میری اور ثانیہ کی پارک میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور میں اسے دل دے بیٹھا تھا۔

وہ دم بخود ہنستی رہی پھر کہنے لگی۔ "تمہاری طبیعت سنبھل جائے پھر جہاں وہ لڑکی تم سے ملی تھی وہاں جائیں گے اور کسی پڑوسی سے اس بارے میں پوچھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ حقیقت سامنے آ ہی جائے گی۔"

میری طبیعت سنبھل چکی تھی اسی روز مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ صوفیہ نے اپنی گاڑی پر مجھے میرے گھر ڈراپ کیا اور سلیمان کو میرا خیال رکھنے کی تاکید کی اور صبح آنے کا کہہ کر گھر چلی گئی۔

سلیمان نے مجھے ہلکی غذا کھلانے کے بعد دوا پلائی اور میری ہدایت پر اے سی آن کرکے مجھے کمبل اوڑھایا اور کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ شاید کوئی خواب آور دوا تھی۔ مجھے نیند آ رہی تھی۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بلاشبہ وہ اپسرا ثانیہ ہی تھی۔ جو مورنی کی سی چال چلتی ہوئی میرے بستر کے قریب آئی اور پوچھا۔ "کیسے ہو؟"

میں نے خفگی سے نگاہیں پھیر لیں۔ "ناراض ہو۔" اس بار اس نے افسردہ لہجے میں کہا تو میں تڑپ گیا۔ "تم سے ناراض کیسے ہوسکتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پہلی ہی نظر میں تمہیں دیکھتے ہی دل دے بیٹھا تھا اور دوسرے روز تم سے ملنے گیا تھا مگر تمہارے گھر کے دروازے پر تالا تھا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے شکوہ کناں لہجے میں استفسار کیا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "دور یہاں سے بہت دور برف پوش پہاڑوں کی وادی میں تم سے وہیں ملوں گی۔" اس نے کہا اور مڑ کر دروازے کی طرف چل دی۔

"ثانیہ رکو۔" میں نے اسے پکارا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر مجھے ایک نظر دیکھا اور چلی گئی۔ "ثانیہ رکو۔" میں چلایا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اٹھ کر لائٹ آن کی تو حیرت سے اچھل پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جب کہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ سلیمان نے میرے کہنے پر باہر جانے سے پہلے دروازہ لاک کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے میں نے خواب نہیں دیکھا کمرے میں ثانیہ آئی تھی۔ "کیا واقعی وہ جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ روح تھی۔" کیوں کہ اس طرح ایک روح ہی کمرے میں آ اور جا سکتی ہے۔ میں نے سوچا اور ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر سرایت کرگئی۔ یہ تصور ہی

ہولناک تھا کہ "میں ایک روح سے عشق کرنے لگا ہوں۔" مگر اس دل کا کیا کرتا جو جانتے بوجھتے ہوئے بھی ثانیہ ثانیہ کی گردان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ "ثانیہ کوئی روح یا بھوت نہیں جیتا جاگتا انسان ہے۔"

مگر اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ یہاں سے بہت دور برف پوش پہاڑوں میں رہتی ہے۔

میں جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا انہی سوچوں میں دوبارہ نیند کی دیوی مہربان ہوگئی۔ صبح ناشتہ کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ صوفیہ آن دھمکی۔ "چلو اٹھو ادیب صاحب تیار ہو جاؤ۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے استفسار کیا۔

"ارے بھئی اس روح کے بارے میں معلومات کرنی ہیں جس کے تم عشق میں مبتلا ہو۔" اس کے لہجے میں شرارت پنہاں تھی۔ "اور پھر میں نے ڈیڈی سے بھی تمہارا ذکر کیا تھا اور تصویر والی بات انہیں بتائی تو انہوں نے تم سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شام کے وقت تم ان سے بھی مل لینا وہ خود ہی تمہیں بتائیں گے کہ برسوں پہلے ان کے دوست کی فیملی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔"

میرا تو گھر سے نکلنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر صوفیہ کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلی۔ "اب بتاؤ کہاں جانا ہے۔" میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے پوچھا اور ایڈریس بتانے پر گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھا دی۔

ثانیہ کے گھر کے دروازے پر بدستور تالا تھا۔ صوفیہ نے قریبی گھر کی بیل بجا دی۔ کچھ دیر بعد دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے کھولا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ "آنٹی دراصل ہم آپ کے پڑوس والے گھر پر آئے تھے مگر وہاں تو تالا ہے۔" صوفیہ نے سلام کرتے ہی مدعا بیان کر ڈالا۔

خاتون خانہ نے حیرت زدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ "بیٹا ہم پچھلے دس برس سے یہاں رہتے ہیں تب سے ہی اس مکان کے دروازے پر تالا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ یہاں میاں بیوی اور ایک پانچ سالہ بچی پر مشتمل فیملی رہتی تھی۔ جو برسوں پہلے کسی پہاڑی علاقے میں سیر و تفریح کی غرض سے گئے اور کسی حادثے میں ان کی موت ہوگئی۔" خاتون کی بات سنتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ گویا ثانیہ واقعی "روح" تھی۔

صوفیہ نے مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اب وہاں مزید رکنا فضول تھا۔ ہم اس خاتون کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہوئے۔ "کہاں جا رہی ہو۔" میں نے گاڑی کو اپنے گھر کے بجائے دوسرے راستے پر جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہیں اغوا کرنے کا ارادہ ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ کچھ دیر بعد ہم ساحل سمندر کے ایک سنسان گوشے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ صوفیہ بصد اصرار ساحل پر مجھے کافی آگے تک لے آئی تھی۔

ہم ساحل پر جس جگہ موجود تھے وہاں سمندر کی لہریں بار بار ہمیں بھگو رہی تھیں۔ اس سے واقعی مجھے بہت سکون ملا۔ کچھ دیر کے لئے پریشان کن خیالات سے نجات ملی۔

"ادیب میں تمہاری زندگی کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔" صوفیہ نے میرا دایاں ہاتھ تھام کر بالکل اچانک ہی کہا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ اگرچہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ مگر اس طرح اچانک اظہار محبت غیر متوقع تھا۔

"صوفیہ تم بہت اچھی ہو۔ یقیناً لاکھوں میں ایک ہو، صوفیہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اس بار میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں۔"

وہ قدرے تند لہجے میں بولی۔ "اگر ثانیہ کا حقیقت میں کوئی وجود ہوتا تو میں خود اس کے راستے سے ہٹ جاتی۔ مگر ایک زندہ انسان اور روح کا ملاپ ناممکن ہے اور سراب کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ثانیہ ایک سراب ہے۔ اسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ اور حقیقت کی دنیا میں رہو۔ میں تمہیں اپنی زندگی سے بڑھ کر پیار کرتی ہوں۔"

اسی وقت ایک سرکش لہر تیزی سے آئی۔ یہ لہر اتنی اونچی تھی کہ ہم بھیگنے کے ساتھ ساتھ ساحل پر گر گئے۔

صوفیہ جو کہ میرے قریب ہی کھڑی تھی گرتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے خود سے اس طرح لپٹنے سے میں حواس باختہ ہوگیا۔ اس کے آنچ دیتے گداز جسم کے لمس سے میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ "یہ کیا حرکت ہے چھوڑو مجھے۔" میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خاموش رہو چپ چاپ لیٹے رہو۔" اس نے سرگوشی کی اور میرے اوپر لیٹ گئی۔ اسے خود سے الگ کرنے کی میری تمام تر کوششیں ناکام رہیں۔ ایک تو اس نے میرے گرد اپنی مرمریں بانہوں کا شکنجہ کس رکھا تھا۔ اور پھر اس کی گستاخانہ شرارتوں نے میری اپنی حالت بھی غیر کر دی تھی۔ میرے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے اس نے اپنے جلتے بجھتے ہونٹ میرے لبوں میں پیوست کر دیئے۔ تو مجھے بھی خود پر اختیار نہ رہا، میں نے اسے بھینچتے ہوئے کروٹ بدلی تو اس کی جھیل جیسی آنکھیں رفتہ رفتہ بوجھل ہونے لگیں۔ اس پر خود سپردگی کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی مجنونانہ حرکتوں اور جسمانی نشیب و فراز کے لمس نے مجھے بھی پاگل کر دیا تھا۔ میں نے اپنی بانہوں کا شکنجہ مزید کسا تو اس کے منہ سے بے اختیار سسکاری نکلی اور اس سے پہلے کہ میں حد سے تجاوز کرتا میری سماعت سے ثانیہ کی آواز گونجی۔

"اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔" اس کی آواز سنتے ہی جیسے میں اپنے حواس میں آ گیا۔ اور صوفیہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور چلایا۔ "میں تمہیں بھولا نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ کہاں ہو تم؟" میں نے ثانیہ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں مگر وہ وہاں ہوتی تو ملتی۔ اس ساحل پر سوائے میرے اور صوفیہ کے دوسرا کوئی ذی نفس نہیں تھا۔

ادھر صوفیہ حیرت اور تاسف کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس سے بے پرواہ ایک بار پھر چلایا۔ "ثانیہ کہاں ہو تم؟"

"یہیں تمہارے دل و دماغ میں۔" ایک بار پھر ثانیہ کی آواز گونجی۔ بلاشبہ یہ میرا وہم نہیں حقیقت تھی، ثانیہ کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی، میں صوفیہ کی طرف مڑا۔

"تم سن رہی ہو ناں ثانیہ کی آواز وہ یہیں کہیں ہے۔" پھر صوفیہ نے تاسف بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ "مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔"

"ثانیہ کہاں ہو تم؟" میں ایک بار پھر دیوانوں کی طرح چلایا۔

"یہاں سے بہت دور بہت دور برف پوش پہاڑوں میں۔" وہی آواز ایک بار پھر گونجی۔ "سنا تم نے ثانیہ نے کیا کہا۔" میں نے ایک بار پھر صوفیہ کی طرف دیکھا۔

"ادیب ہوش میں آؤ۔" صوفیہ نے مجھے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ تو میری اضطراری کیفیت میں تبدیلی آئی۔ "کیا ثانیہ کی آواز واقعی میرا وہم تھا۔" میں نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

"چلو گھر چلتے ہیں تمہیں پاپا سے ملواؤں گی۔ وہ آ گئے ہوں گے شاید ان سے سچائی جان کر تمہاری ذہنی حالت میں بہتری آئے۔" اس نے مجھے بازو سے تھام کر آہستگی سے کہا۔

واپسی کا سفر ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ شہر کے پوش علاقے میں واقع اس کا کوٹھی نما گھر اپنی مثال آپ تھا۔ سوئمنگ پول، جم، ٹینس کورٹ اور ضروریات زندگی کی دیگر سہولیات سے آراستہ گھر دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے ڈیڈی مالدار آسامی تھے۔ گھر پہنچتے ہی اس نے میرے منع کرنے کے باوجود ملازم کو کھانا لگانے کو کہا۔ ہم کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ بیش قیمت تھری پیس سوٹ میں ملبوس بھاری جسامت والا شخص اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"ہوں تو تم ہو ادیب، خیر تمہارا نام تو بہت سن رکھا ہے۔ تم نے دنیا کی بہت سی خطرناک چوٹیاں سر کی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم جیسا شخص بھی وہمی اور توہم پرست ہو سکتا ہے۔ مجھے صوفیہ نے بتایا تھا کہ تم عدنان شاہ اور اس کی فیملی کی تصویر دیکھ کر چونکے تھے۔ کیا تم مجھے تفصیل سے بتا سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔"

میں نے اسے ثانیہ سے پہلی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ ”یہ جسے تم ثانیہ کہہ رہے ہو یہ ثانیہ نہیں عدنان شاہ کی بیوی سائرہ ہے اور تصویر میں ان کے ساتھ موجود بچی ان کی بیٹی تھی۔ دراصل سائرہ کا تعلق لندن سے تھا۔ عدنان اور سائرہ دونوں ہی کوہ پیما تھے۔ ایک مہم کے دوران دونوں میں دوستی ہوئی جو جلد ہی محبت میں بدل گئی۔ جینی نے عدنان کی محبت میں اسلام قبول کرلیا۔ یوں وہ جینی سے سائرہ کہلانے لگی۔ انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے چار سال لندن میں گزارے۔ وہیں ان کی بیٹی پیدا ہوئی۔

بیٹی کی پیدائش کے پانچویں سال وہ فیملی سمیت پاکستان منتقل ہوگیا۔ سال بھر بعد ہی اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں میں اپنی ٹیم کے ساتھ بیانو گلیشیئر کوہ پیمائی کی غرض سے جارہا تھا۔ عدنان نے بھی جانے کی خواہش ظاہر کردی۔ ویسے بھی شادی کے بعد وہ کسی بھی مہم پر گیا نہ تھا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مسئلہ تو تب پیدا ہوا جب سائرہ نے بھی ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا وہ بھی اپنی پانچ سالہ بیٹی کے ساتھ، خود عدنان اس کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر سائرہ کی ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اس غرض سے اس نے ایک خصوصی بیگ بھی تیار کروایا۔ جس میں ایک پانچ سالہ بچہ باآسانی سما سکے۔

کوہ پیمائی کے دوران وہ بچی عدنان کی پشت پر بندھے بیگ میں ہوتی تھی۔ سائرہ جیسی بہادر کوہ پیماں کی بیٹی بھی اسی کی طرح حوصلہ منداور نڈر تھی۔ وہ پہاڑوں پر چلنے کے دوران خوفزدہ ہونے کے بجائے اچھلتی کودتی اور کھیلتی رہی۔ بدقسمتی سے ایک روز ایک برفانی تودے کی زد میں آکر عدنان سائرہ اور اس کی پانچ سالہ بیٹی سمیت میرے سب ساتھی مارے گئے۔ اس حادثے میں صرف میں ہی شدید زخمی حالت میں زندہ بچا۔ جو کسی نہ کسی طرح اس خطرناک برفانی پہاڑ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر میں نے کوہ پیمائی سے توبہ کرلی۔ اور اپنی توجہ صرف اور صرف کاروبار پر رکھی۔

مگر تمہاری ثانیہ والی کہانی سن کر مجھے عدنان یاد آگیا۔ میں دوبارہ بیانو گلیشیئر پر مہم جوئی کی غرض سے جانا چاہتا ہوں۔ جہاں میں نے عدنان کو کھویا تھا۔ کیا اس مہم میں تم میرے ساتھ چلوگے“

اس کی پیشکش پر میں نے بھی حامی بھرلی، یہ سوچ کر کہ شاید اس مہم جوئی کے دوران میں ثانیہ کو دل سے بھلانے میں کامیاب ہوجاؤں۔ ویسے بھی اس کا کوئی وجود تو نہ تھا۔ پھر بھلا ایک روح کو میں کہاں ڈھونڈتا۔

اس مہم میں مجھ سمیت آٹھ افراد کو جانا تھا۔ فرمان شاہ، اس کا بیٹا طارق خان، میں اور اس کے پانچ ساتھی جن سے اگلے چند روز بعد فرمان خان نے مجھے ملوایا، شاکر، شعیب، اکرم، راجو، دلاور اس کے اگلے روز جب میں فرمان خان کے گھر اس سے محو گفتگو تھا۔ ہم اس مہم کے حوالے سے گفتگو کررہے تھے کہ فرمان خان کے قریب بیٹھی صوفیہ بولی۔ ”ڈیڈی میں بھی اس مہم پر جاؤں گی۔“

فرمان خان کے لئے مشکل کھڑی ہوگئی۔ اس کا اعتراض تھا کہ صوفیہ اس خطرناک مہم پر نہ جائے تو بہتر ہے۔ مگر صوفیہ نہ مانی اس کا کہنا تھا کہ ”جب پچھلی مہم میں عدنان شاہ کی پانچ سالہ بیٹی ساتھ جاسکتی ہے تو وہ کیوں نہیں جاسکتی جب کہ اس نے کوہ پیمائی کی تربیت بھی لے رکھی ہے۔“

اس روز مجھے پتہ چلا کہ صوفیہ نے بھی کوہ پیمائی کی تربیت لے رکھی تھی۔ وہ فرمان خان کی چہیتی تھی۔ بھلا وہ کیسے اس کی بات ٹالتا۔ بالآخر اسے بھی ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ مجھ سمیت نو افراد پر مشتمل قافلہ تھا۔

ہم بیانو گلیشیئر کے بلند و بالا برفانی پہاڑ کی کافی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں ہمیں معمول سے زیادہ وقت لگا تھا اس تاخیر کا سبب صوفیہ کی ناتجربہ کاری تھی۔ اسے درمیان میں رکنا پڑ رہا تھا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے۔ ویسے فرمان خان اور طارق کے علاوہ ان کے دیگر پانچوں ساتھی بھی مجھے ناتجربہ کار اور کوہ پیمائی میں نوارد ہی لگ رہے تھے۔ اکثر کسی مشکل چٹان پر راستہ بنانے کے لئے کیل گاڑتے ہوئے مجھے ہی آگے جانا پڑ رہا تھا۔ اس روز شام ہوتے ہی سرد ہواؤں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ اور پھر سب تھک چکے تھے۔

خاص کر صوفیہ تو تھکن سے نڈھال تھی۔ مناسب جگہ دیکھ کر خیمے گاڑ دیئے گئے۔ یہ چھوٹے سائز کے مگر خصوصی طور پر تیار کردہ خیمے تھے۔ جن پر سرد ہوائیں زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود رات کا اندھیرا بڑھتے ہی سردی کی شدت بڑھنے لگی۔ نصف شب کے قریب فائر کی ہولناک آواز سن کر میں جاگ گیا۔ میں صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے خیمے سے نکلا ہی تھا کہ ایک بار پھر گولی چلی۔ اس بار میں سمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

گولیاں چلنے کی آواز فرمان خان کے خیمے کی طرف سے آرہی تھیں۔ میں خیمے سے باہر نکلا۔ دیگر افراد بھی اپنے خیموں سے نکل کر فرمان خان کی طرف دوڑے۔ ہاتھ میں رائفل تھامے فرمان خان نے ایک طرف پھر فائر داغا۔ طارق خان اور صوفیہ بھی اپنے خیموں سے نکل کر باپ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ طارق خان ورزشی جسم کا حامل 30 سالہ نوجوان تھا اور خاصا گرم مزاج شخص تھا۔ ”پاپا کیا ہوا کس نے آپ پر حملہ کیا ہے۔“ اس نے ہولسٹر میں اڑسا پسٹل نکال کر لہراتے ہوئے کہا۔

اس مہم کے دوران ان کے پاس اسلحے کی موجودگی میرے لئے باعث تشویش تھی۔ جس کا اظہار بھی میں نے فرمان خان سے کیا تھا۔ مگر اس کا کہنا تھا کہ ”یہ اپنی حفاظت کے لئے ہے۔“ فرمان خان کوئی جواب دیئے بغیر ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھا تو مجبوراً دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ٹارچ کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کسی درندے کے پاؤں کے نشان ہیں جب کہ فرمان خان کے خیمے کے باہر انسانی قدموں کے نشان تھے جو کہ ننگے پاؤں تھا۔ کافی آگے جاکر شاکر نے دبے لہجے میں اسے آگے جانے سے منع کیا۔ ”خان صاحب رات بہت ہوچکی ہے۔ یہ خطرناک علاقہ ہے۔ جگہ جگہ سیکڑوں فٹ گہری کھائیاں ہیں۔ اور پھر درندے کے نشانات صاف ظاہر کررہے ہیں کہ ہمارے آس پاس خطرہ ہے۔“ اس کا مشورہ بجا تھا۔

ہم خیموں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ فرمان خان نے بتایا کہ ”وہ گہری نیند میں تھا کہ کھٹکے کی آواز سن کر میری آنکھ کھلی۔“ ”میرے للکارنے پر وہ خیمے سے نکل کر بھاگی۔ میں پشت سے ہی اسے دیکھ پایا۔ مردانہ لباس میں ملبوس لمبے لمبے سنہری بال اور دونوں ہاتھوں کے درانتی کی طرح لمبے ناخن لڑکی کا حلیہ بتاتے ہوئے اس نے خوف سے جھرجھری لی۔ وہ چھلاوے کی طرح خیمے سے باہر نکلی۔ میں رائفل لے کر باہر پہنچا۔ تو ایک ریچھ دائیں سمت بھاگ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس جسیم ریچھ پر وہ لڑکی بیٹھی تھی۔ میں نے گولیاں بھی چلائیں۔ مگر افسوس وہ ہدف پر نہ لگیں۔

ہم سب کے لئے اس برفانی پہاڑ کی اس بلندی پر کسی ریچھ کی موجودگی حیران کن تھی۔ اور پھر سوچنے کی بات یہ تھی کہ درانتی نما لمبے ناخنوں والی وہ عورت کون تھی۔ چڑیل یا اس قسم کی کوئی دوسری مخلوق۔

فرمان خان کا خیمہ ایک طرف سے چیرا ہوا تھا۔ خیمے سے کھانے کے سیل بند ڈبے اور ان کے کپڑوں کا بیگ بھی غائب تھا۔

طارق خان بار بار پسٹل لہرا کر اس چڑیل نما عورت اور ریچھ کی شان میں نازیبا القاب ادا کرتے ہوئے انہیں جہنم رسید کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو اسی وقت ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا مگر سب کے سمجھانے پر یہی طے ہوا کہ صبح برف پر بنے قدموں کے نشان پر اس عورت کا ٹھکانہ معلوم کیا جائے گا۔ مگر صبح اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

رات میں ہونے والی ہلکی ہلکی برف باری قدموں کے نشانات مٹا چکی تھی۔ سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ اس بار ہم مشرق کی سمت چل رہے تھے کہ اچانک رکنا پڑا۔ راستے میں سیکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔ کھائی کی چوڑائی سوفٹ سے زائد تھی۔ ادھر ادھر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کھائی عبور کئے بنا کوئی چارہ نہیں۔ شاکر نے رسے کے آگے آنکڑہ لگا کر کھائی کی دوسری طرف پھینکا۔ پہلی کوشش ناکام رہی۔ دوسری بار پھینکا گیا تو آنکڑہ کھائی

کی دوسری طرف موجود چٹان کے رخنے میں پھنس گیا۔ فرمان خان نے رسا کھینچ کر مضبوطی کا اندازہ لگایا اور رسے کے ذریعے آگے جانے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ صوفیہ راستے میں آ گئی۔

"ڈیڈی پہلے میں جاؤں گی۔"

"مگر؟"

فرمان خان نے اعتراض کرنا چاہا تو صوفیہ نے باپ کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔ "یہ میرے لئے کوئی مشکل نہیں آپ خود بھی جانتے ہیں میں تربیت حاصل کر چکی ہوں۔" فرمان خان مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ صوفیہ واقعی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسے پر پھسلتی ہوئی خندق عبور کر رہی تھی۔

ابھی وہ درمیان میں تھی کہ خندق کی دوسری طرف چٹان کے قریب کسی کا سر ابھرا۔ مجھ سمیت سب نے دیکھا۔ وہ چٹان کی آڑ میں چھپی مردانہ لباس میں ملبوس کوئی لڑکی تھی۔ ایک تو فاصلہ بہت زیادہ تھا اور پھر سر کے گھنے لمبے بال اس کے چہرے کے آگے آئے ہوئے تھے اور پھر وہ آنکڑے کے ساتھ بندھی رسی سے برسر پیکار تھی۔ اس لئے بھی اس کا چہرہ دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔

طارق خان نے اسے للکارتے ہوئے ہولسٹر سے پسٹل نکالا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ آنکڑا رسی سمیت رخنے سے نکل گیا۔ صوفیہ دلدوز انداز میں چیختی ہوئی سیکڑوں فٹ گہری کھائی میں گرتی چلی گئی۔

طارق خان نے گالی بکتے ہوئے گولی چلائی مگر تب تک وہ لڑکی چٹان کی آڑ سے غائب ہو چکی تھی۔

"صوفیہ" فرمان خان نے جھک کر رسا پھینکتے ہوئے بیٹی کو پکارا۔ مگر لگتا تھا کہ رسے کے سرے پر موجود آنکڑہ کھائی میں کسی جگہ پھنس چکا ہے۔ اس لئے کھینچا نہیں جا رہا۔ سب نے مل کر رسا کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

اتنا تو بہرحال سب ہی اپنے ذہن میں سوچ چکے تھے کہ صوفیہ کا زندہ بچنا محال تھا۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں۔ "امید پر دنیا قائم ہے۔"

فرمان خان کا ارادہ رسی کے ذریعے کھائی میں اتر کر بیٹی کو تلاش کرنے کا تھا۔ خود تو شاید اس کام کی اس میں ہمت نہ تھی کہ شاید عمر کا بھی تقاضا تھا۔ کم از کم وہ پچاس برس سے اوپر ہی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ مالی آسودگی اور اچھی صحت کی بدولت پچاس سے کم کا دکھتا تھا۔ طارق اور اس کے ساتھی بھی ہچکچا رہے تھے۔ تبھی میں ہمت کر کے آگے بڑھا۔ "میں نیچے جاتا ہوں۔"

ویسے بھی وہ مخلص لڑکی، میری محسن تھی اس نے دوبار میری جان بچائی تھی، رسی تھام کر میں نیچے اترتا چلا گیا۔ اسی لمحے صوفیہ کی کمزور سی کراہتی ہوئی آواز کھائی میں سے ابھری۔ "صوفیہ کہاں ہو تم؟" میں نے کھائی میں اترتے ہوئے اسے پکارا۔ مگر جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

صوفیہ کی آواز سن کر میرا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ میں اپنی محسن کو بے بسی کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں مزید نیچے اترتا چلا گیا۔

تقریباً پچاس فٹ کے لگ بھگ کھائی میں اترنے کے بعد وہ مجھے دکھائی دی۔ وہ رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے کافی نیچے تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے اور لباس کو بھگو چکا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہادر اور باہمت لڑکی تھی۔ یقیناً اس نے کھائی میں گرتے وقت حواس نہیں کھوئے تھے۔ اور گرتے وقت کھائی کی دیوار سے ٹکرائی تھی۔ جس سے سر اور جسم پر چوٹیں لگی ہوں گی۔

"صوفیہ اوپر آنے کی کوشش کرو۔" میں وہیں سے چلایا۔

"یہ بہت مشکل ہے۔" اس نے بے چارگی سے جواب دیا۔ پھر میں نے غور سے دیکھا تو اس کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ کھائی کی دیوار کے ساتھ اگی بڑی سی خورد کانٹے دار جھاڑی کے ساتھ اس کا لباس اور وہ خود بھی پھنسی ہوئی تھی۔ یقیناً یہی کانٹے دار جھاڑی اس کی جان بچانے کا سبب بنی تھی اور یہی اس وقت اس کے لئے مشکل بنی ہوئی تھی۔ اسی جھاڑی کی جڑ کے پاس رسے کا آنکڑا بھی پھنسا ہوا تھا۔

"او کے حوصلہ رکھو میں آتا ہوں۔" میں نے آواز

لگائی اور رسے کے ساتھ پھسلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

کچھ ہی دیر میں، میں اسے اس کانٹے دار جھاڑی سے آزاد کروا چکا تھا، اب باری تھی جھاڑی کے ساتھ پھنسے آنکڑے کی تو میں رسی پر پھسلتا ہوا آنکڑے کے قریب جا پہنچا۔ آنکڑہ کانٹے دار جھاڑی کی جڑ میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اسے نکالنے کی کوشش میں میرے ہاتھ بھی کانٹوں سے زخمی ہو گئے۔ مگر بہرحال میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ اور دوبارہ صوفیہ کے قریب پہنچا۔ وہ اس قابل نہ تھی کہ رسی کے ذریعے خود اوپر چڑھتی۔ "مجھے مضبوطی سے تھام لو۔" میں نے صوفیہ سے کہا۔

وہ مجھے تھامنے کے بجائے تقریباً لپٹ ہی گئی۔ اس کے پرشباب جسم کے نشیب و فراز کا بھرپور لمس محسوس کرتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور اوپر جانے کی رفتار کم ہونے لگی۔

بہرحال ہمت کر کے آگے بڑھتا رہا، کافی اوپر جا کر میں نے فرمان خان کو آواز لگائی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ رسا اوپر کھینچا جانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی ہم کھائی سے باہر تھے۔

"تھینکس گاڈ، تم ٹھیک ہو۔" فرمان خان بیٹی کی طرف لپکا۔ فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ صوفیہ کے سر کے زخم پر بینڈیج کر دی گئی۔ طارق خان اس واقعہ سے بہت برہم تھا اور گرجتے برستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آخر یہ برفانی چڑیل ہے کون اور ہم سے چاہتی کیا ہے۔" خیمے میں چوری اور پھر صوفیہ کی جان لینا چاہتی تھی۔ اس کی ان باتوں کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

ویسے اس کے حلیے کی مناسبت سے اس لڑکی کے لئے برفانی چڑیل کا خطاب درست ہی لگا۔ بھلا اس برفانی پہاڑ میں عام لباس میں بغیر کسی احتیاطی تدابیر کے کون انسان کیسے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ صوفیہ کو جان سے مارنے کی کوشش کے بعد سب چوکنے ہو چکے تھے۔ طے یہ پایا کہ پڑاؤ کی صورت میں سب باری باری پہرہ دیں گے۔

ویسے بھی ہم نے ایک آدھا دن یہیں رہنے کا سوچا تھا کہ فی الحال صوفیہ کی حالت بہتر نہ تھی۔ ایک مناسب مقام پر خیمے گاڑ دیئے گئے۔

دوسرے روز ہم سب رسے کے ذریعے کھائی عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔

صوفیہ کا حوصلہ قابل دید تھا۔ وہ گزشتہ روز پیش آنے والے حادثے سے ذرا برابر خوفزدہ نہیں تھی۔ اور بڑے اطمینان سے اس نے بھی رسے کے ذریعے کھائی عبور کی۔ یہاں کافی بلند چٹان تھی۔ جس پر چڑھنے میں پورا دن ضائع ہو گیا۔ اس روز ہوا بھی تیز تھی اس لئے جلد ہی پڑاؤ کا فیصلہ کیا گیا۔ پڑاؤ کے دوران رات کو شاکر اور طارق خان خیموں کی پہرے داری پر تھے کہ اچانک شور شرابے اور چیخ پکار کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی شخص کربناک انداز میں اس طرح چیخ رہا تھا کہ جیسے جان کنی کے عذاب میں مبتلا ہو۔

میں دوڑتا ہوا خیمے سے باہر نکلا۔ ہاتھ میں موجود ٹارچ کی روشنی میں، میں نے بڑا خوفناک منظر دیکھا، شاکر زمین پر لہولہان پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خراشوں کے گہرے نشان تھے اور شہ رگ تو جیسے کسی درندے نے ادھیڑ ڈالی تھی۔

قریب ہی طارق خان رائفل ہاتھ میں تھامے پریشان صورت لئے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی مردانہ لباس میں ملبوس وہ برفانی چڑیل اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے لمبے اور گھنے بالوں اور مردانہ لباس سے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے خیمے سے چوری کی تھی اور صوفیہ کو جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔

سب سے حیران کن اور ہولناک بات اس لڑکی کے درانتی نما ناخن تھے اس وقت ان ناخنوں میں انسانی لہو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جو یقیناً شاکر کا ہی تھا۔ شاکر کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔ اور پھر یہی ہوا شاکر کا تڑپ ہوا جسم ساکت ہو گیا۔

فرمان خان صوفیہ اور دیگر افراد بھی خیموں سے باہر آ چکے تھے۔ "یہ کیسے ہوا؟" فرمان خان نے سراسیمہ لہجے میں بیٹے سے استفسار کیا۔ اس نے بتایا۔ "ہم پہرے

پر تھے ذرا سی دیر کے لئے میں اونگھنے لگا کہ شاکر کے للکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا یہ برفانی چڑیل آپ کے خیمے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس اثنا میں شاکر اس سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا برفانی چڑیل نے لمحوں میں اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے شاکر کا گلا ادھیڑ ڈالا۔"

میں نے عقب سے رائفل سے بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ اب پتہ نہیں یہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ طارق خان نے لاپرواہی سے سر جھٹکے ہوئے بتایا۔

فرمان خان نے آگے بڑھ کر برفانی چڑیل کو سیدھا کر کے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے اس جگہ اور ایسی حالت میں سامنا ہوگا وہ ثانیہ تھی۔ جس سے میں پارک میں ملا تھا۔

صوفیہ کا کہنا تھا کہ "وہ سائرہ کی روح ہے۔"

فرمان خان نے میری کہانی سن کر مجھے وہمی اور توہم پرست کہا تھا خود اس کے چہرے پر بھی اس وقت حیرت کے تاثرات نمایاں تھے۔ "ناممکن یہ تو ہو بہو سائرہ ہے جب کہ وہ سب میری نگاہوں کے سامنے مرے تھے۔" فرمان خان نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی نبض چیک کی۔ "یہ زندہ ہے۔" اس کے ان الفاظ نے گویا میرے مردہ تن میں روح پھونک دی۔

میں بے قراری سے آگے بڑھا۔ "یہ ثانیہ ہے۔ میری ثانیہ۔" میں نے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے اسے ہوش میں لانا چاہا۔

پھر طارق خان آگے بڑھا۔ اور بازو سے تھام کر ایک طرف دھکیلا۔ "تم پاگل تو نہیں نہ تو یہ انسان ہے اور نہ روح یہ چڑیل ہے۔ تم دیکھتے نہیں اس نے کتنی بے رحمی سے شاکر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اور پھر ڈیڈی نے خود اسے خیمے سے چوری کر کے ایک جسیم ریچھ پر سوار ہو کر فرار ہوتے دیکھا تھا۔ اور اسی وجہ سے صوفیہ اس روز کھائی میں گری تھی۔ میں خود اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔"

طارق خان کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ "بکتے ہو تم، اگر تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں جارحانہ انداز میں طارق خان کی طرف بڑھا۔

اس سے پہلے کہ ہم آپس میں لڑ پڑتے۔ فرمان خان نے بیچ میں مداخلت کی۔ "خاموش رہو تم دونوں ایک انجان لڑکی کی خاطر آپس میں لڑ رہے ہو۔ یہ لڑکی شاکر کی قاتل ہے۔ اسے صوفیہ کے خیمے میں باندھ کر ڈال دو۔ اسے کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ صبح کریں گے اور طارق خان تم صبح سے پہلے اس چڑیل کے خیمے کی طرف جاؤ گے بھی نہیں۔" اس نے بیٹے کو تنبیہ کیا۔

لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر خیمے میں ڈال دیا گیا۔ جب کہ شاکر کو وہیں برفانی میدان میں دفنا دیا گیا۔ اس سب سے فارغ ہو کر فرمان خان مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ادیب تم میرے خیمے کی طرف چلو۔ ضروری بات کرنی ہے۔"

میں اس کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کو کہا اور خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"دیکھو ادیب تم اچھے خاصے پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہو۔ تم نے مجھے سائرہ کی تصویر دیکھ کر جو ثانیہ کی کہانی سنائی تھی۔ اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ سائرہ کی روح تھی۔ جس کا کوئی جسمانی وجود نہیں ہوتا۔ جب کہ یہ لڑکی جیتا جاگتا وجود ہے۔ اور پھر اس کا حلیہ دیکھو یہ جنگلی لڑکی انسانی تہذیب سے بھی آشنا نہیں لگتی۔ اس کے درانتی کی طرح لمبے ناخن اور پھر شاکر کو اس بے رحمی سے مارنا اور پھر دیکھو یہ عام سے کپڑوں میں بغیر کسی احتیاطی تدابیر کے اس برفانی پہاڑ میں تن تنہا رہتی ہے اور پھر میں نے خود اسے اس جسیم ریچھ پر سوار دیکھا تھا۔ یہ تو مجھے کوئی عجوبہ لگتی ہے۔ جب ہم اسے اپنی دنیا میں لے جائیں گے تو تم خود سوچو کیا ہوگا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے اور میڈیا پر دھوم مچ جائے گی۔ ہم اس برفانی لڑکی کی وجہ سے شہرت کی بلندی پر ہوں گے۔"

وہ نہ جانے مجھے کون سے سہانے سپنے دکھا رہا تھا۔

جسے میں بے دلی سے سن رہا تھا، دونوں باپ بیٹا عجیب تھے، بیٹا اس کی جان کا دشمن تھا۔ جب کہ باپ شہرت کے لئے اس کا تماشہ بنانا چاہتا تھا۔

وہ ثانیہ تھی یا اس کی ہم شکل وہ جو بھی تھی مجھے عزیز تھی۔

نہ تو میں چاہتا تھا کہ اسے کوئی جانی نقصان پہنچے اور نہ ہی میں اسے تماشہ بنانا چاہتا تھا۔ ہماری باتوں کے دوران طارق خان ٹرے میں چائے کے دو کپ لئے ہوئے داخل ہوا۔

تو مجھے حیرت ہوئی شاید وہ بھی میرے چہرے سے حیرانگی کے تاثرت بھانپ چکا تھا۔ وضاحت کرنے لگا۔ "میرا دل چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا اس واقعہ سے میری طرح دوسرے بھی ذہنی طور پر پریشان ہوں گے۔ اس لئے سب کے لئے چائے بناؤں۔" وہ چائے دے کر چلا گیا۔ میں نے صرف ایک گھونٹ پیا، چائے کا ذائقہ عجیب قسم کا تھا۔ اس لئے کپ ایک طرف رکھ دیا، جب کہ فرمان خان نے باتوں کے دوران پورا کپ خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

اچانک مجھے اپنا سر بھاری بھاری سا لگنے لگا۔ پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ مگر اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ اعصابی کمزوری اس قدر حاوی ہو چکی تھی کہ ایک طرف بے دم ہو کر گرا اور ہوش و خرد سے محروم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ کوئی گھنا جنگل تھا۔ ثانیہ ننگے پاؤں ایک طرف دوڑ رہی تھی۔ ان کے عقب میں ایک خونخوار بلڈاگ بھونکتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے بار بار پلٹ کر اس خونخوار کتے کو دیکھتی جو لحہ بہ لحہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر مجھے بار بار مدد کے لئے پکار رہی تھی۔

اسی پل خونخوار کتے نے جست لگا کر ثانیہ کو گرا دیا قریب تھا کہ وہ بلڈاگ ثانیہ کی شہ رگ میں دانت پیوست کرتا۔ میں چلایا ثانیہ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ گویا یہ خواب تھا مگر بڑا بھیانک خواب تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

فرمان خان اسی طرح خیمے میں بے ہوش پڑا تھا۔ قریب ہی چائے کے کپ تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد سے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ چکا تھا کہ طارق خان نے چالاکی سے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملائی تھی اور یقیناً اس نے یہ چائے سبھی کو پلائی ہوگی اور سب ہی بے ہوش ہوں گے۔ میرے جلد ہوش میں آنے کی وجہ غالباً یہی تھی کہ میں نے چائے کا صرف ایک گھونٹ بھرا تھا۔ مگر اسے یہ سب کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہیں وہ اس برفانی لڑکی کو نقصان تو نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ اگر حقیقت میں ثانیہ نہیں تھی تو ہو بہو ثانیہ کی طرح ہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے صوفیہ کے خیمے کی طرف لپکا۔

صوفیہ بھی ایک طرف بے ہوش پڑی تھی۔ جب کہ وہ شیطان اس برفانی لڑکی پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔

میں نے طارق خان کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف پھینکا اور اس برفانی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب وحشت ناک چمک تھی۔ وہ کسی درندے کی طرح غرا رہی تھی۔ اسی لمحے طارق خان اٹھ کر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ہتھوڑے جیسے ہاتھوں کی لاتعداد ضربیں مجھے اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ سفلی جذبات کی ناکامی نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کک رسید کی۔ مارشل آرٹ قوانین کے تحت یقیناً فاؤل تھا۔ مگر یہ زندگی کی بقا کی جنگ تھی۔ جس میں میری شکست مجھے موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا رکوع کے بل جھکا۔ میں نے فضا میں اچھل کر داہنی کہنی کی ضرب اس کی پیٹھ پر رسید کی تو وہ زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے

پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ دیا۔ غصے میں مجھے یہ بھی نہیں پتہ لگ رہا تھا کہ میں اس کے جسم کے کس حصے پر ٹھوکریں رسید کررہا ہوں۔ یہی میری غلطی تھی۔

غصہ عقل کا دشمن ہے۔ اکثر کسی بھی فائٹ کے دوران یہی غصہ فائٹر کی شکست کا سبب بنتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مجھے کچھ پتہ بھی نہ چلا کہ کب طارق خان نے میری داہنی ٹانگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے انتہائی بے رحمی سے موڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور میں پہلو کے بل نیچے گر پڑا۔

طارق خان کھڑا ہو چکا تھا۔ اور میری داہنی ٹانگ اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے اپنا بایاں پاؤں میرے گھٹنے کے جوڑ پر رکھا اور میری ٹانگ کو موڑتے ہوئے زور دینے لگا۔ درد اور اذیت کی کٹیلی لہریں میرے پورے وجود میں سرایت کر گئیں۔ میرے حلق سے بے ساختہ چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ ”گیدڑ کی اولاد اور میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے بیچ میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا یہ جنگلی لڑکی تیری بہن لگتی ہے، میں تجھے آئندہ ٹانگوں پر چڑھنے کے لائق ہی نہیں چھوڑوں گا۔“

مجھے واقعی اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میری ٹانگ کسی بھی لمحے دھڑ سے الگ ہو جائے گی۔ درد اور اذیت کی شدت سے میں حواس کھوتا جا رہا تھا۔ تبھی میں نے طارق خان کی گرفت کو کمزور ہوتا محسوس کیا۔ میری ٹانگ اس کی گرفت سے نکلی تو مڑ کر دیکھا اس کے عقب میں صوفیہ کھڑی تھی۔ جس کے ہاتھ میں مضبوط لکڑی کا ڈنڈا سا تھا۔ جس سے اس نے طارق خان کے سر کے عقبی حصے پر ضرب رسید کی تھی۔

طارق خان زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ”تھینک یو صوفیہ۔“ میں کراہتا ہوا اٹھا۔

”تم ٹھیک تو ہو ناں ادیب۔“ وہ بے قراری سے آگے بڑھی۔ ”ہاں کچھ درد ہے ٹانگ میں“ میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ حالانکہ میری ٹانگ میں انتہائی شدید تکلیف تھی۔

تھوڑی دیر ٹانگ کو ہلانے جلانے سے خون کی روانی میں بہتری آئی اور تکلیف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ صوفیہ نے بتایا۔ ”طارق خان نے اسے بھی چائے پلائی تھی۔“ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چائے میں بے ہوشی کی دوا شامل ہوگی۔ وہ ہوش میں آئی تو مجھے مصیبت میں دیکھ کر اسے صورتحال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ مجھے بچانے کے لئے اس نے بھائی کے سر پر قریب پڑا ڈنڈا رسید کر دیا۔ اب اس کا کیا کرنا ہے۔ صوفیہ نے برفانی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم ثانیہ ہو ناں۔“ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بے قراری سے کہا۔ وہ مجھے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔

”تم ثانیہ ہو ناں۔“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

”بس ثانیہ“ اس نے عجیب طرح سے نام دہرایا اور کسی درندے کی طرح آہستہ آہستہ غرانے لگی۔ ”تم بول نہیں سکتیں۔ ثانیہ نے تو مجھ سے پارک میں باتیں کی تھیں یعنی تم ثانیہ نہیں ہو۔“ یہ الفاظ میں نے گہرے دکھ کے ساتھ کہے تھے۔

تبھی صوفیہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”لگتا ہے یہ انہی برفانی پہاڑوں میں پلی بڑھی ہے۔ درندوں کے بیچ رہتے ہوئے انہی کی زبان بولنے لگی ہے۔ اس روز ڈیڈی نے اسے ریچھ پر سوار دیکھا تھا ہو سکتا ہے یہ واقعی انسان نہیں برفانی چڑیل ہو۔“ اس بار اس نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ وہ حسن و جمال کا پیکر ہو بہو ثانیہ کی طرح تھی۔

صوفیہ اس کے حلئے اور درانتی نما ناخنوں اور جانوروں کی طرح غرانے کی وجہ سے برفانی چڑیل کہہ رہی تھی۔ مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ اگر طارق خان ہوش میں آجاتا تو مشکل پڑ جاتی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس برفانی لڑکی کے ہاتھ پاؤں کی رسی کھول دی وہ اٹھی۔ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور خیمے سے باہر نکل گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے خیمے سے باہر نکلے ہم نے دیکھا وہ رات کی تاریکی میں کسی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلی صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ فرمان خان اور اس کے ساتھی ہوش میں آئے تو برفانی لڑکی خیمے سے غائب تھی۔ جب کہ طارق خان صوفیہ کے خیمے میں بے ہوش پڑا تھا۔ صوفیہ نے باپ کو پہلے ہی صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔

طارق خان نے ہوش میں آتے ہی پہلے بہن کو خوب سنائیں پھر مجھے گالیاں بکتے ہوئے حملہ آور ہونا چاہا، وہ سخت اشتعال میں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے جان سے مار ڈالتا۔ مگر فرمان خان بیچ میں آ گیا۔

”طارق یہ ہمارے دشمن نہیں دوست ہیں۔ ایک انجان لڑکی کے لئے ادیب سے الجھنے کی ضرورت نہیں اور پھر غلطی بھی تمہاری تھی۔ تم نے نہ صرف دھوکے سے سب کو بے ہوش کیا بلکہ اس لڑکی کی عزت بھی لوٹنا چاہی۔ اگر ادیب کی جگہ میں بھی ہوتا تو تم سے لڑ پڑتا۔“ وہ حق اور سچ کا ساتھ دے رہا تھا۔ مجھے دل سے پسند آیا تھا کہ حق کی خاطر اس نے مجھے بیٹے پر ترجیح دی تھی۔

ہم کافی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ فرمان خان نے پلان سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کیا تو میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ یہ راستہ محفوظ ہے اور میں پہلے بھی اس پر سفر کر چکا ہوں۔ فرمان خان نے کچھ اس انداز سے وضاحت کی کہ میں اعتراض کرنے کے بجائے خاموش ہو گیا۔ حالانکہ میرے اندازے کے مطابق یہ راستہ محفوظ ہونے کے بجائے دشوار اور خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کوہ پیما ٹیمیں اس راستے کا رخ بھی نہیں کرتیں۔ یہی بات میں نے فرمان خان کو سمجھانا چاہی۔ مگر اس نے کوئی خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ تو میں خاموش ہو گیا اور پھر میرے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔

کافی دیر بعد ہم ایک تکونی چٹان کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ تکونی چٹان کافی بلند اور عام چٹانوں سے مختلف تھی۔ اوپر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ دائیں بائیں سیکڑوں گہری کھائیاں تھیں۔ اور ان کی چوڑائی اس قدر طویل تھی کہ انہیں کسی بھی صورت عبور کرنا ناممکن تھا۔ ب واپس چلنا بھی حماقت تھا کہ کافی فاصلہ طے کر چکے تھے اور پھر فرمان خان بھی اسی راستے سے اوپر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس بار اس نے شعیب کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کیل گاڑتا ہوا اس تکونی چٹان پر چڑھنے لگا۔

کافی سخت چٹان تھی اسے کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ اور کافی وقت صرف ہو رہا تھا۔ وہ تقریباً سو فٹ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اور مزید آگے بڑھنے کے لئے کیل ٹھونک ہی رہا تھا کہ کیل کے پاس سے چٹان کا ایک حصہ تڑخا اور پتھر سیدھا اس کے سر پر لگا تو وہ کربناک انداز میں چیختے ہوئے پتھر سمیت سو فٹ کی بلندی سے گرتا چلا گیا۔ وہ سر کے بل گرا تھا اور گرتے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کا سر کسی تربوز کی طرح تڑخ چکا تھا۔

میں جذباتی انداز میں آگے بڑھا، میں نے پہلے ہی کہا تھا یہ راستہ خطرناک ہے۔ فرمان خان نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”ادیب شعیب میرا ساتھی تھا۔ تم سے زیادہ مجھے دکھ ہے۔ اور تم خود بھی جانتے ہو۔ کوئی بھی کوہ پیما کسی بھی مہم پر جاتے وقت یہ ذہن میں رکھتا ہے کہ اسے قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“ شعیب کو وہیں ایک جگہ برف کھود کر دفنا دیا گیا۔ اس بار فرمان خان نے مجھے آگے جانے کا حکم دیا۔ اس چٹان میں کیل ٹھونکتے ہوئے مجھے واقعی دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔

کافی مضبوط چٹان تھی۔ چٹان کے وسط تک پہنچتے پہنچتے میں تھکن سے چور چور ہو چکا تھا۔ ایک کیل ٹھونکتے ہوئے میں گرتے گرتے بچا۔ یہاں بھی پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹوٹ کر گرا تھا۔ مگر میں نے رسے پر بائیں طرف انتہائی تیزی سے سرک کر خود کو بچایا تھا۔

اگر مجھے لمحہ بھر بھی تاخیر ہوتی تو میرا حشر بھی شعیب جیسا ہوتا۔ مرنے سے بال بال بچا تو میں محتاط ہو گیا۔ بالآخر یہ کٹھن اور دشوار گزار راستہ میں نے طے کر ہی لیا۔ جب تک دوسرے اوپر نہیں آئے۔ میں ایک طرف آرام کی غرض سے پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ میرے دوسروں کے لئے راستہ بنانے سے اگرچہ ان کے لئے آسانی ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ تھکن سے چور چور تھے۔

کافی دیر ہو چکی تھی، ہمیں یہاں پہنچتے پہنچتے

رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس لئے خیمے گاڑ دیئے گئے۔ سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ اس لئے خیموں میں جاتے ہی سو گئے۔ مگر شاید اس مہم میں سکون ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔

رات کے آخری پہر دلدوز چیخوں کی آوازیں سن کر میں اٹھ بیٹھا۔ اور دل ہی دل میں یا اللہ خیر کہتا ہوا خیمے سے باہر نکلا۔ فرمان خان، طارق خان سمیت تقریباً سبھی اپنے اپنے خیموں سے باہر تھے۔ البتہ ہماری ٹیم کا ایک فرد کم تھا۔ اس کمی کا احساس ہوتے ہی فرمان خان چلایا۔

''دلاور کہاں ہے۔'' سب دوڑتے ہوئے دلاور کے خیمے میں پہنچے۔ اندر دلاور کی خونچکاں لاش پڑی تھی، اس کے پیٹ کے اندرونی اعضا جسم سے باہر تھے۔ پھٹے ہوئے خیمے کے اندر اور باہر کسی درندے کے پاؤں کے نشانات تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ریچھ کے پنجوں کے نشان تھے۔ ''یہ سب اسی برفانی لڑکی کا کیا دھرا ہے۔ نہ ادیب اسے آزاد کرتا اور نہ دلاور مارا جاتا۔''

طارق خان سخت غصے میں تھا۔ فرمان خان نے اسے غصے سے گھورا۔ ''آپس میں لڑنے کی ضرورت نہیں اب اس لڑکی یا ریچھ کو دیکھتے ہی گولی مار دو۔'' فرمان خان کے اس حکم پر طارق خان نے فاتحانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اس کے لبوں پر ہنسی آ گئی تھی اس کے دل کے ارمان جو پورے ہو رہے تھے۔

دلاور کو خیمے سے باہر گڑھا کھود کر دفنا دیا گیا۔ اس سانحہ کے بعد بھلا کون سوتا، رات بھر جاگتے رہے اور صبح آگے بڑھ گئے۔ اس بار ہم بیافو گلیشیر کی بلند ترین چوٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ جسے سر کرنے کی کوشش میں نہ جانے کتنے ہی کوہ پیما جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس چوٹی کو عبور کر کے اوپر پہنچے تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب بہتر یہی تھا کہ کسی مناسب مقام پر قیام کیا جاتا۔ ایک مناسب جگہ پہنچ کر خیمے گاڑنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ گڑگڑاہٹ کی ہولناک آواز فضا میں گونجی۔ یہ گڑگڑاہٹ ایسی خوفناک تھی کہ ہمارے اردگرد کی زمین لرزنے لگی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بیافو گلیشیر زلزلے کی زد میں آ گیا ہو۔ ہم سب کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے۔ سب ہی اس گڑگڑاہٹ کی خوفناک آواز سے بخوبی واقف تھے۔ یہ ایولانچ برفانی تودے کی آواز تھی۔ جو ہزاروں ٹن وزنی ہوتا ہے اور سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیتا ہے۔

مجھ سمیت سب ہی بوکھلا کر پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑے کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ سب کو ہی اپنی جان بچانے کی پڑی تھی۔

بھاگتے ہوئے میری نگاہ ایک قریبی چٹان پر پڑی اس چٹان میں نیچے کی طرف کافی بڑی دراڑ تھی۔ اس دراڑ میں اکرم پہلے ہی چھپا بیٹھا تھا۔ دوسرے کہاں تھے یہ ہمیں بھی خبر نہ تھی سچ تو یہ تھا کہ ہمیں خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

برفانی تودا لڑھکتا ہوا جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا۔ اس کی گڑگڑاہٹ کی قیامت خیز آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ دیوہیکل تودا گڑگڑاہٹ کی ہولناک آواز کے ساتھ ہماری چٹان پر سے گزرا۔ گڑگڑاہٹ کی یہ آواز اس قدر گونجدار تھی کہ ہمیں اپنے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جب یہ برفانی تودا تباہی مچاتا ہوا گزرا تو دراڑ کے آگے برف کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

کافی دیر بعد ہم دونوں دراڑ کے آگے سے برف ہٹا کر باہر نکلے، تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

جگہ جگہ چھوٹے بڑے برفانی تودے چٹانوں کی صورت میں موجود تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جس جگہ ہم کچھ دیر پہلے موجود تھے۔ فرمان خان، طارق، صوفیہ اور لاجو کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم نے ادھر ادھر تلاش کیا۔ آوازیں بھی لگائیں مگر وہ کہیں نہ ملے۔ لگتا تھا کہ وہ برفانی تودے کی زد میں آ گئے تھے۔ اس صورت میں ان کی لاشوں کا ملنا بھی محال تھا۔ یہ سوچتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ صوفیہ کا تھا۔ وہ لڑکی بے حد مخلص تھی اور ہر مشکل موڑ پر میرے کام آئی تھی۔ ابھی ہم

اردگرد کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ایک چٹان کی آڑ سے ایک جسیم مادہ ریچھ نمودار ہوئی۔

رات کی تاریکی کے باوجود وہ ہمیں بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔ مادہ ریچھ جارحانہ انداز میں غراتے ہوئے ہماری طرف بڑھی۔ راجو اسے دیکھتے ہی حواس کھو بیٹھا۔ اور چیخ کر بھاگنا چاہا۔ اس کی چیخ نے مادہ ریچھ کو مشتعل کر دیا۔ اس نے جست لگائی، راجو اس کے بھاری بھرکم جسم تلے دب گیا۔

مادہ ریچھ نے اگلے بائیں پنجے کا بھرپور وار راجو پر کیا۔ میں نے راجو کو اڑتا ہوا سا ایک طرف گرتے دیکھا۔ راجو کی خونچکاں لاش دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مادہ ریچھ کا پنجہ راجو کی گردن پر پڑا تھا۔ اس پنجے میں اس قدر قوت تھی کہ راجو کا سر گردن سے الگ ہو کر ایک طرف لٹک رہا تھا۔

راجو کے خونچکاں مردہ وجود کو سونگھ کر مادہ ریچھ غراتے ہوئے میری طرف بڑھی۔ بپھری ہوئی ریچھنی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی۔ مجھ میں اپنی جگہ سے ہلنے تک کی سکت نہ تھی۔ خوف و دہشت سے گویا میرے قدم زمین سے چپک گئے تھے۔ مادہ ریچھ نے مجھ پر غراتے ہوئے جست لگائی۔ اس کے بدبودار بھاری بھرکم جسم تلے دب کر ہوش و حواش کھوتے ہوئے میرے ذہن میں آخری خیال یہی ابھرا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

☆......☆......☆

میرے قریب ہی کہیں ہلکی ہلکی غراہٹ آمیز آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ یہ کسی غار کا اندرونی حصہ تھا۔ اور میں گھاس پھونس کے بنے ہوئے بستر پر موجود تھا۔ میرے قریب ہی ثانیہ کی ہمشکل برفانی لڑکی موجود تھی۔ یہ غراہٹ آمیز آوازیں اسی کی تھیں۔ غاز میں عجیب قسم کی بساند آمیز بو تھی۔

غار میں ہونے والے اجالے سے اتنا تو میں اندازہ لگا ہی چکا تھا صبح ہو چکی ہے گویا میں رات بھر بے ہوش رہا تھا۔ مگر میں اس غار میں پہنچا کیسے۔ مجھ پر تو مادہ ریچھ نے حملہ کر دیا تھا۔ ان سوالات کے جواب میرے پاس نہ تھے۔ نہ ہی وہ برفانی لڑکی بتا سکتی تھی کہ وہ عام انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر غار کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ایک طرف میلا کچیلا کولر رکھا ہوا تھا۔ جب کہ دوسری طرف کافی تعداد میں بیگ موجود تھے۔ جو یقیناً ہماری طرح کے کوہ پیماؤں کے تھے۔ جو اس برفانی لڑکی نے چوری کئے ہوں گے۔ ''میں کہاں ہوں اور اس غار میں کیسے پہنچا۔'' میں نے ہمت کر کے برفانی لڑکی کو مخاطب کیا۔ اس نے غراتی ہوئی آواز میں کوئی جواب دیا۔ جو میرے پلے نہیں پڑا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھوں سے میرے گالوں کو چھو کر دیکھنے لگی۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ کہ کہیں وہ مجھے اپنے درانتی نما ناخنوں سے ادھیڑ نہ ڈالے۔ شاید اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے خوف بھانپ لیا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ یہ دوستانہ ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی سے مجھے حوصلہ ملا۔ ''تم کون ہو؟'' میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

''مس ثانیہ۔'' اس نے کہا تو میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''ثانیہ ثانیہ۔'' وہ صرف ایک ہی لفظ کہتی جا رہی تھی۔ اس کے اس طرح ثانیہ کی گردان سے اتنا تو سمجھ آ ہی گیا کہ وہ صرف یہی نام ادا کر سکتی ہے۔ مگر وہ یہ نام دوہرا کیوں رہی تھی یہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ ثانیہ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ میں خود اس پارک میں ثانیہ سے ملا تھا۔ وہ ثانیہ تو اس برفانی لڑکی سے بہت مختلف تھی۔

ابھی میں اسی سوچ و بچار میں مصروف تھا کہ وہ خراماں [illegible] چلتی ہوئی غار سے نکل گئی۔ اس کے دوستانہ رویے [illegible] مجھے حوصلہ ملا تھا۔

[illegible] اٹھا اور غار میں چہل قدمی کرتے ہوئے دہانے کی [illegible]رف چل پڑا۔ کافی کشادہ اور شیطان کی آنت کی طرح [illegible]با غار تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ غار کے دونوں

طرف دہانے تھے۔ میں واپس اپنی جگہ آ گیا۔ وہاں رکھے ہوئے بیگوں میں سے ایک کھول کر دیکھا۔ اس میں کھانے کے سیل بند ڈبے بسکٹ اور دیگر کھانے کی اشیا تھیں۔ دوسرے بیگ میں بھی یہی اشیا تھیں۔ تیسرا بیگ کافی بڑا تھا۔ اس کی زپ کھولتے ہی جیسے غار میں روشنی سی ہوگئی۔ یہ بیگ ہیروں سے بھرا ہوا تھا۔

میں ہیروں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا یہ بیش قیمت ہیرے کروڑوں کی مالیت کے تھے۔ میں نے بیگ کی زپ دوبارہ بند کی اور اسے اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ اگلے بیگ میں پہننے کے کپڑے تھے۔ اس سے اگلے بیگ میں کپڑوں کے علاوہ ایک گلابی رنگ کی ضخیم ڈائری تھی۔ دیگر سامان بیگ میں رکھ کر میں ایک طرف بیٹھا اور ڈائری پڑھنے لگا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ یہ ڈائری نہیں بلکہ لکھنے والی کی داستان حیات تھی۔ لکھا تھا۔

شروع اللہ کے نام سے جو بہت بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

میرا نام جینی اور تعلق عیسائی گھرانے سے تھا۔ میں والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ مگر ان کے پاس میرے لئے وقت نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں یہ ویسے بھی معیوب بات نہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ میں کیا کرتی ہوں اور کس سے ملتی ہوں۔ مغربی معاشرے میں زیادہ تر لڑکیاں بن بیاہی ماں بن جاتی ہیں۔ لڑکے لڑکی کی دوستی اور تعلقات کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر میری کسی لڑکے سے دوستی نہیں تھی۔ میرے کزنز اور کلاس فیلو میرا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارے جسم میں کسی پرانے زمانے کی دقیانوسی لڑکی کی روح ہے۔

مجھے کوہ پیمائی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں، میں ایک کوہ پیما گروپ میں شامل ہوگئی۔ اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے کوہ پیمائی میں مہارت حاصل کرتی گئی۔ ان دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کردیا۔

اس روز میں ایک فرینڈ مارتھا کی برتھ ڈے پارٹی سے لوٹ رہی تھی کہ ایک مفلوک الحال بوڑھا میری گاڑی کے سامنے آ گیا۔ میں نے اس خیال سے گاڑی روک دی کہ شاید اسے لفٹ کی ضرورت ہو۔ ”بیٹا بہت بھوک لگی ہے۔“ اس نے کہا۔ میں اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر فائیو اسٹار ہوٹل لے گئی۔

بوڑھے نے میری توقع کے برعکس بہت کم کھایا۔ جب میں نے اس کے کہنے پر اس جگہ گاڑی سے اتارا جہاں سے وہ مجھے ملا تھا۔ اترنے سے پہلے وہ کہنے لگا۔ ”میں تمہیں مال و دولت کی دعا نہیں دوں گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں ہدایت دے۔“

اس وقت میرے نزدیک یہ عجیب قسم کی دعا تھی جس کی مجھے بعد میں سمجھ آئی۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی مہم کے دوران میری ملاقات عدنان شاہ سے ہوئی۔ جس کا تعلق پاکستان سے تھا۔ یہ پہلی ملاقات ہی محبت میں بدل گئی۔ اس نے مجھے پرپوز کیا اور ساتھ میں یہ شرط رکھی کہ ”شادی سے پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا۔“

میں نے سوچنے کے لئے وقت مانگا۔ دین اسلام کے موضوع پر لکھی گئی کتابیں پڑھیں۔ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا۔ علما کرام سے ملی۔ جلد ہی میرے دل کی دنیا بدل گئی اور میں نے صدق دل سے اسلام قبول کرلیا۔ میرا اسلامی نام سائرہ رکھا گیا۔ اور پھر میں نے عدنان شاہ سے شادی کرلی۔

ہم لندن میں ہی رہنے لگے۔ یہیں ہماری بیٹی پیدا ہوئی۔ جس کا نام عدنان شاہ نے ثانیہ رکھا۔ چار سال بعد عدنان شاہ کو وطن کی یاد ستانے لگی۔ یوں ہم پاکستان چلے گئے۔ عدنان کے آبائی گھر میں رہنے لگے۔ جو اس کے والدین کے انتقال کے بعد سے برسوں سے ویران پڑا تھا۔

ایک روز عدنان اپنے ساتھ ایک دراز قد اور تنومند شخص کو لائے۔ عدنان نے اس کا تعارف فرمان شاہ کے نام سے کروایا۔ عدنان کا کہنا تھا کہ فرمان خان اس کے بچپن کا دوست اور کلاس فیلو رہ چکا ہے اور قریبی دوست بھی ہے۔ پھر وہ چند بار مزید ہمارے گھر آیا۔ اس کے حلیے سے

ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے مالی حالات بہتر نہیں ہیں۔

ان دنوں اس کے پاس ایک پرانی سی بائیک ہوتی تھی۔ پھر وہ اکثر عدنان کے ساتھ گھر آنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ ”مجھے بھابھی کے ہاتھ کے کھانے اچھے لگتے ہیں۔“

ان ہی دنوں اس نے عدنان کو گلگت بلتستان میں واقع بیانو گلیشیئر سر کرنے کی پیشکش کی۔ پاکستان آنے کے بعد سے عدنان کسی بھی مہم پر نہیں گئے تھے۔ اس لئے فوراً حامی بھرلی۔ ”اسی روز رات کو میں نے خواب میں عدنان کو اس حالت میں دیکھا کہ ایک انتہائی لمبا اور خوفناک سانپ اسے ڈس رہا ہے۔“ میں نے عدنان کو اس مہم پر جانے سے روکنا چاہا مگر وہ ہنس دیا۔ ”سائرہ یہ تمہارا وہم ہے بھلا اس خواب کا بیانو گلیشیئر جانے سے کیا تعلق۔“ اس کے اس مہم پر جانے کے حتمی فیصلے پر میں نے بھی انوکھا فیصلہ کیا۔

میں نے بیانو گلیشیئر کی اس مہم پر ثانیہ سمیت جانے کی ضد کی۔ جسے عدنان کو ماننا پڑا۔ ایک خصوصی بیگ ثانیہ کے لئے تیار کیا گیا جو مہم جوئی کے دوران عدنان کی پشت پر ہوتا اور ثانیہ اس بیگ میں موجود ہوتی۔

وہ واقعی بہادر بچی تھی۔ ڈرنے کے بجائے ہنستی کھیلتی رہتی۔ ہم بیانو گلیشیئر کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔

ایک روز آرام کے دوران جب کہ سب خیموں میں تھے میں ثانیہ کے ساتھ خیمے سے باہر نکلی اور ٹہلتی ہوئی ذرا آگے چلی گئی۔

تب ہی میری نگاہ مادہ ریچھ پر پڑی۔ جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ بیانو گلیشیئر میں ریچھوں کی موجودگی حیران کن بات تھی۔ اس بات کا ذکر بعد میں، میں نے عدنان سے بھی کیا۔ اس نے بھی بیانو گلیشیئر پر ریچھوں کی موجودگی پر حیرت کا اظہار کیا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی نجانے کیوں مجھے اس مادہ ریچھ سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھتی۔ اور کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھے لگا وہ اور اس کے بچے بھوکے ہیں۔

میں ثانیہ کے ساتھ دوبارہ اپنے خیمے میں آتی وہاں ہم نے خشک گوشت کے پارچے محفوظ کر رکھے تھے۔ دراصل عدنان کھانے میں زیادہ تر گوشت ہی کھاتا تھا۔ اسے سبزیوں سے رغبت نہ تھی۔ میں نے خشک گوشت کے پارچے مادہ ریچھ کے سامنے ڈال دیئے۔ جنہیں لے کر وہ چلی گئی۔

دوسرے روز ہم آگے بڑھ گئے۔

فرمان خان نے جب عام ڈگر سے ہٹ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو کہ خطرناک اور غیر محفوظ تھا۔ عدنان اور میں نے اعتراض کیا۔ ”دیکھو عدنان اس نے عدنان کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ ”میرا مقصد بیانو گلیشیئر کی چوٹی سر کرنے کا ہرگز نہیں ہے۔“

عدنان نے چونک کر پوچھا۔ ”پھر تمہارا کیا مقصد ہے؟“

وہ کہنے لگا۔ ”جبران کا تعلق گلگت بلتستان کے ایک قدیم قبیلے سے تھا۔ وہ سیدھے سادھے مگر جنگجو لوگ تھے۔ جب کہ جبران مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ دراز قد اور دیوہیکل جسم کا مالک تھا۔ نوجوان ہوتے ہی قبیلے سے اپنے جیسے چند آوارہ دوستوں کے ساتھ نکلا اور جرائم کی راہ پر چل پڑا۔ وہ سب سفاک ذہن کے مالک تھے۔ لوگوں کو لوٹ مار کے دوران وہ جان سے مار ڈالتے۔ ان دنوں ہندوستان پر انگریز کی حکومت تھی۔ ان کی شہرت کی وجہ سے پولیس پر دباؤ بڑھا تو اس گروہ کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر وہ واردات کے بعد چھلاوے کی طرح غائب ہوجاتے۔

ان ہی دنوں دارالحکومت سے درجنوں سپاہیوں کے پہرے میں ہیرے جواہرات کا خزانہ وہاں سے گزرا، اس خزانے کی مالیت کروڑوں کے لگ بھگ تھی۔ جس کی خبر جبران کے گروہ کو مل گئی۔ جبران نے اپنے گروہ کے ساتھ گھات لگا کر ہیرے جواہرات لوٹ لئے۔ اس حملے میں خود جبران کے تین ساتھی بھی مارے گئے۔

یہ بہت بڑی واردات تھی۔ اس لئے انہوں نے روپوشی کا سوچا اور اپنے قبیلے میں لوٹ آئے۔ اس خزانے

کو انہوں نے وقتی طور پر لاتوک چوٹی کے اوپر واقع ایک غار میں چھپا دیا اور خود بستی میں لوٹ گئے کہ معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی خزانہ غار سے نکال لیں گے۔ اگر معاملہ صرف ہیرے جواہرات کا ہوتا تو شاید وہ بچ جاتے۔ مگر اس لوٹ مار کے دوران انگریز فوج کے سپاہی مارے گئے تھے۔ کھوجی ان کے قبیلے تک پہنچ گئے۔

مقابلے میں نہ صرف جبران اور اس کے ساتھی مارے گئے بلکہ ان کے قبیلے کے بھی بہت سے افراد جان سے گئے کہ انہوں نے جبران اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کی تھی۔

خزانے کا کسی کو بھی پتہ نہیں چلا کہ کدھر گیا۔ جبران کے گروہ کا ایک فرد بچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس نے مرنے سے قبل اس مقام کا نقشہ بیٹے کے حوالے کیا۔ مگر نہ جانے کیوں کوئی اس خزانے تک نہ پہنچ سکا۔ اور یہ نقشہ ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا مجھے مل گیا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم راتوں رات کروڑ پتی ہوجائیں گے۔ تمہاری آئندہ زندگی آرام و راحت میں گزرے گی۔'' وہ عدنان کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔ عدنان نے اس کا ہاتھ شانے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ان ہیرے جواہرات کے چکر میں انگریز فوج کے سپاہیوں سمیت جبران اور اس کا قبیلہ جان سے گیا۔ ایسے خزانے کی لالچ کا سوچنا بھی غلط ہے۔ اور پھر مجھے وہ دولت پسند نہیں جو مفت میں ملے، حرام مال کی آس میں کاہل رہتے ہیں اور دوسرا میری زندگی اب بھی آرام اور راحت سے بسر ہورہی ہے۔ صاف لفظوں میں میری بات کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمہاری آفر منظور نہیں۔ آج بلکہ ابھی سے میرے راستے تم سے جدا ہیں۔ وہ میرا اور ثانیہ کا ہاتھ تھام کر واپسی کے لئے مڑا ہی تھا کہ عقب میں فرمان خان کی آواز گونجی۔ ''ٹھہرو اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

ہم نے مڑ کر دیکھا فرمان خان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں مہیب گنیں موجود تھیں۔ جن کی نالوں کا رخ ہماری طرف تھا۔ ''عدنان مجھے انکار پسند نہیں اگر تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا تو تم اور تمہارے بیوی بچے جان سے جائیں گے۔ معاملہ اگر عدنان کی زندگی کا ہوتا تو وہ نہ ڈرتا مگر میری اور ثانیہ کی جان بچانے کے لئے اس نے حامی بھرلی۔

وہ اس دشوار گزار ترکون نما چٹانی راستے پر دوسروں کے لئے راستہ آسان بناتا ہوا اوپر پہنچا۔ آگے بس چھ سو پچاس فٹ کی بلند ترین تولاک چوٹی تھی۔ جسے دیکھتے ہی دل پر ہیبت طاری ہوجاتی تھی یہ چوٹی بھی عدنان کی وجہ سے سر ہوئی۔ فرمان خان کی منزل کچھ فاصلے پر موجود غار تھا۔

اس غار کے دو دہانے تھے۔ فرمان خان کے حکم پر اس کے ساتھیوں نے گڑھا کھود گڑھے میں ایک صندوق تھا۔ جس پر لگے تالے زنگ آلود ہوچکے تھے۔ جو کدال کی ایک ہی ضرب سے ٹوٹ گئے۔ صندوق کا ڈھکن کھلا تو اندر موجود ہیرے جواہرات کی چمک سے غار جگمگا اٹھا۔ ان ہیرے جواہرات کو دو بیگوں میں منتقل کردیا گیا۔

ہمارا خیال تھا کہ اب فرمان خان کے منحوس وجود سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ مگر یہ ہماری خام خیالی تھی۔ بالکل اچانک فرمان خان نے رائفل کا رخ عدنان کی طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔ وہ میری نگاہوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی ہوکر گرا اور لمحوں میں دم توڑ گیا۔ ''یہ تم نے کیا ظلم کیا، ظالم انسان۔'' میں روتے ہوئے عدنان کے ساکت جسم سے لپٹ گئی۔

ثانیہ بھی ایک طرف کھڑی رو رہی تھی۔ فرمان خان نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''جان من یہ وقت رونے کا نہیں جشن منانے کا ہے۔ پہلے تم میرا دل بہلاؤ گی۔ پھر میرے دوستوں کی باری ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میں لرز گئی۔ وہ شیطان مجھے پامال کرنا چاہتا تھا۔ فرمان خان نے روتی چیختی ثانیہ کی کنپٹی پر رائفل کی نال رکھ دی۔ اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے میری بات نہ مانی تو اسے بھی باپ کے پاس پہنچادوں گا۔'' میرے لئے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ شوہر کی موت کے بعد میری عزت خطرے میں تھی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا سے فریاد کی۔

فرمان خان ناپاک عزائم سے میری طرف بڑھا ہی تھا کہ غار خوفناک غراہٹوں سے گونج اٹھا۔ غار کے

دہانے سے ریچھوں کا جوڑا اپنے بچوں کے ساتھ اندر داخل ہورہا تھا۔

میں نے پہلی ہی نگاہ میں پہچان لیا۔ ان میں وہ مادہ ریچھ بھی تھی۔ جسے میں نے گوشت کے پارچے دیئے تھے۔ ریچھوں کا وہ جوڑا غراتا ہوا فرمان خان اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوا۔ فرمان خان اور اس کے ساتھیوں نے ہیرے جواہرات سے بھرے بیگ اٹھائے اور عقب میں بھاگتے ہوئے ریچھوں پر گولیاں چلائیں۔

فرمان خان کے ساتھیوں کو غضب ناک ریچھوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ جب کہ وہ گولیاں چلاتا ہوا زخمی حالت میں غار کے دوسرے دہانے سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ جاتے جاتے وہ ہیروں سے بھرا چھوٹا بیگ لے جانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

جب کہ ہیرے جواہرات سے بھرا بڑا بیگ جو کہ اس کے ساتھیوں کے پاس تھا۔ وہیں ان کی لاشوں کے پاس غار میں پڑا رہ گیا۔ مادہ ریچھ کا ساتھی ریچھ گولیوں سے چھلنی ہوچکا تھا۔

چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ مادہ ریچھ بپھری ہوئی غضب ناک حالت میں مردہ ریچھ کے گرد چکر کاٹنے کے بعد غار سے باہر نکلی میں سمجھ گئی وہ فرمان خان کی تلاش میں گئی ہوگی۔

کافی دیر بعد مادہ ریچھ واپس لوٹی اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ درندہ فرمان خان جیسے انسان سے بہتر تھا۔

میرے ایک معمولی سے احسان کے بدلے میری محافظ بن گئی۔ میرا ارادہ ثانیہ کے ساتھ وہاں سے جانے کا تھا۔ انسان سوچتا بہت کچھ ہے۔ مستقبل کے پلان بھی بناتا ہے۔ مگر ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اچھی بھلی رات کو سوئی۔

صبح اٹھی تو پورا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ بخار اس قدر شدید کہ مجھ سے اٹھا تک نہیں جارہا ہے۔ شاید بیانو گلیشیئر کے سرد ترین موسم کا اثر ہے۔ مجھے نمونیا ہوگیا ہے۔ میری حالت بگڑتی جارہی ہے۔ اس برفانی پہاڑ میں مجھے اپنا انجام صاف نظر آرہا ہے۔

مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مگر فکر ثانیہ کی تھی کہ اس کا کیا ہوگا۔ تب، میں نے گڑگڑا کر اللہ سے فریاد کی۔ ''یا اللہ میری مدد فرما۔ میری بچی کا میرے بعد کیا ہوگا۔''

روتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں وہی مفلوک الحال بزرگ نظر آئے۔ جس نے مجھ کھانے کے بعد ہدایت کی دعا دی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''سنو سائرہ بیٹی زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہارے بعد اس بچی کی پرورش اور حفاظت وہی کرے گا۔ جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اللہ ماں سے ستر گنا زیادہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہے۔

ایک بار اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے پوچھا۔ کیا کبھی تمہیں کسی کی روح قبض کرتے ہوئے ترس آیا۔

ملک الموت نے جواب دیا۔ ''یا اللہ ایک بار ایک تختہ دریا میں بہتا جارہا تھا۔ اس تختے پر ایک عورت اور اس کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ جب تو نے مجھے اس عورت کی روح قبض کرنے کا حکم دیا۔ تب میں نے سوچا ماں کے مرنے کے بعد اس معصوم بچے کا کیا ہوگا۔

دوسری بار جب شداد بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ اپنی بنائی ہوئی جنت کے دروازے پر پہنچا تو مجھے اس کی روح قبض کرنے کا حکم ملا۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''اے ملک الموت وہ بچہ کوئی اور نہیں شداد بادشاہ ہی تھا۔ تم نے دونوں بار ایک ہی شخص پر ترس کھایا۔''

اس خواب کے بعد میں ثانیہ کی طرف سے مطمئن ہوگئی۔ میری حالت دن بدن گرنے لگی۔

''مادہ ریچھ میری اس حالت کی وجہ سے بے قراری سے میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ مگر وہ بھی تو میرے لئے کچھ نہیں کرسکتی۔ ثانیہ اس کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔'' آگے ڈائری کے صفحے خالی تھے۔ ڈائری میں درج کہانی سے فرمان خان کی اصلیت مجھ پر کھل چکی تھی۔ وہ ہیرے جواہرات کے لالچ میں مجھے بھی دھوکے سے یہاں تک لایا تھا اور خزانہ ملتے ہی مجھے بھی عدنان کی طرح راستے سے ہٹادیتا۔

میں ڈائری ہاتھ میں لئے ہوئے غار کے دہانے کی طرف گیا کہ دیکھوں ثانیہ اب تک واپس کیوں نہیں لوٹی۔ غار کے دہانے پر پہنچتے ہی مجھے فرمان خان، صوفیہ، طارق خان اور دلاور نظر آئے جو غار کے دہانے کی طرف آرہے تھے۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' صوفیہ نے بے قراری سے پوچھا جب کہ فرمان خان طارق اور دلاور مجھ سے مخاطب ہوئے بنا ہی قریب سے گزر کر غار میں داخل ہوگئے۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے۔'' صوفیہ نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

صوفیہ تمہارا باپ اپنے دوست عدنان شاہ اور اس کی بیوی سائرہ کا قاتل ہے اور وہ برفانی لڑکی ثانیہ عدنان شاہ کی بیٹی ہے۔'' میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو صوفیہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ ناقابل یقین نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

فرمان خان نے پلٹ کر غصے سے میری طرف دیکھا۔ ''تم جھوٹ بکتے ہو۔''

''یہ سچ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری صوفیہ کی طرف بڑھائی۔

''یہ ڈائری سائرہ کی ہے جسے پڑھتے ہی فرمان خان کے کالے کرتوتوں کا پردہ تمہاری نگاہوں کے سامنے چاک ہوجائے گا۔''

صوفیہ جیسے جیسے ڈائری پڑھتی جارہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑتا جارہا تھا۔ فرمان خان جیسے مکار شخص کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ ایک مخلص لڑکی تھی۔ باپ کے چہرے سے شرافت کا نقاب اترتے ہی اسے واقعی دکھ پہنچا تھا۔ جو اس کے چہرے سے ہی عیاں تھا۔ فرمان خان انگلی سے میری طرف اشارہ کرکے غرایا۔ ''یہ جھوٹ ہے میرے خلاف سازش ہے۔ یہ سب اس نے خود ہی لکھا ہوگا۔''

تبھی غار کے دہانے سے نسوانی آواز ابھری۔ ''فرمان خان یہ سچ ہے تم قاتل ہو۔''

فرمان خان نے مڑ کر دیکھا غار کے دہانے پر ثانیہ موجود تھی۔ جو اس وقت میکسی نما لباس میں موجود تھی۔ جب کہ وہ غار سے باہر گئی تھی تو اس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس وقت اس کی انگلیوں پر درانتی نما ناخن بھی موجود نہ تھے۔ ''تم بول سکتی ہو اور تم نے ناخن بھی کاٹ لئے۔'' میں نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔ مگر وہ اس وقت فرمان خان کی طرف متوجہ تھی۔

''فرمان خان اس ڈائری میں لکھا ایک ایک حرف سچ ہے۔''

فرمان خان نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''تم اور ادیب دونوں آپس میں مل کر یہ کھیل کھیل رہے ہو۔ تب ہی تو تم پہلے جانوروں کی طرح غراتے ہوئے ڈھونگ رچا رہی تھی۔ اور اب انسانوں کی طرح بول رہی ہو۔ مگر تمہاری یہ چال نہیں چلے گی۔ تم سائرہ کی ہم شکل ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

''فرمان خان تم نہ صرف عدنان شاہ کے قاتل ہو بلکہ میری موت بھی تمہاری وجہ سے ہوئی۔'' وہ فرمان خان کی الزام تراشی سے بے نیاز بولتی جارہی تھی۔ ''اس روز پارک میں ادیب سے میں ہی ملی تھی۔ مجھے یہ نوجوان مخلص لگا۔ تب میں نے سوچا کاش یہ میری بیٹی کا ہاتھ تھام لے۔ میری یہ سوچ دیوانے کے خواب کی طرح تھی۔ ادیب کہاں اور ثانیہ بیانو گلیشیئر کی تولاک چوٹی پر مگر کبھی کبھی ناممکن بھی ممکن ہوجاتا ہے۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں اس ملاقات میں، میں نے ادیب کو اپنا نام ثانیہ بتایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مجھے ثانیہ سمجھ کر اس دیوانگی سے چاہے گا۔ اتفاق سے دوسرے روز جب یہ مجھ سے ملنے پارک میں آیا۔ تو واپسی میں صوفیہ کی گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ صوفیہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں ڈائننگ ہال میں عدنان اور ثانیہ کے ساتھ میری تصویر دیکھ کر ادیب چونک پڑا۔ اور مجھ سے ملاقات کا واقعہ صوفیہ سے بیان کیا۔

صوفیہ کی زبانی یہ واقعہ فرمان خان تمہارے علم میں آیا تو تم چونک پڑے تمہیں بھولی بسری کہانی یاد آگئی۔

جب تم غریب تھے اور سازش کے ذریعے عدنان کو ٹریپ کرکے بیانو گلیشیئر پر تولاک چوٹی کے غار سے ہیرے جواہرات کا کچھ حصہ ہتھیانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان ہی ہیرے جواہرات کی وجہ سے تمہاری زندگی بدلی۔ تم تولاک چوٹی پر بچ جانے والے خزانے کے لالچ میں ادیب کو ساتھ لے کر بیانو گلیشیئر پر دوڑے چلے آئے۔

اس مقصد کے لئے تم نے ادیب کو عدنان کی طرح اصل بات نہیں بتائی۔ صرف یہ کہا کہ تم بیانو گلیشیئر کی چوٹی تسخیر کرنا چاہتے ہو۔ اتفاق سے ثانیہ تمہارے خیمے میں کھانا اور کپڑے چرانے گئی۔ اور تمہیں پہچان لیا۔ تم نے برسوں پہلے اس کے باپ کو اس کی نگاہوں کے سامنے قتل کیا تھا۔

مادہ ریچھ ایک درندہ ہے مگر تم جیسے کم ظرف انسان سے بہتر جس نے معمولی سے احسان کے بدلے ایک پانچ سالہ بچی کو پال پاس کر بڑا کیا۔ ثانیہ تمہیں مارنے تمہارے خیمے کی طرف جارہی تھی کہ شاکر راستے میں آگیا۔ ثانیہ نے اسے مار ڈالا۔ مگر طارق خان نے غضب سے اس کے سر پر وار کرکے اسے بے ہوش کردیا۔ پھر ثانیہ کو بچانے کی غرض سے ادیب طارق سے لڑا۔

ادیب اور صوفیہ نے ثانیہ کو آزاد کردیا۔ تم لوگ مادہ ریچھ کی نظر میں بھی آچکے تھے۔ تم نہ صرف ثانیہ کے دشمن تھے بلکہ اس کے ساتھی ریچھ کے بھی قاتل تھے۔

مادہ ریچھ نے تمہارے ساتھی کو اس کے خیمے میں مار ڈالا۔ اس روز جب تم لوگ برفانی تودے سے بچے تو تمہارا ایک ساتھی اور ادیب مادہ ریچھ کی نظروں میں آگئے۔ وہ ادیب کو بھی ثانیہ کا دشمن سمجھ بیٹھی تھی۔ تبھی تمہارے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ریچھنی نے ادیب پر حملہ کردیا۔ مگر ثانیہ کے بروقت وہاں پہنچ جانے سے ادیب بچ گیا۔

ثانیہ اور مادہ ریچھ بے ہوش ادیب کو غار میں لے آئے۔

فرمان خان تاریخ اپنے آپ کو ضرور دہراتی ہے۔ یاد کرو تم نے اسی غار میں عدنان کو بے گناہ قتل کیا تھا۔ تم تقدیر کے ہاتھوں تھوں میں کھیل کر دوبارہ یہاں اس جگہ آپہنچے۔''

مگر فرمان خان ہنسا۔

''کیا خوب کہانی بنائی ہے گویا تم سائرہ کی روح ہو مگر روحوں کا تو وجود نہیں ہوتا۔ اگر تم روح ہوتی تو اس روز طارق خان تمہیں رسیوں سے نہ باندھ پاتا۔ خیر اب میں اس خزانے تک پہنچ چکا ہوں۔ اب تمہارا اور ادیب کا کام بھی ختم۔'' اس نے رائفل کا رخ میری طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔

تڑتڑاہٹ کی آواز سے گولیاں چلیں۔ مجھے اپنی موت کا یقین ہوچلا تھا۔ مگر اچانک ہی صوفیہ سامنے آگئی اور میری طرف برسائے جانے والی گولیاں اس کے بازو اور ٹانگ میں پیوست ہوگئیں۔ وہ چیختی ہوئی میرے قدموں میں گری۔

''صوفیہ۔'' میں چیخا اور اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''ادیب باپ کے گناہوں کا کفارہ اکثر..... اولاد..... کو ادا کرنا پڑتا ہے۔''

اس پل فرمان خان نے اپنی مہیب گن کی نال کا رخ ثانیہ کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیاں ثانیہ کے وجود سے اس طرح گزر گئیں جیسے وہاں ثانیہ کا وجود ہی نہ ہو۔ ''تم سائرہ ہو؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا۔

''ہاں میں سائرہ کی روح ہوں۔'' ثانیہ اور مادہ ریچھ اور اس کے بچے آنے ہی والے ہوں گے۔ تب ہی اس کے عقب میں ریچھوں کی غراہٹ ابھری۔ یہ مادہ ریچھ سمیت تین جسیم ریچھ تھے۔ ان کے عقب میں مردانہ لباس میں ملبوس درانتی نما ناخنوں والی ثانیہ بھی تھی۔

مادہ ریچھنی یقیناً فرمان خان کو پہچان چکی تھی۔ وہ اس کا بھی دشمن تھا۔ سائرہ اور عدنان کے ساتھ ساتھ اس نے اس کے ساتھی ریچھ کو بھی برسوں پہلے مارا تھا۔ فرمان خان اس کے بیٹے اور ساتھی کو گولیاں چلانے کی بھی مہلت نہ ملی۔ بپھرے ہوئے ریچھوں نے ان تینوں کو لمحوں میں ادھیڑ ڈالا۔

میری نگاہوں کے سامنے بپھری ہوئی مادہ ریچھ

میں ڈائری ہاتھ میں لئے ہوئے غار کے دہانے کی طرف گیا کہ دیکھوں ثانیہ اب تک واپس کیوں نہیں لوٹی۔ غار کے دہانے پر پہنچتے ہی مجھے فرمان خان، صوفیہ، طارق خان اور دلاور نظر آئے جو غار کے دہانے کی طرف آرہے تھے۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' صوفیہ نے بے قراری سے پوچھا جب کہ فرمان خان طارق اور دلاور مجھ سے مخاطب ہوئے بنا ہی قریب سے گزر کر غار میں داخل ہوگئے۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے۔'' صوفیہ نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

صوفیہ تمہارا باپ اپنے دوست عدنان شاہ اور اس کی بیوی سائرہ کا قاتل ہے اور وہ برفانی لڑکی ثانیہ عدنان شاہ کی بیٹی ہے۔'' میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو صوفیہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ ناقابل یقین نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

فرمان خان نے پلٹ کر غصے سے میری طرف دیکھا۔ ''تم جھوٹ بکتے ہو۔''

''یہ سچ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری صوفیہ کی طرف بڑھائی۔

''یہ ڈائری سائرہ کی ہے جسے پڑھتے ہی فرمان خان کے کالے کرتوتوں کا پردہ تمہاری نگاہوں کے سامنے چاک ہوجائے گا۔''

صوفیہ جیسے جیسے ڈائری پڑھتی جارہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑتا جارہا تھا۔ فرمان خان جیسے مکار شخص کی بیٹی ہونے کے باوجود وہ ایک مخلص لڑکی تھی۔ باپ کے چہرے سے شرافت کا نقاب اترتے ہی اسے واقعی دکھ پہنچا تھا۔ جو اس کے چہرے سے ہی عیاں تھا۔ فرمان خان انگلی سے میری طرف اشارہ کرکے غرایا۔ ''یہ جھوٹ ہے میرے خلاف سازش ہے۔ یہ سب اس نے خود ہی لکھا ہوگا۔''

تبھی غار کے دہانے سے نسوانی آواز ابھری۔ ''فرمان خان یہ سچ ہے تم قاتل ہو۔''

فرمان خان نے مڑ کر دیکھا غار کے دہانے پر ثانیہ موجود تھی۔ جو اس وقت میکسی نما لباس میں موجود تھی۔ جب کہ وہ غار سے باہر گئی تھی تو اس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس وقت اس کی انگلیوں پر درانتی نما ناخن بھی موجود نہ تھے۔ ''تم بول سکتی ہو اور تم نے ناخن بھی کاٹ لئے۔'' میں نے استعجاب انگیز حیرت سے پوچھا۔ مگر وہ اس وقت فرمان خان کی طرف متوجہ تھی۔

''فرمان خان اس ڈائری میں لکھا ایک ایک حرف سچ ہے۔''

فرمان خان نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''تم اور ادیب دونوں آپس میں مل کر یہ کھیل کھیل رہے ہو۔ تب ہی تو تم پہلے جانوروں کی طرح غراتے ہوئے ڈھونگ رچا رہی تھی۔ اور اب انسانوں کی طرح بول رہی ہو۔ مگر تمہاری یہ چال نہیں چلے گی۔ تم سائرہ کی ہم شکل ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔''

''فرمان خان تم نہ صرف عدنان شاہ کے قاتل ہو بلکہ میری موت بھی تمہاری وجہ سے ہوئی۔'' وہ فرمان خان کی الزام تراشی سے بے نیاز بولتی جارہی تھی۔ ''اس روز پارک میں ادیب سے میں ہی ملی تھی۔ مجھے یہ نوجوان مخلص لگا۔ تب میں نے سوچا کاش یہ میری بیٹی کا ہاتھ تھام لے۔ میری یہ سوچ دیوانے کے خواب کی طرح تھی۔ ادیب کہاں اور ثانیہ بیانو گلیشیئر کی تولاک چوٹی پر مگر کبھی کبھی ناممکن بھی ممکن ہوجاتا ہے۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں اس ملاقات میں، میں نے ادیب کو اپنا نام ثانیہ بتایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مجھے ثانیہ سمجھ کر اس دیوانگی سے چاہے گا۔ اتفاق سے دوسرے روز جب یہ مجھ سے ملنے پارک میں آیا۔ تو واپسی میں صوفیہ کی گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ صوفیہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ جہاں ڈائننگ ہال میں عدنان اور ثانیہ کے ساتھ میری تصویر دیکھ کر ادیب چونک پڑا۔ اور مجھ سے ملاقات کا واقعہ صوفیہ سے بیان کیا۔

صوفیہ کی زبانی یہ واقعہ فرمان خان تمہارے علم میں آیا تو تم چونک پڑے تمہیں بھولی بسری کہانی یاد آگئی۔

جب تم غریب تھے اور سازش کے ذریعے عدنان کو ٹریپ کرکے بیانو گلیشیئر پر تولاک چوٹی کے غار سے ہیرے جواہرات کا کچھ حصہ ہتھیانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان ہی ہیرے جواہرات کی وجہ سے تمہاری زندگی بدلی۔ تم تولاک چوٹی پر بچ جانے والے خزانے کے لالچ میں ادیب کو ساتھ لے کر بیانو گلیشیئر پر دوڑے چلے آئے۔

اس مقصد کے لئے تم نے ادیب کو عدنان کی طرح اصل بات نہیں بتائی۔ صرف یہ کہا کہ تم بیانو گلیشیئر کی چوٹی تسخیر کرنا چاہتے ہو۔ اتفاق سے ثانیہ تمہارے خیمے میں کھانا اور کپڑے چرانے گئی۔ اور تمہیں پہچان لیا۔ تم نے برسوں پہلے اس کے باپ کو اس کی نگاہوں کے سامنے قتل کیا تھا۔

مادہ ریچھ ایک درندہ ہے مگر تم جیسے کم ظرف انسان سے بہتر جس نے معمولی سے احسان کے بدلے ایک پانچ سالہ بچی کو پال پاس کر بڑا کیا۔ ثانیہ تمہیں مارنے تمہارے خیمے کی طرف جارہی تھی کہ شاکر راستے میں آگیا۔ ثانیہ نے اسے مار ڈالا۔ مگر طارق خان نے غضب سے اس کے سر پر وار کرکے اسے بے ہوش کردیا۔ پھر ثانیہ کو بچانے کی غرض سے ادیب طارق سے لڑا۔

ادیب اور صوفیہ نے ثانیہ کو آزاد کردیا۔ تم لوگ مادہ ریچھ کی نظر میں بھی آچکے تھے۔ تم نہ صرف ثانیہ کے دشمن تھے بلکہ اس کے ساتھی ریچھ کے بھی قاتل تھے۔

مادہ ریچھ نے تمہارے ساتھی کو اس کے خیمے میں مار ڈالا۔ اس روز جب تم لوگ برفانی تودے سے بچے تو تمہارا ایک ساتھی اور ادیب مادہ ریچھ کی نظروں میں آگئے۔ وہ ادیب کو بھی ثانیہ کا دشمن سمجھ بیٹھی تھی۔ تبھی تمہارے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ریچھنی نے ادیب پر حملہ کردیا۔ مگر ثانیہ کے بروقت وہاں پہنچ جانے سے ادیب بچ گیا۔

ثانیہ اور مادہ ریچھ بے ہوش ادیب کو غار میں لے آئے۔

فرمان خان تاریخ اپنے آپ کو ضرور دہراتی ہے۔ یاد کرو تم نے اسی غار میں عدنان کو بے گناہ قتل کیا تھا۔ تم تقدیر کے ہاتھوں تھوں میں کھیل کر دوبارہ یہاں اس جگہ آپہنچے۔''

مگر فرمان خان ہنسا۔

''کیا خوب کہانی بنائی ہے گویا تم سائرہ کی روح ہو مگر روحوں کا تو وجود نہیں ہوتا۔ اگر تم روح ہوتی تو اس روز طارق خان تمہیں رسیوں سے نہ باندھ پاتا۔ خیر اب میں اس خزانے تک پہنچ چکا ہوں۔ اب تمہارا اور ادیب کا کام بھی ختم۔'' اس نے رائفل کا رخ میری طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔

تڑتڑاہٹ کی آواز سے گولیاں چلیں۔ مجھے اپنی موت کا یقین ہوچلا تھا۔ مگر اچانک ہی صوفیہ سامنے آگئی اور میری طرف برسائے جانے والی گولیاں اس کے بازو اور ٹانگ میں پیوست ہوگئیں۔ وہ چیختی ہوئی میرے قدموں میں گری۔

''صوفیہ۔'' میں چیخا اور اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''ادیب باپ کے گناہوں کا کفارہ اکثر..... اولاد..... کو ادا کرنا پڑتا ہے۔''

اس پل فرمان خان نے اپنی مہیب گن کی نال کا رخ ثانیہ کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیاں ثانیہ کے وجود سے اس طرح گزر گئیں جیسے وہاں ثانیہ کا وجود ہی نہ ہو۔ ''تم سائرہ ہو؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا۔

''ہاں میں سائرہ کی روح ہوں۔'' ثانیہ اور مادہ ریچھ اور اس کے بچے آنے ہی والے ہوں گے۔ تب ہی اس کے عقب میں ریچھوں کی غراہٹ ابھری۔ یہ مادہ ریچھ سمیت تین جسیم ریچھ تھے۔ ان کے عقب میں مردانہ لباس میں ملبوس درانتی نما ناخنوں والی ثانیہ بھی تھی۔

مادہ ریچھنی یقیناً فرمان خان کو پہچان چکی تھی۔ وہ اس کا بھی دشمن تھا۔ سائرہ اور عدنان کے ساتھ ساتھ اس نے اس کے ساتھی ریچھ کو بھی برسوں پہلے مارا تھا۔ فرمان خان اس کے بیٹے اور ساتھی کو گولیاں چلانے کی بھی مہلت نہ ملی۔ بپھرے ہوئے ریچھوں نے ان تینوں کو لمحوں میں ادھیڑ ڈالا۔

میری نگاہوں کے سامنے بپھری ہوئی مادہ ریچھ

نے اگلے پنجے کا بھرپور وار فرمان خان کے چہرے پر کیا اس وار میں اتنی طاقت تھی کہ میں نے فرمان خان کا سر تن سے الگ ہو کر ایک طرف لڑھکتے دیکھا۔ طارق خان اور دلاور کو بھی ان ریچھوں نے بڑی بے رحمی سے مارا۔

صوفیہ بے ہوش تھی۔ خون کے اخراج کی وجہ سے مجھے اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ اور پھر میں کسی شہر یا قصبے میں نہیں بیانو گلیشیئر پر موجود تھا۔ اسے کسی اسپتال میں پہنچانا ناممکن تھا کہ بیانو گلیشیئر کی اس چوٹی سے اترنے میں مجھے کئی دن لگ سکتے تھے۔

تب میں نے خلوص دل سے دعا کی۔ ''یا اللہ اس مخلص لڑکی کی جان بچانے میں میری مدد فرما جس طرح تو نے یونس علیہ السلام کی مدد مچھلی کے پیٹ میں کی۔ یوسف علیہ السلام کو اندھے کنویں میں بچایا۔ ابراہیم علیہ السلام کے لئے دہکتی آگ کو گلزار بنا دیا۔''

ادھر ثانیہ نے ماں کو پہچان کر اس سے لپٹنا چاہا۔ ''رک جاؤ بیٹی روح کا وجود نہیں ہوتا۔ تم ادیب کے ساتھ چلی جانا یہ ایک اچھا انسان ہے۔'' سائرہ کی روح یہ کہتے ہی وہاں سے غائب ہو گئی۔

میں بے ہوش صوفیہ کو اٹھائے روتی ہوئی ثانیہ کے ساتھ غار سے نکلا تو ریچھ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ دل میں سچائی ہو اور نیت صاف ہو تو دور جدید میں بھی معجزے رونما ہو جاتے ہیں۔

قریب ہی کہیں ہیلی کاپٹر کے پروں کی تھرتھراہٹ کی گونجدار آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر مجھے تولاک چوٹی کے گرد پرواز کرتا ہوا ہیلی کاپٹر نظر آ گیا۔ میں نے شرٹ اتاری اور ہوا میں لہراتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو مدد کے لئے پکارا۔ ہیلی کاپٹر والوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تولاک چوٹی کے قریب آئے تو میں نے پہچان لیا۔ ہیلی کاپٹر پر آرمی کا مخصوص نشان موجود تھا۔ وہ نجانے کیوں اس طرف آ نکلے تھے۔

میرا ارادہ ثانیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا تھا۔ میں اس کے محض ریچھوں کی طرف دیکھا۔ ''میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

یقیناً وہ میری بات سمجھے تھے۔ تبھی تو انہوں نے ہلکی غراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلائے تھے۔

ہیلی کاپٹر کے وہاں لینڈ کرنے کی جگہ نہ تھی۔ انہوں نے رسی سے بندھی سیڑھی لٹکائی۔ میں نے ثانیہ کو سیڑھی پر چڑھنے میں مدد دی۔ پھر خود بھی صوفیہ کو اٹھائے سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ہیلی کاپٹر میں دو فوجی اہلکار موجود تھے جنہوں نے ہماری مدد کی۔

بعد میں معلوم ہوا۔ دوروسی کوہ پیما تولاک چوٹی پر پھنس چکے تھے۔ انہوں نے ہی مدد کے لئے کال کی تھی۔ مگر وہ ہیلی کاپٹر کے آنے سے پہلے ہی جان کی بازی ہار گئے۔ بے ہوش صوفیہ اور ہمیں اسی ہیلی کاپٹر پر سی ایم ایچ اسپتال پہنچا دیا گیا۔

صوفیہ کے آپریشن تھیٹر میں جانے کے بعد میں اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگا۔ صوفیہ کی زندگی باقی تھی اس لئے اس کی جان تو بچ گئی مگر گولیوں سے چھلنی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی۔ وہ باہمت اور حوصلہ مند لڑکی تھی اپنی تقدیر پر صابر شاکر رہی۔ اور صحت یاب ہو کر گھر لوٹ گئی۔

ایک طرف صوفیہ کی بے لوث محبت تھی تو دوسری طرف میری محبت ثانیہ تھی۔ مجھے سوچنے میں مشکل تو لگی مگر میں نے صوفیہ کے احسانوں کا قرضہ چکانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے اپنی شریک حیات بنا لیا۔

کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس مخلص لڑکی نے ایک بار پھر مجھ پر احسان کرتے ہوئے سال بھر کے مختصر عرصے میں ثانیہ کو عام انسانوں کی طرح رہنا اور بولنا چالنا سکھا دیا۔ ویسے بھی جب انسان طوطے جیسے پرندے کو بولنا سکھا سکتا ہے تو ثانیہ تو پھر انسان تھی۔

کوئی عورت محبت کا بٹوارہ نہیں کرتی۔ مگر صوفیہ نے مجھ سے ضد کر کے ثانیہ کو خود میری دولہن بنایا۔ دونوں سوکنوں کی طرح نہیں بہنوں کی طرح ایک گھر میں رہتی ہیں میں اور صوفیہ اکثر مذاق میں ثانیہ کو برفانی چڑیل کہتے ہیں تو وہ ہنس پڑتی ہے۔